زندگی کے ساتھ ساتھ

ماہنامہ

چاسو

راولپنڈی

زندگی کے ساتھ ساتھ

ماہنامہ

چہارسو

راولپنڈی

متاعِ چہار سو

سرورق: عکس ورق ـــــ شعیب حیدر زیدی
تزئین ـــــ عظمیٰ رشید
کمپوزنگ ـــــ حافظ فدا الحق
قرطاسِ اعزاز ـــــ نیّر امکن ۳
جوئے زندگی ـــــ قاری ثنا ۴
طالب زخم کے نخچیر ـــــ شہزاد احمد ۵
براہِ راست ـــــ گلزار جاوید ۸
شبِ امید ـــــ فیروز عالم ۱۴
محبت کی نفسیات کا ماہر ـــــ احمد ندیم قاسمی ۱۷
شہزاد احمد کی شاعری ـــــ انتظار حسین ۱۸
امتناعیت کا عکس ـــــ ڈاکٹر وزیر آغا ۲۰
ریت اور دھوپ کے درمیاں ـــــ محسن احسان ۲۳
حدود و امکانات ـــــ ڈاکٹر سلیم اختر ۲۴
عروضی مطالعہ ـــــ بشیر رزمی ۲۶
اسمِ اعظم کی مہک ـــــ فیصل عظیم ۲۷
ایک ماہ جو دیا سا ہے ـــــ شہزاد احمد ۳۳
نئے سورج کا چہرہ ـــــ صفوت علی صفوت ۳۹
روشن چراغ ـــــ فواد شریف ۴۳
دعائے التفات ۴۸
شکیل غازی پوری، ماہر اجمیری، ضمیر نوری، خورشید انور رضوی
افسانے
تیسری دنیا ـــــ جوگندر پال ۵۰
ایک سائیکوٹائل وصیت ـــــ نشاط یاد ۵۳
مراجعت ـــــ عذرا اصغر ۵۷
خوابوں کا آسمان ـــــ مراق مرزا ۵۹
آدھے گھنٹے کے لیے ـــــ فرخندہ شمیم ۶۳
ہجرِ مسافت ۶۵
شہریار، محمود الحسن، منظور حسین یاد، امین راحت چغتائی، امجد اسلام امجد، مظفر حنفی،
مامون ایمن، کرشن پکار، طور، خالد حمید شیدا، محسن جویر، غالب عرفان، ضیا ششی، انور
فیروز، غلام مرتضیٰ راہی، خورشید رضوی، مناظر عاشق ہرگانوی، ضمیر نوری، گوہر کریم
نگری،
صدیقی شاہد، ملک زادہ جاوید۔
افسانے
کالا سورج ـــــ فیروز عالم ۷۵
مرے تھے جن کے لیے ـــــ روحی فرخ ۷۷
خوف میں گھرا ہوا آدمی ـــــ سلمان ڈار ۷۹
تاریخ اور مفتوح ـــــ گلزار جاوید ۸۱
حسنِ پیمبر ۸۳
عشرت ظفر، انور جاوید ہاشمی، ضیا فاروقی، شکیل اختر، صابر عظیم آبادی، کاوش
پرتاپ گڑھی، سیف الرحمٰن انجم، بارہ بنکوی، حفیظ انجم، شگفتہ نازلی، اختر رضا سلیمی،
خالد ندیم، طالب انصاری، تصور اقبال، ناصر عباس ناصر، پروین شفق، نورزمان
ناوک۔
ریورتاژ
گلیمر کم گشتہ ـــــ طاہرہ اقبال ۹۳
چشمہ رواں ۹۸
محمود شام، شبنم شکیل، عبدالعزیز خالد، جوگندر بل، تشنہ کاشی، عمر مجتبیٰ، سکر تیا،
مناظر عاشق ہرگانوی، شاہد عزیز، کرامت بخاری، بھگوان داس اعجاز، ممتاز احمد،
ست پال سنگھ، شگفتہ نازلی، مظہر بخاری
تخلیقِ عصر ۱۰۷
تازہ تصانیف کا تعارف ـــــ علیم سکندر علی ۱۱۱
کون تھا عیسیٰ
عیسیٰ مسیح کی مظلوم مصلوبیت ـــــ ستیہ پال آنند ۱۱۵
رفتگاں
لطیف کاشمیری کی یاد میں ـــــ نشاط یاد ۱۱۷
رس رابطے:
جستجوئے ترتیب و تدوین ـــــ وقار جاوید

☆

۔ جاری ہے ۔

جھلسے ہوئے صحرا سے صبا مانگ رہا تھا
معلوم نہیں تھا اُسے کیا مانگ رہا تھا

سمجھایا اُسے ہم نے تو انجامِ محبت
وہ عشق میں جلنے کا مزا مانگ رہا تھا

معلوم نہ تھا ختم ہوا اُس کا سفر بھی
جینے کی جو اوروں سے اَدا مانگ رہا تھا

کیا ایسے ستم کیش سے ہو بات ہماری
وہ دل کو لگانے کی سزا مانگ رہا تھا

ایسا بھی ہوا پھر کہ مسیحا مرا اِک دن
دم توڑ رہا تھا پہ شفا مانگ رہا تھا

پھیلا ہوا دامن تھا کسی شخص کا خنجر
پاگل تھا جو پتھر سے جزا مانگ رہا تھا

ثریا یٰسین (لاہور)

قرطاسِ اعزاز

شہزاد احمد

کے نام

جوازِ بندگی

فاری شا (لندن)

نام: شہزاد احمد
والد: ڈاکٹر حافظ محمد بشیر
والدہ: نور جہاں بیگم
پیدائش: ۱۶۔اپریل ۱۹۳۲ء امرتسر
شادی: ۱۹۶۳ء
بیگم: علیہ شہزاد
اولاد: دو بیٹے تین بیٹیاں
رہائش: 31۔ڈی آفیسرز کالونی، غازی روڈ لاہور چھاؤنی
فون: (92-42)-6660233
موبائل: 0345-4219177
ای میل: shehzad_ahmad@hotmail.com

تعلیمی سرگرمیاں:
(الف) ایم اے نفسیات 1952 گورنمنٹ کالج لاہور
(ب) ایم اے فلسفہ 1955 گورنمنٹ کالج لاہور
(ج) اکادمک رول آف آنرز گورنمنٹ کالج لاہور 1952-53
(د) صدر ایم اے او کالج لاہور سٹوڈنٹس یونین 1949-50
(ہ) سیکرٹری فلاسوفیکل سوسائٹی گورنمنٹ کالج 1949-50
(و) ایڈیٹر "راوی" گورنمنٹ کالج لاہور 1953-54

تصانیف و تالیف: شعری مجموعے (اردو)
☆صدف (۱۹۵۸ء) ☆جلتی بجھتی آنکھیں (۱۹۷۰ء) ☆ادھ کھلا دریچہ (۱۹۷۷ء) ☆خالی آسمان (۱۹۸۵ء) ☆بکھر جانے کی رت (۱۹۸۷ء) ☆دیوار پہ دستک (۱۹۹۱ء) ☆ٹوٹا ہوا پل (۱۹۹۳ء) ☆کون اسے جاتا دیکھے (۱۹۹۴ء) ☆پیشانی میں سورج (۱۹۹۵ء) ☆ جاگن والی رات، پنجابی (۱۹۹۶ء) ☆ اترے مری خاک پہ ستارہ (۱۹۹۷ء) ☆معلوم سے آگے (۱۹۹۷ء) ☆اندھیرا ہی کیا ہے (۱۹۹۹ء) ☆ایک چراغ اور بھی (۲۰۰۲ء) ☆آنے والا کل (۲۰۰۸ء) ☆مٹی جیسے لوگ (زیرِ اشاعت)

مرتبات:
☆نفسیات: مہذب تہذیب، موت (۱۹۶۲ء) ☆ذہنِ انسانی کا حیاتیاتی پس منظر (۱۹۸۷ء) ☆رنگِ غزل (۱۹۸۹ء) ☆پاکستانی ادب (شاعری، ۱۹۹۰ء) ☆سائنسی انقلاب (۱۹۹۰ء) ☆تیسری دنیا کے مسائل اور سائنسی انقلاب (۱۹۹۰ء) ☆دوسرا رخ (۱۹۹۰ء) ☆فرائڈ کی نفسیات کے دو دور (۱۹۹۴ء) ☆آج اور کل، سائنس کے آئینے میں (۱۹۹۵ء) ☆ژونگ کی نفسیات اور مخفی علوم (۱۹۹۷ء) ☆الفریڈ ایڈلر (۱۹۹۹ء) ☆گرجیف (۲۰۰۱ء) ☆اوس پنسکی (۲۰۰۲ء) ☆شوپنہار (۲۰۰۳ء) ☆ابراہیم ماسلو (۲۰۰۴ء) ☆وجودی نفسیات پر ایک نظر (۲۰۰۵ء) ☆آٹو رینک (۲۰۰۷ء)

تراجم:
☆تخلیقی رویے (۱۹۸۶ء) ☆نفسی طریق علاج میں مسلمانوں کا حصہ (۱۹۸۸ء) ☆ اذہان اور حقیقت (۱۹۹۳ء) ☆ سائنس کے عظیم مضامین (۱۹۹۶ء)

اقبالیات:
☆اسلامی فکر کی نئی تشکیل (اقبال کے خطبات کا ترجمہ) ۲۰۰۰ء

نظر ثانی:
☆وقت کا سفر (ترجمہ ناظر محمود) ۱۹۹۸ء

منتظر اشاعت:
☆اسلام کی پہچان ☆مسلم فلسفے کی تاریخ (از ایم ایم شریف) ☆محمد رسول اللہ ﷺ (از این میری شمل) ☆اسلامک آرٹ (ڈیرک ہارٹ) ☆اسلامی ثقافت (از افضل اقبال) ☆اسلامی سائنس (از حسین نصر) ☆اسلامی فلسفے کی تاریخ، جلد اول (از ماجد فخری)

زیرِ ترتیب:
☆تین جنسی نظریے (تحلیل نفسی)

اعزازات:
☆انجمن ترقی ادب کا بہترین مضمون نویسی ایوارڈ (۱۹۵۸ء)
☆آدم جی ایوارڈ شاعری (۱۹۶۹ء)
☆نقوش ایوارڈ شاعری (۱۹۸۹ء)
☆علامہ اقبال ایوارڈ شاعری (۱۹۹۶ء)
☆مسعود کھدر پوش ایوارڈ پنجابی شاعری (۱۹۹۷ء)
☆صدارتی تمغہ برائے حسن کارکردگی شاعری (۱۹۹۷ء)

سیاحت:
امریکہ، برطانیہ، کینیڈا، ناروے، سعودی عرب، عرب امارات، بھارت، قطر، بحرین، مسقط، چین، ملائیشیا، سنگاپور، [illegible] تھائی لینڈ۔

موجودہ مصروفیت:
ڈائریکٹر مجلس ترقی ادب لاہور

''غالبِ خستہ کے بغیر''

شہزاد احمد

غالب کا عہد تبدیلیوں کا زمانہ ہے، اگر پلٹ کر دیکھا جائے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ ثقافتی اور معاشرتی سطح پر ہزاروں برس کا فاصلہ حائل ہو گیا ہے۔ اب تو شاید ایک پتھر بھی ایسا نہ ہو جو اپنی جگہ پر قائم رہ سکا ہو، مگر اس کے باوجود ہم غالب کے ساتھ انتہائی قربت محسوس کرتے ہیں، اُٹھتے بیٹھتے غالب کے اشعار گنگناتے ہیں اور مختلف مواقع پر خواہ وہ مواقع کسی بھی نوعیت کے کیوں نہ ہوں، ہمیں غالب ہی کیوں یاد آتا ہے۔ اب تک بھی شعری اور نثری مجموعوں کا نام رکھتے وقت ہم غالب سے ہی رجوع کرتے ہیں۔ اگر کبھی دہلی جانے کا اتفاق ہو تو دل کے کسی گوشے میں یہ خواہش بھی ہوتی ہے کہ ان گلی کوچوں میں کہیں غالب نظر آ جائے۔۔۔۔ چنانچہ ان تمام فاصلوں کے باوجود وقت نے ہمارے اور غالب کے عہد کے مابین پیدا کر دیے ہیں۔ غالب ہمارے لیے ایک زندہ شخصیت ہے اس کا ایک ثبوت تو آج کا یہ اجتماع بھی ہے جہاں ہم غالب کے بارے میں کچھ کہنے اور کچھ سننے کے لیے اکٹھے ہوئے ہیں۔

دوسری طرف ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ دنیا بے حد تبدیل ہو چکی ہے۔ اب غالب کے زمانے کی ثقافت بعض ظلموں میں نظر آتی ہے جو خاص طور پر اسی مقصد کو پیشِ نظر رکھ کر بنائی جاتی ہیں۔ پچھلے ڈیڑھ سو برس نے دنیا کی ہر شے کو بدل کر رکھ دیا ہے۔ کہتے ہیں کہ جتنی تبدیلی دوسری جنگِ عظیم کے بعد اس کرۂ ارض میں ہوئی ہے وہ انسان نے پچھلے پچاس ہزار برس میں بھی نہیں دیکھی تھی۔ اب تو یوں لگتا ہے کہ آنکھ جھپکنے سے پہلے ہی منظر تبدیل ہو جاتا ہے اور شاید سب سے بڑی حقیقت اب صرف تبدیلی ہی رہ گئی ہے۔

جدید سائنس نے خود اپنی بنیادوں پر کلہاڑا چلایا ہے اس نے تو اس منطقی استدلال کے طریقے کو بھی قائم نہیں رہنے دیا جس کی بنیاد پر وہ سائنس کہلاتی تھی، مثلاً یہ کہنا منطق کے حوالے سے غلط تھا کہ یہ تسلیم کیا جائے کہ ایک ہی وقت میں رات بھی ہو اور دن بھی ہو، لیکن اب آدھی رات کے وقت جب ہم ویسٹ انڈیز میں ہونے والا کرکٹ میچ براہِ راست دیکھتے ہیں تو یہ صرف دن اور رات کی حقیقت ختم ہو جاتی ہے بلکہ یہ سوال بھی اٹھتا ہے کہ اصل کون سا ہے؟ کس شہر یا ملک کے وقت کو حقیقی وقت شمار کیا جائے؟

اسی حوالے سے یہ سوال بھی اٹھایا جا سکتا ہے کہ آج کے زمانے میں جب ہم غالب کو پڑھتے ہیں اور اس کی صورتِ حال کو اپنے دل کی گہرائیوں میں محسوس کرتے ہیں، تو ہماری گھڑی میں کیا وقت ہوتا ہے اور کیلنڈر میں کونسا سن؟ شاید صوفیاء نے اس صورتِ حال کا اندازہ پہلے سے کر لیا تھا اس لئے انہوں نے کہا تھا کہ وقت حقیقت میں کوئی شے نہیں ہے۔ غالب نے اس آنے والی صورتِ حال کو جب ماضی سے ملا کر دیکھا تھا، تو اس نے ایک Paradox یعنی متناقضہ کی شکل دے دی تھی، اس نے کہا تھا:

زندگی اپنی گر اس شکل سے گذری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

اس شعر میں جیسا کہ آپ محسوس کر سکتے ہیں، محض وقت کے بارے میں ایک واہمہ شکنی (Disillusionment) ہی موجود نہیں ہے بلکہ پورے نظامِ اقدار کے بارے میں ایک تشکیک بھرا رویہ بھی پایا جاتا ہے۔ اس سے یہ بھی جھلکتا ہے کہ زیاں کا احساس محض ماضی کے بارے میں نہیں ہے پورا مستقبل بھی اس کی لپیٹ میں آ گیا ہے۔ اگر کوئی صاحب اسے غالب کی توطیت قرار دے کر یہ ثابت کرنا چاہیں کہ یہ اس کا عمومی رویہ نہیں ہے تو اس بات کو درست ماننا بہت مشکل ہو گا۔

ترقی پسند تحریک نے توطیت کے اس رویے کو گالی بنا دیا تھا مگر اب وہ خود اس کے چنگل میں گرفتار ہے، اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کا آئندہ رویہ میلانِ طبع کے حوالے سے کیا ہونا چاہیے، مگر غالب کے ہاں رویے کبھی یک رخے نہیں ہوتے، اس کی رجائیت میں توطیت اور توطیت میں انائی درجے کی رجائیت پائی جاتی ہے۔ وہ اپنے دکھ کو بہت ہنستے کھیلتے ہوئے بیان کرتا ہے اور بسا اوقات وہ اپنے اس رویے میں اتنا آگے نکل جاتا ہے کہ بعض نقاد اسے خود فریبی قرار دینے پر مجبور ہو جاتے ہیں

گلیں میں میری لاش کو کھینچے پھرو کہ میں
جاں دادۂ ہوائے سرِ رہگذار تھا

اس شعر میں جو منظر بیان کیا گیا ہے اس میں سے آپ مرکزی کردار کو کسی صورت اور کسی حوالے سے نکال نہیں سکتے۔ یہ سارا منظر اپنے سیاقی بیان ہی اس وقت کر سکتا ہے جب اسے اس مرکزی کردار کے حوالے سے دیکھا جائے، جو لاش کی صورت میں دکھائی دے رہا ہے۔ منظر کے ساتھ فنکار کا تعلق کیا ہے؟ اگر فنکار منظر کو بیان کرتا ہے اور اس کا ردِ عمل تخلیقی نوعیت کا ہے تو اس بیان سے اس کی شخصیت کو خارج نہیں کیا جا سکتا، اگر ایسا کرنے کی کوشش کی جائے تو منظر ایک عام سی شے بن جاتا ہے اور اس کا وہ حوالہ باقی رہتا ہی نہیں ہے جو اسے شعر کا روپ دیتا ہے۔

یہ بات شاعر کو ہمیشہ سے معلوم تھی کہ دیکھنے والا خود منظر کا ایک حصہ ہے جس کے ہونے یا نہ ہونے سے منظر میں بنیادی تبدیلی آ سکتی ہے۔ میں برکلے کی طرح یہ کہنا نہیں چاہتا کہ جب میں آنکھیں بند کرتا ہوں تو منظر غائب ہو جاتا ہے بلکہ کوانٹم نظریے کے حوالے سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ دیکھنے والی آنکھ منظر میں تبدیلی پیدا کرتی ہے اور اس تبدیلی کی وجہ سے وہ بھی منظر ہی کا ایک حصہ بن جاتی ہے۔

اپنے اردگرد کے ساتھ بھی تعلق غالب کو ایک ناقابلِ فراموش شخصیت بنا دیتا ہے مگر شاعری میں تعلق ایک ہی شکل میں برقرار نہیں ہوتا، بلکہ قاری کی صورت حال کی وجہ سے تبدیل ہوتا رہتا ہے میرے لئے غالب کے جو معانی ہیں وہ ممکن ہے آپ کے لئے نہ ہوں مگر اتنی بات تو طے ہے کہ اس کا ہم عصر معاشرہ اس کی جو توجیہہ کرتا تھا وہ اس توجیہہ سے بالکل مختلف ہے جو اب کی جاتی ہے۔

غالب جس معاشرے کا فرد تھا وہ ایک متعین معاشرہ تھا اس کی اقدار کی درجہ بندی کہ خیر و شر کے نظریات، بلکہ ایک پورا نظام مابعد الطبیعات طے شدہ تھا لہٰذا جو شاعری ہو رہی تھی وہ اسے سمجھنے میں قاری کو کوئی دقت پیش نہیں آتی تھی وہ اس کی ایک وجہ تو زبان و بیان کے متعلق ایک اجتماعی رویہ بھی تھا، جس میں اختلافات کو کسی نہ کسی سند کے حوالے سے طے کر لیا جاتا تھا۔ لہٰذا اپنا آپ درست نہیں ہے کہ غالب کی اہمیت اپنے عہد میں ذوق سے یا کسی بھی اور شاعر سے کم تھی وہ جن لوگوں کا تعلق سرکار اور دربار سے ہوتا ہے ان کی اہمیت بنیادی طور پر سرکار اور دربار کے حوالے سے ہوتی ہے ادب یا فن کے حوالے سے نہیں، یہ صورت حال اب بھی کسی نہ کسی صورت میں موجود ہے مگر اب دربار کی جگہ میڈیا نے لے لی ہے یہ واقعہ اب بھی وقوع پذیر ہو سکتا ہے کہ کسی اہم ادبی شخصیت کو کچھ عرصے کے لیے نظر انداز کر دیا جائے (یہ واقعہ مثلاً مجید امجد اور جعفر طاہر کے ساتھ پیش آ چکا ہے) مگر ان میں ایک تو حتمی طور پر احیاء کے عمل میں سے گزرا ہے خود یورپ کے اندر بھی یہ واقعات ہوتے رہتے ہیں مگر جن شخصیات کو مرکزی حیثیت حاصل ہوتی ہے وہ کسی نہ کسی حوالے سے اپنی اہمیت کو قائم رکھتی ہیں۔

غالب کا ایک حوالہ تو خالصتاً کلاسیکی حوالہ ہے غالب نے اس کلاسیکی روایت کو اپنی انتہا تک پہنچا دیا، جو اردو میں ولی دکنی سے آغاز ہوتی تھی وہ اسے غزل کی کلاسیکی روایت کہا جاتا ہے اور یہ روایت عربی۔ عجمی روایت ہے جسے اردو میں بہت کم رد و بدل کے ساتھ قبول کیا گیا ہے اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ اس وقت کا معاشرہ امکانی سطح پر ان معاشروں جیسا ہی تھا مگر زیادہ اہم بات یہ تھی کہ معاشرے کے لیے جو آئیڈیل مقرر کئے گئے تھے وہ ان مثالیوں (Ideals) سے مختلف نہیں تھے جو دوسرے مماثل معاشروں نے اپنے لیے مقرر کر رکھے تھے۔ یہ محض اسلامی حیثیت نہیں تھی بلکہ اسلام کی وہ توجیہہ تھی جو ایران کے ذریعے سے ہم تک پہنچی تھی۔ بقول اقبال "اسلامی تاریخ کا اہم ترین واقعہ ایران کی فتح تھی۔" کچھ شعبوں میں عربوں نے ایران کو فتح کیا تھا مگر ثقافتی سطح پر ایران نے اس تہذیب کی بنیاد رکھی تھی جو اب برصغیر میں اسلامی تہذیب کہلاتی ہے اردو شاعری اور خصوصاً غزل اسی روایت کو لے کر آگے بڑھتی تھی۔ یہ ایک حیرت انگیز بات ہے کہ اردو غزل ثقافتی لحاظ سے مقامی اثرات سے اس قدر الگ تھلگ کیوں رہی، مقامی ثقافت کی ایک جھلک آپ نظیر اکبرآبادی کے ہاں دیکھ سکتے ہیں مگر نظیر کو ایک زمانے تک اردو کا نمائندہ شاعر سمجھا ہی نہیں گیا، خود نظیر پر بھی عربی عجمی روایت کے اثرات کچھ کم نہیں تھے مگر جو غزل ولی دکنی کے حوالے سے شروع ہوئی اس کی ساری ثقافتی فضا، کردار، بنیادی معتقدات، عمومی رویے اسی بنیاد پر قائم تھے۔ اگرچہ اردو میں مختلف مزاج کے شعراء نظر آتے ہیں مگر ان کے بنیادی سوال ایک دوسرے سے بہت مختلف نہیں ہیں میر کے عہد میں سودا اور خواجہ میر درد ایک دوسرے سے جداگانہ آوازیں ہیں مگر ان کی شعری فضا ایک جیسی ہے غالب تک آتے آتے غزل اپنے بہت سے امکانات کو actualise کر چکی تھی۔ اب یہ تصویر ایک ایسی حالت میں تھی کہ اسے کچھ Finishing Touches ہی لگانے باقی رہ گئے تھے۔ چنانچہ یہ آخری کام غالب کے حصے میں آیا اور اس نے اس کام کو ایسی خوبی اور چابکدستی سے کیا کہ نہ صرف یہ تصویر اپنی تکمیل کو پہنچی بلکہ تکمیل کے بعد اس عمل کی نوعیت بھی واضح ہو گئی وہ جو اس تصویر کو بنانے میں بنیادی کردار ادا کرتا رہا تھا۔ آپ کو مونالیزا کی تصویر دیکھنے کا اتفاق تو ہوا ہوگا اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اسے سمجھنے کے لیے خود لیونارڈو ونچی (Leo nado da vincy) کو سمجھنا ضروری ہے مونالیزا کے ہونٹوں پر کھیلنے والی مسکراہٹ لیونارڈو کے دل سے جنم لیتی ہے پھر یہ مسکراہٹ محض مونالیزا کی تصویر تک محدود نہیں اس کی کئی اور تصویروں میں بھی یہی مسکراہٹ نمایاں نظر آتی ہے ان تصویروں میں St.Anne اور John the Baptist خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

غالب نے بھی اس کلاسیکی روایت میں اس پُر اسرار مسکراہٹ کو واضح کیا جو اب اس کے اشعار کا طرۂ امتیاز ہے غالب نے میر کی طرح آنسو بہائے نہ سودا کی طرح جوشِ شگفتہ الفاظ میں جذبات کا اظہار کیا اور نہ ہی خواجہ میر درد کی طرح اس نے سالک کی ان گہرائیوں تک سفر کرنے کی کوشش کی، جو بالآخر روح کے اسرار تک چلی جاتی ہیں۔ غالب کا موضوع اردگرد کھلی ہوئی دنیا کے امکانات تھے، اگر محض زبان و بیان کی سطح تک دیکھا جائے تو غالب کی وہ تراکیب جو ہمارے بہت سے شعری مجموعوں کا نام بن چکی ہیں خود غالب کی ایجاد نہیں تھیں۔ مگر غالب نے جس حوالے میں ان کو استعمال کیا تھا، اس سے ان کا وہ رنگ اور روپ نکھر آیا تھا، جو اس ترکیب کو بنانے والے کے ذہن میں شاید کسی اور ہی شکل میں موجود ہوگا۔

غالب نے ایک قدیم اور زندہ روایت کو دم توڑتے ہوئے دیکھا، وہ اودھ کے ایسے سنگم پر ظاہر ہوا تھا، جب ایک سورج ڈوب رہا تھا اور ایک چاند طلوع ہو رہا تھا۔ جھٹ پٹے کا یہ وقت بہت جان لیوا ہوتا ہے مگر دن اور رات کے تمام راز اسی ایک لمحے میں کھلتے ہیں۔ اسی ایک لمحے میں ایک خون آشام دن ڈوبتا ہے اور ستاروں سے مزین رات جنم لیتی ہے یہ لمحہ موجود کی سب سے

زیادہ حساس صورت ہے۔ غالب کے عہد کے بعد یہ موقع اس وقت آیا تھا، جب برصغیر آزاد ہوا اور دو آزاد مملکتیں دنیا کے نقشے پر بیک وقت ابھر آئیں، مگر اس تحصیل میں جانے کا موقع نہیں ہے بات تو غالب پر ہو رہی ہے۔

غالب نے ان تمام امکانات کو اپنے سامنے کھلا دیکھا تھا جو غالب سے پہلے روایت کی دھند میں لپٹے ہوئے تھے۔ اس تخلیقی لمحے میں وہ امکانات شعری سچائی کے طور پر حقیقت کا روپ اختیار کر گئے، اور غالب کے اشعار میں وہ پہلو در آئے جن کی رسائی روایت میں بہت دور تک تھی۔

یہاں قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہم غالب کو کلاسیکی شعری روایت کا نمائندہ سمجھیں یا ایک جدید شاعر کے طور پر قبول کریں۔ پچھلے چند برسوں میں اس موضوع پر خاصی گفتگو ہوئی ہے مگر اردو کا پلڑا جدیدیت کی طرف جھکا ہوا نظر آتا ہے۔ بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ غالب ایک جدید فنکار ہے جو جدید ترقی پسندی کے حوالے سے کی گئی کروٹ بھی اس طرف جھکاؤ رکھتی ہے مگر اہم ترین نکتہ جس کو فراموش کر دیا گیا ہے یہ ہے کہ کیا یہ ممکن ہے کہ جدیدیت کا کوئی بھی مظہر دفعتاً یا اچانک پردۂ شہود پر ظاہر ہو جائے؟

انسانی علم میں جست کا عمل تو بہت ہے خود ارتقاء کے اندر کئی بار جست لی جاتی ہے اور ایک عام گراف چلتے چلتے، اچانک اوپر کی طرف چلا جاتا ہے اور مجموعی سطح بالکل تبدیل ہو جاتی ہے۔ جہاں تک علمی روایت کا تعلق ہے ایسی صورت حال کم کم پیدا ہوتی ہے خاص طور پر اس وقت جب کوئی علمی روایت اپنی تکمیل کی طرف سفر کر رہی ہو تو جست کا عمل ظاہر ہونے کا امکان نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے۔

میں اپنی بات کو ایک مثال سے واضح کرنا چاہوں گا اور یہ مثال میں نے جدید سائنس سے منتخب کی ہے اصل میں انسان کے بنیادی رویے ہر علم کے حوالے سے ایک جیسے ہی ہوتے ہیں، یہ جو فرق ہم سائنس اور فنون کے مابین دیکھ رہے ہیں، محض ظاہری فرق ہے دونوں میں تخلیقی عمل ایک ہی طرح بروئے کار آتا ہے۔ جس طرح ہم کوئی اچھی نظم لکھتے ہیں اسی طرح سائنس کا نظریہ بھی تخلیق ہوتا ہے خصوصاً کوانٹم اور جدید طبیعیات میں شاعر کی طرح سائنسدان کو بھی صرف پنسل کاغذ ہی کی ضرورت ہوتی ہے اور کبھی وہ بھی نہیں ہوتی۔ یہ سارے کا سارا عمل ذہن کے اندر طے پا جاتا ہے مگر اس کے اثرات کائنات کے جہان کبیر سے لے کر ذرے کے جہان صغیر تک ایک ہی طرح دیکھے جا سکتے ہیں۔

۱۹۰۵ء کے ایک جرمن سائنسی رسالے میں اس وقت کے ایک غیر پیشہ ور سائنسدان آئن سٹائن کے تین مضامین بیک وقت شائع ہوئے تھے، ان کا تعلق اضافیت کے خصوصی نظریے کے ساتھ تھا، ان کی تفصیل میں جائے بغیر میں صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ بیسوی صدی کی پوری سائنس کا انحصار اب ان تین مضامین پر ہے اور سائنس میں جو ترقی بھی ہوتی ہے اسی بنیاد پر ہوتی ہے مگر یہ سوال وہاں بھی اٹھایا گیا تھا کہ جدید دنیا کو تبدیل کرنے والا سائنسدان آئن سٹائن جدید سائنسدان تھا یا اسے کلاسیکی سائنس کا آخری نمائندہ سمجھا جائے؟ آئن سٹائن نے جس منطقی طرز فکر کی بنیاد پر اپنا نظام فکر بنایا تھا وہ بنیادی طور پر انیسویں صدی سے متعلق تھی اور اس کے ڈانڈے ارسطو کی منطق سے جا ملتے تھے، اس منطق میں تضادات کا ایک جگہ جمع ہونا ممکن ہی نہیں تھا، مگر جب اور ایک سائنسدان ہائزن برگ نے اپنے اصول وثوق (Principle of uncertinity) کے ذریعے یہ ثابت کیا کہ یہ ممکن ہی نہیں کہ ایک وقت میں حقیقت کے تمام پہلوؤں کو جانا جا سکے۔ اس نے کہا کہ ایٹم کے اندر اگر یہ اندازہ کیا جائے کہ کوئی پارٹیکل (Particle) کس مقام پر ہے تو رفتار کو نظر انداز کرنا پڑے گا لیکن اگر یہ جاننے کی خواہش کی جائے کہ پارٹیکل کی رفتار کیا ہے تو پھر اس کا مقام متعین نہ ہو سکے گا۔ یہ ایک بالکل ہی غیر منطقی صورت حال ہے آئن سٹائن کا عقیدہ تھا کہ اگر یہ خیال درست ثابت ہو گیا تو پھر سائنس کے لیے کوئی بنیاد ہی باقی نہ رہے گی، اس کے بعد بیس برس سے بھی زیادہ آئن سٹائن اس نظریے کو غلط ثابت کرنے کی دھن میں لگا رہا مگر ہیرا ہائزن برگ ہی درست ثابت ہوا۔

جدید سائنسی حوالے سے اس وقت ساری دنیا محض امکانات کا مجموعہ ہے۔ یہ پوری کائنات جو ہمارے ارد گرد پھیلی ہوئی ہے کوئی ٹھوس شے نہیں ہے بلکہ محض ایک "خیال" ہے ایک ایسا خیال جس کے اندر اس کے تضادات موجود ہیں۔ یہ صورت حال اگرچہ شاعری کے لیے نئی نہیں ہے مگر اس مابعد الطبیعاتی نظام کے لیے ضرور نئی ہے جس کے حوالے سے غالب نے شاعری کی تھی۔ اب تعینات کی حدیں ٹوٹ پھوٹ رہی ہیں اور یہیں سے کلاسیکی غزل اور جدید غزل کے درمیان ایک واضح فرق ابھر کر سامنے آ گیا ہے۔ اب غالب کی زمینوں میں نیا شعر نکالنا ممکن ہو گیا ہے کیونکہ ہم ان معتقدات سے باہر نکلنے کی پوزیشن میں آ گئے جن کا ایک پورا نظام غالب نے اپنی تکمیل تک پہنچایا تھا۔

تاریخ میں کچھ واقعات ایسے بھی ہوتے ہیں، جو ادوار میں تقسیم کر دیتے ہیں۔ مثلاً اگست ۱۹۴۵ء میں ہیروشیما کے مقام پر گرایا جانے والا ایٹم بم دنیا کو ایک نئے عہد میں لے جاتا ہے یہ نیا عہد اس حد تک نیا ہے کہ اس کا اندازہ اس واقعے سے پہلے کیا ہی نہیں جا سکتا تھا، کیونکہ پہلی بار ایک ایسا عہد ظاہر ہوا تھا جو اپنے ساتھ پوری کائنات کو تباہ کر دینے کی صلاحیت رکھتا تھا۔

* غالب کے عہد میں مغلیہ سلطنت کا ختم ہو جانا ہی اصل واقعہ نہیں ہے بلکہ اس عہد میں پوری دنیا کے ساتھ ساتھ برصغیر پاک و ہند بھی ایک ایسی کشمکش کے طویل سلسلے میں داخل ہوا تھا، جس کے امکانات اب پوری طرح محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ ایک متعین معاشرے کی بجائے ہمارے سامنے ایک روز

باقی: ایک موجود یا معش

براہ راست

اردو شاعری اور ادب کی بابت بہت سے حلقوں میں بالعموم یہ تصور تقویت پکڑ چکا ہے کہ تمام تر اردو ادب اور شاعری عشق و محبت کے ناپختہ احساسات کی ترجمان اور وقت گزاری کا ایک سادہ اور آسان ذریعہ ہے جسے خواندہ، نیم خواندہ بلکہ ناخواندہ لوگ بھی اپنا کر آسودگی حاصل کر سکتے ہیں۔ ایسا تصور رکھنے والے یا تو سادہ لوح ہیں یا علوم و فنون سے بے بہرہ۔ ہمارے دعویٰ کی تصدیق ذیل کے صفحات میں محترم شہزاد احمد صاحب نے نہایت اعلیٰ و ارفع خیالات اور بے حد شستہ الفاظ میں جس قدر سادگی سے بیان فرمائی ہے اس کے بعد اس باب میں مزید کچھ بھی کہنا وقت اور الفاظ کا ضیاع تصور ہوگا۔ آیئے ہم اور آپ باہمی گفتگو سے سوا ہو کر جناب شہزاد احمد کے ارشادات کی روشنی میں اپنے رویوں کو جانچیں، پرکھیں اور جس قدر ممکن ہو سکے اپنا محاکمہ خود کریں۔

گلزار جاوید

☆ شہزاد صاحب! THROUGH PROPER CHANEL کے مصداق گفتگو کی ابتدا آپ کے آبائی شہر امرتسر سے کی جائے تو آپ کے ایام طفلی اور گردوپیش سے بخوبی آشنائی ہو سکتی ہے؟

☆☆ امرتسر کی دوسرے شہروں سے مختلف بہت سی ثقافتی اور ادبی روایات تھیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ہندو مسلم قوموں کے درمیان تعلقات ہمیشہ کشیدہ رہا کرتے تھے۔ دو چیزوں کا امرتسر شہر میں بہت چرچا تھا ایک تو وہ زلزلہ جو تقسیم سے کئی برس قبل امرتسر میں آیا تھا۔ دوسرا جلیانوالہ باغ کا سانحہ جس کا تعلق ہمارے خاندان سے بہت گہرا تھا۔ میرے والد حافظ ڈاکٹر محمد بشیر صاحب جنہوں نے طب کے موضوع پر اردو زبان میں کئی کتابیں تحریر کی تھیں اس زمانے میں سیاسی طور پر بہت متحرک اور پرجوش تھے۔ چنانچہ جب برصغیر کا پہلا مارشل لا لگا تو اس میں شہر سے اٹھنے والے جنازوں میں صرف چار آدمی لے جانے کی پابندی تھی۔ کسی قسم کے جلوس وغیرہ کی قطعی ممانعت تھی مگر میرے والد نے جنازے کے جلوس کو لیڈ کیا جس کی پاداش میں انہیں سزائے موت سنائی گئی۔ اس کے بعد مقدمات کی طویل فہرست ہے جو دو ڈھائی برس تک چلتے رہے اور ایک معافی نامے کے تحت کچھ لوگوں کو رہا کیا گیا جن میں میرے والد بھی شامل تھے۔ جلیانوالہ باغ کا واقعہ مسلم و غیر مسلم اتحاد کا مظہر تھا مگر اس کے بعد کانگرس کے خلاف مسلمانوں کا ردعمل شروع ہوا تو بہت سے سیاسی گروہوں نے اس میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ میری عمر جب چھ برس کی تھی تو میرے والد کا انتقال ہو گیا وہ اس وقت امرتسر ضلع مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری تھے۔ چنانچہ والد صاحب کے انتقال کے بعد ہمارا خاندان بالکل تبدیل ہو گیا گھر بڑا اور ذرائع کم تھے افراد خانہ بھی میں اور میری والدہ پر مشتمل صرف دو افراد رہ گئے تھے۔ میرے بڑے بھائی کا انتقال ۱۹۳۶ء میں ہو گیا تھا اور دوسرے بھائی بسلسلہ ملازمت لاہور آ گئے تھے۔ اکلوتی بہن بیاہی جا چکی تھیں لہٰذا میرا بچپن بے حد تنہائی، خوف اور نامعلوم قسم کے حادثے کے انتظار میں گزر رہا تھا۔

☆ کچھ تفصیل پاکستان آمد اور نسبت روڈ والے گھر کی بیان ہو جائے تو گفتگو میں مزید روانی آ سکتی ہے؟

☆☆ ہم لوگ قیام پاکستان سے دو روز قبل لاہور آ گئے تھے جس کے چند ماہ بعد نسبت روڈ والے مکان میں آ بسے تھے۔ ہماری گلی میں جناب احمد ندیم قاسمی، محترمہ ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، عائشہ جمال، کلیم عثمانی صاحب اور علامہ نجیب جمر آبادی بھی مقیم تھے جس کے سبب بہت سے ادیبوں اور شاعروں کو دیکھنے کا اتفاق رہتا تھا۔ جناب پطرس بخاری اور امرتسر کے تمام ترقی پسند شعراء و ادیب قاسمی صاحب سے ملنے آیا کرتے تھے۔ میرے گھر کی کھڑکی جس طرف کھلتی تھی اس کے بالکل سامنے دیال سنگھ لائبریری ہوا کرتی تھی۔ اس کی چہل پہل اور کشادگی بھی بہت بھلی معلوم ہوا کرتی تھی۔

☆ چودہ سال کی عمر میں دودھ کے دانت پوری طرح نہیں جھڑتے جبکہ آپ اس کم سنی میں غزل کہہ بھی چکے اور چھپ بھی چکے؟

☆☆ یہ ایک دلچسپ داستان ہے۔ میں آٹھویں جماعت میں بھی نہیں گیا تھا کہ میرے کچھ ہم جماعت نعت خوانی کا شوق رکھتے تھے۔ اس زمانے میں معروف مروج طرزوں میں نعتیں لکھی جاتی تھیں۔ میرے دوستوں کو محلے کے ایک عطار بیدل امرتسری نیا دور یہ نعتیں ان کو لکھ دیا کرتے تھے۔ ایک بار کسی وجہ سے بیدل صاحب ناراض ہو گئے اور انہوں نے مزید لکھنے سے صاف انکار کر دیا۔ چنانچہ لڑکوں کی مایوسی دیکھ کر میں نے کہا کہ کیوں نہ ہم خود ہی کوشش کر کے دیکھیں۔ لہٰذا میں نے ایک نعت لکھی جو ان کی طرز پر پوری اترتی تھی مگر میرے دوست مطمئن نہ تھے ان کا خیال تھا کہ میری لکھی ہوئی نعت میں کوئی نہ کوئی فنی عیب ضرور ہونا چاہیے چنانچہ ہم اپنے محلے کے ایک اور شاعر عابد علی کاتب کے پاس گئے اور انہیں میری لکھی ہوئی نعت دکھلائی۔ ہمارا آپس میں یہ متفقہ فیصلہ تھا کہ ہم عابد صاحب کو شاعر کا نام نہیں بتائیں گے جبکہ عابد صاحب نے پہلا سوال ہی یہ کیا کہ یہ نعت لکھی کس نے ہے؟ لڑکوں نے میری طرف اشارہ کر کے عابد صاحب کو بتلایا کہ اس نے لکھی ہے تو عابد صاحب نے میری طرف حیرت سے دیکھتے ہوئے کہا کہ بھئی یہ تو پوری طرح وزن میں ہے لہٰذا مجھے پہلی دفعہ یہ علم ہوا

کہ شاعری میں وزن نام کی بھی کوئی شے ہوتی ہے۔ اس کے بعد میں نے اپنے طور پر شاعری شروع کر دی مگر سنانے کی نوبت کم ہی آتی تھی۔ میرے بڑے بھائی کے دوستوں میں سیف الدین سیف بھی تھے اُن کو میں نے چند چیزیں پڑھنے کے لیے دیں مگر اُن کی جانب سے کوئی جواب نہیں ملا۔ دوسری دفعہ میں نے پھر کوشش کی کہ سیف صاحب میری شاعری کے بارے میں کچھ بتلائیں مگر وہ اس بار بھی گول کر گئے۔ میرے ہم جماعتوں میں دو لڑکے ایسے تھے جن کو میں شعر سنا سکتا تھا ایک مظفر علی سید اور دوسرے صلاح الدین ندیم۔ جن غزلوں کی طرف آپ نے اشارہ کیا ہے وہ اسی زمانے میں لکھی گئی تھیں مگر اس بار سیف صاحب قدرے مہربان تھے اور انہوں نے ۱۹۴۸ء میں میری دو غزلیں "نرگس" کے غزل نمبر میں شائع کرا دی تھیں جس کے بعد لوگوں کو میری شاعری کی بابت علم ہو گیا تھا۔

☆ اکثر احباب جس عمر میں شعر کہنا شروع کرتے ہیں آپ کا اس عمر میں صاحبِ دیوان شاعر ہونا بھی اچنبھے کی بات ہے؟

☆☆ اس سے بھی زیادہ اچنبھے کی بات یہ ہے کہ اب مجھ سے بہت کم عمر لوگ بھی اپنی کتاب چھپوا لیتے ہیں۔ فرق شاید اتنا ہو کہ جب میری پہلی کتاب "صدف" شائع ہوئی تھی تو یہ عام روش سے ہٹی ہوئی شاعری تھی اور ناصر کاظمی نے "صدف" کو اس سال کی نمایاں کتاب قرار دیا تھا۔

☆ کم عمری میں پختہ شعری شعور اور مزاج میں پختگی و بے ساختگی کس کا فیضان ہے؟

☆☆ میں کسی سے باقاعدہ اصلاح کبھی نہ لے سکا البتہ مجھے پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ اسکول کے زمانے میں ہی میں نے داغ، فانی، اصغر کسی حد تک امیر مینائی اور ریاض خیرآبادی کو پڑھ لیا تھا عملی طور پر "مہتاب داغ" کئی برس تک میرے سرہانے پڑی رہی۔ نوآموز شعراء کے لیے داغ کا کلام ہمیشہ مشعلِ راہ رہا ہے اور اب بھی ہے۔ میری خوش قسمتی کہ مجھے اوائل عمر میں ہی داغ سے فیضان حاصل کرنے کا موقع مل گیا تھا۔ پاکستان بننے کے بعد یگانہ اور ظفر کو میں نے مسلسل کئی برس تک پڑھا۔ اقبال اور غالب کو ایم اے کرنے کے بعد ہی باقاعدہ پڑھنے کی نوبت آ سکی۔ ویسے بھی یہ دونوں ایسے شاعر ہیں جن کو آغازِ سفر میں پڑھنا بھی نہیں چاہیے ورنہ ان کو ماڈل بنانا تو اور بھی زیادہ خطرے کا باعث ہے۔

☆ کچھ روشنی "راوی" کی ادارت اور تجربات پر بھی ڈالیے؟

☆☆ مجھ سے پہلے مظفر علی سید "راوی" کے ایڈیٹر تھے اور انہوں نے "راوی" کو اس مقام تک پہنچا دیا تھا کہ کم از کم دوبار عسکری صاحب نے اس کا ذکر اپنی "جھلکیاں" میں کیا تھا۔ میں نے اسی روایت کو آگے بڑھانے کی کوشش کی۔ میری ادارت کی خاص بات "راوی" کا نظم نمبر تھا یہ شاید پہلا تجربہ تھا جس میں غزل کو شامل نہیں کیا گیا تھا۔

☆ کالج کے زمانے میں ڈرامے کا شوق کب تک آپ کے ہمرکاب رہا اور اس میں کوئی سنجیدہ پیش رفت کیوں نہ ہو سکی؟

☆☆ ڈراما ساری عمر میرے ساتھ چلا ہے۔ جن لوگوں سے میں نے زندگی کرنا سیکھا ہے ان میں IBSEN سرِفہرست ہے۔ میں نے کچھ ڈرامے ریڈیو، ٹیلی ویژن اور تھوڑا بہت فلم کے لیے بھی لکھا ہے۔ ڈرامے سے استفادہ میں نے اپنی شاعری میں کیا ہے جس میں تصادم اور کردار نگاری کسی نہ کسی طرح در آئی ہے۔

☆ سنا ہے سائیکل آپ کی زندگی میں خاص اہمیت کی حامل رہی ہے؟

☆☆ جی ہاں! ہر انسان کا کوئی نہ کوئی سائیکل تو ہوتا ہی ہے ہماری نوجوانی میں سائیکل ہونا بھی ایک عیاشی تھی۔ طالب علمی کے زمانے میں سائیکل پر ہی کالج آنا جانا ہوا کرتا تھا خودکار سواریاں تو بہت بعد کی چیز ہیں۔ اس کے علاوہ میں نے سائیکل بنانے والی ایک کمپنی میں ملازمت کے چند برس گزارے ہیں۔ اس زمانے میں ہمیں یہ خبط تھا کہ سرکاری نوکری نہیں کرنی چاہیے کیونکہ یہ فنان کی صلاحیتوں کی راہ میں حائل ہو جاتی ہے۔

☆ روٹی پلانٹ اور صوفی تبسم کے چشمے کی داستان کیا ہے؟

☆☆ خدا معلوم آپ کس چشمے اور روٹی پلانٹ کی بابت کیا معلوم کرنا چاہتے ہیں؟ روٹی پلانٹ میں مختلف حیثیتوں میں پانچ سال کام کیا ہے اور اس عہدے سے متعلق میرے تجربات انتہائی تلخ قسم کے ہیں۔ صوفی صاحب کی بابت یہ وضاحت کرنا چاہوں گا کہ میں ان کا باقاعدہ طالب علم نہیں رہا وہ فارسی کے استاد تھے اور میں نفسیات کا طالب علم تھا۔ نفسیات میں بصری ٹیسٹ کے دوران یہ بات میرے علم میں آئی کہ میری دور کی نظر قدرے کمزور ہے چنانچہ میں نے عینک لگوالی۔ ایک روز میں کالج میں داخل ہی ہوا تھا کہ صوفی صاحب نے مجھے دیکھ کر کہا کہ میاں! تم عینک لگا کر بجو لگ رہے ہو۔ میں نے دست بستہ عرض کیا کہ حضور اگر عینک اتار دوں تو پھر آپ مجھے بجو نظر آتے ہیں۔ اس واقعہ کی وجہ سے کالج میں میں خاصا معروف ہو گیا تھا۔

☆ P.T.V میں چیف آف سکرپٹ کے تجربات اور علیحدگی کے اسباب کی بابت کچھ بتلائیے؟

☆☆ ٹی۔وی پاکستان میں نیا نیا آیا تھا سب کو ٹی۔وی دیکھنے اور اس میں کام کرنے کا شوق تھا۔ الطاف گوہر صاحب اس زمانے میں سیکرٹری اطلاعات ہوا کرتے تھے۔ انہوں نے مجھے چیف آف اسکرپٹ بننے کی پیش کش کی جو میں نے شکریے کے ساتھ قبول کر لی۔ سوال جہاں تک علیحدگی کا ہے تو میں

بہت ہی مختصر لفظوں میں صرف اتنا ہی کہوں گا کہ وہ زمانہ ایوب خان کی دس سالہ کارکردگی کو سراہنے کا تھا جس کے لیے میں ذہنی طور پر تیار نہیں تھا۔ دباؤ بہت تھے پر روز کوئی نہ کوئی جھمیلا پڑا ہوا تھا لہٰذا میں نے خیریت اسی میں جانی کہ یہ کام چھوڑ کر پھر سے سائیکل بیچنا شروع کر دوں۔

☆ شہزاد احمد کو سیف الدین سیف کا شاگرد گردانے والے کس طرح کی غلط فہمی کا شکار تھے اور کیوں تھے؟

☆☆ یہاں صرف اتنا عرض کرنا کافی ہے کہ سیف صاحب نے میرے کسی شعر پر کبھی کوئی اصلاح نہ کی۔ ایک بار انہوں نے ایک لفظ تبدیل کیا تھا جو میرے لیے قابلِ قبول نہ تھا اس کے بعد میں نے ان سے مشورہ کرنا ترک کر دیا تھا مگر اُن کا احترام اب بھی میرے دل میں بہت ہے۔ ایک زمانے میں وہ میرے لیے ایک مثالی شخصیت کا درجہ رکھتے تھے اور ان سے ہم نے بہت کچھ سیکھا بھی تھا مگر ان کی شاعری کا اتباع کبھی نہیں کیا۔

☆ فلموں کے گیت لکھنے کی خواہش اور جستجو کے آغاز و انجام کی بابت کچھ بتلائیے؟

☆☆ فلموں میں گیت لکھنے کا کام کبھی سنجیدگی سے نہیں کیا۔ ایک زمانے میں احمد فراز اور میں چند دنوں کے لیے فلمی مشاغل کے ساتھ منسلک ہوئے تھے مگر یہ معاملہ ہمارے مزاج سے مطابقت نہ رکھتا تھا اس لیے زیادہ دیر نہ چلا۔

☆ انگریزی کے ROMANTICISM کی تشریح اور اردو کے زیرِ نظر شعر

آج تک اُس کا نشہ طاری ہے
پھول باقی نہیں خوشبو کا سفر جاری ہے

کی وجہِ تسمیہ سے غائبانہ تعارف تو کرائیے؟

☆☆ انگریزی کی اصطلاح "ROMANTICISM" کا مطلب میں اینٹی کلاسیک لیتا ہوں۔ جو روایت یونان سے شروع ہو کر گوئٹے سے ہوتی ہوئی کولرج، ورڈزورتھ، کیٹس، شیلے وغیرہ تک پہنچی۔ یہ اس طرح کی رومان پسندی نہیں ہے جو اردو میں رائج ہے۔ اردو میں اس کا مفہوم زیادہ تر آغازِ محبت کا زمانہ لیا جاتا ہے۔

☆ آپ کی شاعری نور کے استعارے کے گرد گھومتی نظر آتی ہے۔ روشنی کی طلب اور تڑپ کے کچھ تو اسباب آپ کے ہاں ضرور ہوں گے؟

☆☆ روشنی کی تلاش کس کو نہیں ہوتی مگر روشنی کے معنی ہر لکھنے والے کے لیے مختلف ہوتے ہیں۔ میں جس روشنی کی تلاش میں ہوں اس میں میرے بہت کم ہم عصروں کو دلچسپی ہے۔ میرے لیے تو طبیعیات اور مابعد الطبیعیات دونوں ہی روشنی کے ذریعے ہیں اور میں ان میں تفریق نہیں کرتا۔

☆ آپ کے حوالے سے غالب، داغ، میر، حالی اور اصغر کا ذکر لازمی تصور کیا جاتا ہے مگر اس ذکر میں یگانہ اور اقبال کو بھی نمایاں مقام حاصل ہے؟

☆☆ یگانہ اور اقبال سے میں نے بہت کچھ سیکھا ہے۔ اس فہرست میں صرف ایک نام رہ گیا ہے "نظیر اکبر آبادی" اس کا اضافہ بھی کر لیجیے۔ پنجابی شاعری میں زمین کے ساتھ ساتھ رہتے ہوئے آسمان کو چھو لینے کی جو خواہش پائی جاتی ہے ویسی ہی خواہش نظیر اکبر آبادی کے ہاں نظر آتی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ پنجابی کے صوفی شعراء میں عمودی ارتفاع بہت ہے جبکہ نظیر میں افقی وسعت پذیری نمایاں ہے۔

☆ بیرونِ ملک اہلِ قلم میں فرائڈ، ورڈزورتھ، ژونگ، ڈکنز اور آرتھر سے بھی آپ کی نسبت کے حوالے ملتے ہیں؟

☆☆ ان کے علاوہ بھی مغربی ادب کے بہت سے لوگوں سے میں متاثر ہوں مثلاً دوستوفسکی، فریڈرک ہیسے اور جاپانی فکشن پڑھنے کا موقع بھی مجھے ملتا رہا ہے۔ جاپانی ادب دنیا کے اعلیٰ ترین ادب میں شمار کیا جاتا ہے۔

☆ اوّل غزل کے از کار رفتہ ہونے کی بابت آپ کی رائے دوم نظم جیسی ترقی یافتہ صنف سے تاخیری ملاقات احباب کی توجہ طلب کر رہے ہیں؟

☆☆ یہ عجب بات ہے کہ میں نے لکھنا نظم سے شروع کیا تھا۔ غزل کی طرف اس لیے بھی راغب ہوا کہ اس زمانے میں غزل کو بہت برا سمجھا جاتا تھا اور اس میں ترقی پسند تحریک اور حلقۂ اربابِ ذوق دونوں شامل تھے۔ لہٰذا کلاسیکی ادب پڑھتے ہوئے میری بار بار ملاقات غزل سے ہوتی تھی۔ دو مصرعوں کے درمیان ان کہی بات کی جو فراوانی غزل کے اندر موجود ہے وہ صدیوں میں پیدا ہوئی ہے اور اس کا کوئی بدل نہیں ہے یوں سمجھ لیجیے کہ نظم عام طور پر فرد کا اظہار ہے اور غزل جنتا کا۔

☆ آپ کی شاعری شعوری کوشش کے باعث منطقی شاعری کیوں نظر آتی ہے؟

☆☆ شاید آپ کو علم نہیں کہ میں منطق کو مانتا ہی نہیں ہوں۔ میرا پیر و مرشد تو ہائزن برگ ہے جو اصولِ لایقینی کی بات کرتا ہے۔ اگر منطقی شاعری سے آپ کی مراد وہ شعری ساخت ہے جو انسانی شعور میں پائی جاتی ہے تو بات بالکل مختلف ہو جائے گی۔ میں صرف اس قدر کہنا چاہتا ہوں کہ شاعری ایک کھلا مکان ہے جس کی کوئی سرحد مقرر نہیں کی جا سکتی اور نہ ہی شاعری نے کبھی اس طرح کے پابند کو قبول کیا ہے۔

☆ کچھ لوگ آپ کو نئی روش نکالنے کا کریڈٹ بھی دیا کرتے ہیں۔ کیا آپ انہیں اپنی تراشیدہ روش کا معین رخ بتانا پسند کریں گے؟

☆☆ یہاں مجھے یہ تسلیم کرنا ہے کہ میں نے کسی شعوری یا غیر شعوری

کوشش سے کوئی روشنی نہیں ملتی۔ ہماری طالب علمی کے زمانے میں تین اہم موضوع ہوا کرتے تھے۔ کارل مارکس، فرائڈ، آئن سٹائن۔ کارل مارکس کی جو توجیہہ ترقی پسند کرتے ہیں وہ مجھے کبھی بھی قبول نہیں رہی۔ ایک فرائڈ کی طرح میں یہ سمجھتا ہوں کہ کارل مارکس ہیگل کی فلسفی نہیں تھا انسان پسند تھا (ہیومنسٹ) فرائڈ اور آئن سٹائن دونوں ہمارے لیے چیلنج کی حیثیت رکھتے تھے۔ فوری طور پر آئن سٹائن کو سمجھنا تو ممکن نہ تھا البتہ فرائڈ کو طویل مطالعہ سے پڑھا اور سمجھا جا سکتا تھا۔ یہ انسان کی بالکل ہی نئی توجیہہ تھی اور اتنی بھرپور تھی کہ اس کی مدد سے انسانی کردار کو بیان کرنے کے امکانات بڑھ جاتے تھے۔ ایک طویل عرصے تک آئن سٹائن کو سمجھنا میرے لیے ممکن نہ تھا لیکن جب مجھے پتہ چلا کہ آئن سٹائن کوئی ریاضی پیچیدگی نہیں ہے بلکہ وہ دنیا کو دیکھنے کا بالکل ہی مختلف زاویہ دیکھتا ہے۔ مثلاً اس نے ٹائم کو اسپیس کا حصہ بنا دیا تھا اور یہ اتنی بڑی دریافت تھی جس کی وجہ سے ہمیں اپنے تمام علوم کو پھر سے دیکھنے کی ضرورت پیش آ گئی تھی۔ پھر جس چیز نے مجھے بہت متاثر کیا وہ کوانٹم نظریہ تھا جس نے اسباب و علل کے نظام ہی کو ختم کر دیا تھا۔ شاعری کے لیے اس سے زیادہ گنجائش کہاں ہو سکتی ہے۔

☆ آپ کو اردو غزل میں نفسیات کے برتاؤ کا اولین شاعر گردانے والے آپ کے خیر خواہ ہیں یا دانا دوست؟

☆☆ میں نے نفسیات کو جان بوجھ کر غزل میں نہیں برتا تھا وہ میرے مزاج کا حصہ بن گئی تھی اور اب بھی میں اسی عینک سے چیزوں کو دیکھنے کی عادت اختیار کیے ہوئے ہوں۔ فرق صرف اتنا پڑا ہے کہ اس میں کچھ اور بھی علوم شامل ہو گئے ہیں جن میں نظریاتی طبیعیات سب سے زیادہ اہم ہے۔

☆ ابتدا میں آپ فرد اور ذات کی نفسیات کو شاعری میں سمویا کرتے تھے۔ کچھ عرصے سے آپ کے ہاں معاشرتی نفسیات کا برتاؤ بھی نظر آنے لگا ہے؟

☆☆ آپ کی بات درست ہو سکتی ہے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ معاشرہ فرد کے لیے اہم ہوتا چلا جاتا ہے ویسے بھی فرد جو غول بنتا جائے زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتا اس لیے میں نے اپنی ہر کتاب میں غیر شعوری طور پر ہی کسی نئے زاویے سے زندگی کو دیکھنے کی کوشش کی ہے۔

☆ کچھ تفصیل اپنی شخصیت و فن پر تحقیقی کام کی بتلائیے؟

☆☆ میں سمجھتا ہوں یہ سوال میرے لیے نہیں ہے۔

☆ شاعری میں آپ کی آواز جس قدر توانا اور طاقتور ہے اس قدر اردو تنقید میں آپ کا ذکر نہیں ملتا۔ آپ کے ہاں اس حوالے سے کچھ نہ کچھ تحفظات یقیناً ہوں گے؟

☆☆ اب میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ احباب نے مجھے سمجھنا ہی شروع نہیں کیا۔ جب آپ کوئی نیا شروع کرتے ہیں تو اس سے پہلے آپ کو اس کا TAST DEVELOP کرنا پڑتا ہے اس کے بغیر کوئی بڑی تخلیق نہیں ہو سکتی ہے۔

☆ CLINICALY DEAD والے واقعے کی تفصیل اور آپ کی شخصیت پر اس کے اثرات کی بابت کچھ فرمائیے؟

☆☆ ۱۹ مارچ ۱۹۸۲ کو میں کراچی کی ایک میٹنگ میں مصروف تھا اسی دوران مجھے دل کا دورہ پڑا اور سانس آنا بند ہو گیا۔ میں نے اپنے ساتھیوں کو اشارے سے بتلایا کہ مجھے دل کا دورہ پڑا ہے۔ ہم جس عمارت میں تھے وہ خاصی اونچائی پر تھی اس کی لفٹ تک جانے میں بھی کافی وقت لگتا تھا۔ بہرحال میں خود چل کر لفٹ تک گیا اور اپنے پیروں پر بلڈنگ سے باہر نکلا۔ محمود شام مجھے لے کر کارڈیو ویسکولر انسٹیٹیوٹ میں گئے وہاں بھی میں نے پیدل کچھ سفر کیا۔ ڈاکٹر سید اعظم کے پاس جب ہم گئے تو انہوں نے دریافت کیا کہ آپ کیا محسوس کر رہے ہیں مجھے اس دوران دل کا دوسرا دورہ پڑ چکا تھا۔ ڈاکٹر نے میری حالت دیکھ کر وہیل چیئر پر بٹھا کر ایمرجنسی کی طرف دوڑ لگا دی۔ بستر پر لیٹتے لیٹتے میرے دل کی حرکت بند ہو چکی تھی۔ پہلے مجھے مصنوعی سانس کے ذریعے زندہ کرنے کی کوشش کی پھر سینے پر زور دے کر اور اس کے بعد محمود شام کو باہر بھیج کر مجھے الیکٹرک شاک دیے گئے اور خوش قسمتی سے میرے دل نے پھر سے دھڑکنا شروع کر دیا۔ اس کے بعد میں کوئی ڈھائی ماہ ہسپتال میں رہا۔ اس دوران کئی مرتبہ مجھ پر قلبی دورے کا حملہ ہوا نبض غائب ہوئی، کئی دفعہ سی سی یو لے جایا گیا۔ آخر ڈاکٹرز نے یہ سمجھ لیا کہ میرا زندہ رہنا ممکن نہیں ہے لہذا مجھے بڑے اہتمام اور انتظام کے ساتھ لاہور بھجوا دیا گیا۔ میری بھی خواہش لاہور کی مٹی کی تھی۔ لاہور پہنچتے ہی مجھے پھر قلبی دورہ شروع ہو گیا۔ کوئی ایک ماہ ہسپتال میں اسی حالت میں رہا اس کے بعد مجھے ڈاکٹرز نے کہا کہ کوئی پراگریس نہیں ہو رہی اس لیے تم گھر چلے جاؤ مگر ایک نوجوان ڈاکٹر نے مجھے کہا کہ تم بستر پر پڑے پڑے پریشان ہو جاؤ گے اس لیے تھوڑا تھوڑا چلنا شروع کرو لہذا میں نے باتھ روم تک چلنا شروع کر دیا۔ پھر ایک اور ڈاکٹر کے پاس وہیل چیئر پر بیٹھ کر گیا اس نے بھی مجھے چلنے کے لیے راغب کیا اور میری خواہش بھی شدید تھی کہ میں چلوں۔ آہستہ آہستہ میں نے ڈاکٹر کی ہدایت سے زیادہ چلنا شروع کر دیا اور دو تین ہفتوں کے بعد جب میں ڈاکٹر کے پاس گیا تو میں پینتالیس منٹ تک واک کر سکتا تھا۔ ڈاکٹر کے لیے یہ بات خوشگوار حیرت کا باعث تھی چیک اپ کے بعد اس نے مجھے واک جاری رکھنے کی ہدایت کی۔ آج کل میرے معالج ڈاکٹر افضل نجیب لیفٹیننٹ جنرل (ر) مجھ سے زیادہ میری بیماری کے متعلق پریشان رہتے ہیں مگر میں لبرٹی لیتا رہتا ہوں۔ شاید اسی رویے کی وجہ سے میں نے اس عالم میں قریب بیس سال گزار لیے ہیں۔

اک لمبی رات میں نے تیری فرقت میں گزاری ہے

پھر اس کے بعد مجھ کو موت سے ڈر ہی نہیں آیا

☆ سائنسی علوم، فلسفہ، نفسیات اور طبیعیات سے آپ کے شغف کے اسباب اور تراجم میں ترجیحات کا تعین بھی ضروری ہے؟

☆☆ تراجم کرنے کا خیال مجھے کبھی نہیں آیا تھا۔ پہلا ترجمہ میں نے اس لیے کیا کہ مجھے چلنے پھرنے کی اجازت نہیں تھی اور اشفاق احمد صاحب کو HOW TO THINK قسم کی ایک کتاب کا ترجمہ کرانا تھا جو میں نے کوئی مہینے بھر میں کر دیا۔ وہ ترجمہ میرے استاد ڈاکٹر اجمل کو اتنا پسند آیا کہ انہوں نے اپنی کتاب ترجمے کے لیے بھجوا دی۔ پھر سراج منیر نے مجھے اقبال لیکچرز کا ترجمہ کرنے کو کہا اور وہ بھی میں نے کر دیا۔ اس دوران میں کچھ سوشیالوجی آف سائنس اور دماغ کے بارے میں اپنے طور پر جمع کر رہا تھا چنانچہ دو کتابیں میں نے تالیف کیں اور قریب آٹھ کتابوں کا ترجمہ ثقافتِ اسلامیہ کے لیے کیا۔ پھر نفسیات پر کتابیں لکھنا شروع کر دیں کیونکہ روزی کمانے کا اور کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ مارکیٹنگ میری تخصیص تھی مگر اب مجھے اس کی اجازت نہیں تھی لہٰذا میں صرف وہی کام کر سکتا تھا جو گھر پر بیٹھ کر ہو سکے۔ اس کے بعد میں نے سنگ میل کے لیے بہت سی کتابیں لکھیں۔ مجھے ایک بات کی خوشی ہے کہ میں نے اس دوران کسی سے کوئی مالی مدد نہیں مانگی اور نہ کسی سرکاری ادارے کی کوئی مدد قبول کی۔ ایک وجہ میری موجودہ جزوی صحت یابی کی یہی ہو سکتی ہے۔ اب بھی میں بعض دواؤں پر زندہ ہوں۔ یہ جو بتاتا ہے نیا جگر ملنے سے پرہیز لازمی ہے لیکن میں نے اپنی زندگی کو اپنی حدود میں رہ کر آسان بنانے کی کوشش ضروری ہے۔

☆ مطالعہ، مشاہدے اور تجربے کی بات ہے کہ جب سینئر شعراء سے تازہ کلام کی بابت دریافت کیا جاتا ہے تو وہ تخلیقی سوتے خشک ہونے کے باعث نثر کی جانب توجہ کی بات کرتے ہیں۔ آپ کا فلسفہ، سائنس اور طبیعیات کا سفر کس امر کا غماز ہے؟

☆☆ انسپریشن حاصل کرنے کے لیے پہلے میں صرف شاعری یا فکشن کا مطالعہ کیا کرتا تھا۔ اب جب میں ڈپریشن کا شکار ہوتا ہوں تو نظریاتی طبیعیات پڑھتا ہوں اور اس میں میرے لیے حیرت کے مقامات شاعری سے کسی طرح کم نہیں ہوتے۔

یہ حقیقت ہے کہ میں زندہ اسی کے دم سے ہوں
سانس بھی لینے نہیں دیتی جو حیرانی مجھے

☆ خدا پرست سیکولر صوفی کی اصطلاحات اور نظریہ حیات کی بابت رہنمائی بھی ضروری ہے؟

☆☆ طبیعت ہی ایسی سیماب پائی ہے کہ میں ایک جگہ ٹک نہیں سکتا۔ آپ کو بھی موقع ملے تو سوچتی جائیے کہ اس پر نظر مرکوز کرنے کی کوشش کریں۔ آپ کو حیرت ہوگی کہ زیادہ دیر تک آپ ایسا نہیں کر سکتے۔ میں تو ویسے ہی فری فلوٹنگ آدمی ہوں کبھی پلان بنا کر زندگی نہیں گزاری۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ میں نے طالب علمی کے آغاز ہی میں کارنیگی کو پڑھا تھا اور یہ فیصلہ کیا تھا کہ کارنیگی کے بتائے ہوئے اصولوں پر عمل نہیں کرنا اور کوئی ایسی پابندی قبول نہیں کرنی جو آپ کو پابند کر کے رکھ دے لہٰذا بہت سے میدانوں میں کام کیا۔ آپ مجھے جیک آف آل ٹریڈز کہہ سکتے ہیں لیکن میں کسی بھی کام کا ماسٹر ہرگز نہیں ہوں۔ مجھے دن میں اگر ایک حیرت سے واسطہ پڑ جائے تو میرا دن اچھا گزر سکتا ہے اور یہ حیرت کہیں سے بھی آ سکتی ہے۔ میں نے اپنے سب دروازے کھلے رکھے ہوئے ہیں۔

☆ بہت سے لوگ آپ کا روحانیت سے بھی تعلق جوڑا کرتے ہیں مگر آپ کے روحانی تصور سے آگاہ نہیں کرتے؟

☆☆ صاحب سیدھی سی بات ہے کہ روایتی طور پر ہم اپنے ماضی سے جڑے ہوئے ہیں اگر یہ رشتہ کمزور پڑ جائے تو ادب تخلیق ہی نہیں ہو سکتا لیکن اب ہمارے لیے اس سے بھی بڑی مشکل پیدا ہو گئی ہے۔ مستقبل ہمیں اپنی طرف بلا رہا ہے۔ اسپیس کے ساتھ ہمارا رشتہ قائم ہو رہا ہے۔ اب ہم صرف ماضی کے حوالے سے زندگی گزار نہیں سکتے۔ اب ہمیں مستقبل کے حوالے سے جینا ہوگا۔ یہ بہت مشکل کام ہے کیونکہ ہمارا دماغ اس کے لیے بنا ہی نہیں گیا۔ اگر ہم اسپیس میں چلے بھی جائیں تو ہم اسپیس کی تمام ڈائمنشنز کا ادراک نہیں کر سکیں گے کیونکہ ہمارے پاس صرف چار ڈائمنشنز ہیں۔ امکان اس بات کا ہے کہ ڈائمنشنز بہت زیادہ ہو سکتی ہیں۔ کوئی کمپیوٹر چپ جو کہ دماغ کے اندر لگی ہوئی ہو یا خود بھی ہماری ایک حد تک ہی مدد کر سکتی ہیں لہٰذا آدمی کو اپنے کاندھوں پر پاؤں رکھ کر اوپر چڑھنا ہوگا۔ یہ مشکل ضرور ہے مگر ناممکن نہیں ہے۔

☆ معنی کی تلاش کو آپ نے اپنا مسئلہ کب اور کیونکر بنایا اور اس میں آپ کو کس حد تک کامیابی ملی؟

☆☆ میں کامیابیاں نہیں ناکامیاں گنوا سکتا ہوں۔ جب ہم کوئی چیز دریافت کرتے ہیں تو ہمارا نادریافت کم نہیں ہوتا بلکہ اور پھیل جاتا ہے۔ ایک امریکی اور ایک ریڈ انڈین ریتیلے میدان پر کھڑے تھے۔ امریکن نے اپنی چھڑی کے ساتھ ایک چھوٹا سا دائرہ بنایا اور اس چھوٹے دائرے کے گرد ایک بڑا سا دائرہ بنایا اور ریڈ انڈین کو مخاطب کر کے بولا کہ یہ جو چھوٹا دائرہ ہے یہ وہ علم ہے جو تم جانتے ہو اور یہ بڑا دائرہ وہ علم ہے جو ہم جانتے ہیں۔ ریڈ انڈین نے چھڑی پکڑ کر دونوں دائروں کے اردگرد ایک بہت بڑا دائرہ بنایا۔ امریکی نے پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ تو ریڈ انڈین نے کہا کہ یہ وہ علم ہے جو تم جانتے ہو نہ میں جانتا ہوں۔

☆ لفظ کے اوپر سے بوجھ اتارنے کی اصطلاح کا کوئی مطلب اور

مفہوم ہے تو ہمارے قاری کو اپنی جستجو سے ضرور آگاہ کیجیے؟

☆☆ ویسے تو لفظ خود ایک بوجھ ہے جو ہم نے اپنے علم پر سوار کیا ہوا ہے۔ حقیقی علم تو وہ ہے جس میں لفظ استعمال ہوتا ہی نہیں۔ خواہ آپ اسے ریاضی کہہ لیں یا باطن کی روشنی کہہ لیں۔

☆ خدا، کائنات اور انسان کی تثلیث میں فکر و کے نتائج سے آپ مطمئن ہیں تو احباب کے ہاں بے اطمینانی اور خلفشار کیوں پایا جاتا ہے؟

☆☆ بھائی یہ سوال اتنا پیچیدہ ہے اس کا جواب اس سے بھی زیادہ الجھاؤ کا باعث بن سکتا ہے۔ یہ موضوع آسانی یا اختصار سے دسترس میں آنے والا نہیں اسے پھر کسی وقت کے لیے اٹھا رکھیے۔

☆ مذہب، تہذیب، موت کے تصور کے تجزیہ اور نتائج سے آگاہی بھی ضروری ہے؟

☆☆ یہ اصل میں فرائڈ کا ایک نقطۂ نظر ہے جس پر میں نے اس لیے کتاب لکھی تھی کہ فرائڈ کو جنس تک محدود کر دیا گیا تھا حالانکہ فرائڈ نے زندگی کے آخری دور میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ انسان کے اندر ایک جبلت مرگ بھی ہوتی ہے جو ہمارے بہت سے مسائل کی وجہ ہے۔ یہ کتاب ایک طرح کی تعارفی کتاب ہے جو فرائڈ کے اس نظریے کو بیان کرنے کے لیے لکھی گئی تھی۔

☆ آدمی اور کائنات کو کھنگالنے کے بعد حقیقت یا خدا کی جانب آپ کا سفر کس مرحلے میں ہے؟

☆☆ نہ میں کائنات کو جانتا ہوں اور نہ آدمی کو سمجھ سکا ہوں۔ میرا علم تو ابھی سیکھنے کے مرحلے میں ہے۔

☆ کیا آپ انسان کے اُس جوہر کی تلاش میں کامیاب ہو سکے ہیں جو تمام نسبتوں سے بے نیاز ہے؟

☆☆ مثالی صورت حال تو یہی ہے کہ آدمی اُسے تلاش کرے مگر یہ کب ہوگا، کیوں ہوگا، کہاں ہوگا ہم تو اس کا جواب بھی نہیں دے سکتے؟

☆ پہلے ہم انسان کی اجنبیت کا رونا رویا کرتے تھے اب اسلامی دنیا بالخصوص پاکستان کی تنہائی کا بین کیا کرتے ہیں۔ آخر ہمارا المیہ کب اور کہاں جا کر ختم ہوگا؟

☆☆ المیے کبھی ختم نہیں ہوتے۔ ایک المیہ ختم ہوتا ہے تو دوسرا المیہ اس کی جگہ لے لیتا ہے۔ انسان کی ساری تاریخ المیوں سے بھری پڑی ہے مگر افسوس انسان نے ان المیوں سے سیکھا کچھ نہیں۔ انسان کا خمیر المیوں میں رہنا چاہتا ہے اسی لیے گریٹ ٹریجڈیز کو عظیم کہا جاتا ہے۔

☆ تاریخ گواہ ہے کہ دنیا میں جاری ہوس کی جنگ کے ردعمل میں تبدیلیاں ناگزیر ہوا کرتی ہیں۔ موجودہ خلفشار کو آپ کس رخ پر جاتا دیکھ رہے ہیں؟

☆☆ میں نے ایک پیپر لکھا تھا جو یونین کے متعلق تھا۔ جس کا نام تھا "ایک صورت خرابی کی" میرا خیال ہے انسانی ساخت میں کوئی ایسی خرابی رہ گئی ہے جو اسے خراب رکھتی ہے کوئی وجہ نہ بھی ہو تو لڑنے کی وجہ پیدا کی جا سکتی ہے جس طرح آج کل بھارت کر رہا ہے وہ اپنے بعض مسائل حل کرنے کے لیے ہمیں نشانہ بنانا چاہتا ہے مگر اس طرح مسائل حل نہیں ہوتے بلکہ اس طرح اندرونی کمزوریاں سامنے آ جاتی ہیں۔ ارسطو نے انسان کی تعریف کرتے ہوئے کہا تھا کہ انسان ریشنل اینمل ہے۔ فرائڈ نے کہا تھا کہ وہ ریشنلائزنگ اینمل ہے مطلب یہ کہ انسان اپنے ہر فعل کا جواز تلاش کرتا ہے اور اس کے سارے علوم اس جواز کو تلاش کرنے کی داستان بیان کرتے ہیں۔

☆ ایسی صورت حال میں آپ اردو زبان و ادب کی مستقبل کی بابت کس طرح کی پیش گوئی کرنا مناسب خیال کرتے ہیں؟

☆☆ اردو کے بارے میں ہم لوگ خوش فہم واقع ہوئے ہیں۔ پچھلے دنوں سات آٹھ کانفرنسز دیکھنے کا اتفاق ہوا کہیں اردو کو دنیا کی پہلی، کہیں دوسری اور کہیں تیسری بڑی زبان کہا گیا مگر یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ جس زبان کا رزق سے تعلق نہ ہو وہ کسی نہ کسی وقت معدوم ہو سکتی ہے۔ سنسکرت اور عبرانی کی مثال ہمارے سامنے موجود ہے۔

☆ مجلس ترقی ادب کی اب تک کی کارگزاری کیا ہے اور آپ کے دور میں کس طرح کی تبدیلیاں عمل میں آئی ہیں؟

☆☆ پچھلے ادوار کی بابت میں کچھ کہنا نہیں چاہتا۔ میں اپنے دو سالہ دور کی بابت یہ عرض کر سکتا ہوں کہ ہم نے مجلس ترقی ادب کی بیس ہزار غیر مربوط کتابوں کی مربوط انداز میں لائبریری بنا دی ہے اور ان دو سالہ دور میں جتنی تعداد میں مجلس ترقی ادب نے کتابیں شائع کی ہیں اس کی ماضی میں مثال نہیں ملتی۔ ہم نے چند بڑی زبانوں مثلاً انگریزی، فارسی، ہندی، عربی وغیرہ کا منتخب تراجم کا اہتمام کیا۔ اسے کسی نہج پر کیا ہے اور کلچر کے مختلف گوشوں کا اہتمام بھی کر رہے ہیں۔

☆ تیسری دنیا کے معاشی طور پر دیوالیہ ملک میں ادب کے نام پر اتنی ڈھیر ساری دکانیں کھولنا مناسب ہے کیا؟ بہتر نہیں کہ ایک ہی چھت کے نیچے تمام اداروں کو الگ الگ یا ادغام کے ساتھ ایک ادارہ قائم کر دیا جائے؟

☆☆ آپ یہ گلہ صرف ادب ہی پر کیوں لاگو کر رہے ہیں اگر ادب تمام کا تمام بھی قومی معیشت سے نکال دیا جائے تب بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ میرے عزیز ہم علم و ادب پر خرچ ہی کتنا کرتے ہیں یہ تو ہماری ترجیحات میں سب سے آخر میں آتے ہیں۔

شبِ امید

شہزاد احمد صاحب کے غزلیہ کلام سے چیدہ اشعار

فیروز عالم (یو-ایس-اے)

نکل آیا ہے سورج اور مری آنکھیں نہیں کھلتیں
میں ڈرتا ہوں نہ جانے آج کا اخبار کیا ہوگا

......

کیا انسان اس کائنات میں بالکل تنہا ہے
کیا ہمارے علاوہ کہیں کوئی موجود نہیں

......

مجھے بھی اہلِ جہاں بھول جائیں گے شہزاد
کسے خیال ہے ڈوبے ہوئے ستاروں کا

......

گزر ہی جائے گا روزِ فراق بھی آخر
کسی طرح شبِ امید تو ٹھکانے لگی

......

یار ہوتے تو مجھے منہ پہ برا کہہ دیتے
بزم میں میرا گلہ سب نے کیا میرے بعد

......

اے برق کی مانند گزرتے ہوئے لمحو
کیا آنکھ جھپکنے کی بھی مہلت نہیں دو گے

......

فلسفہ و شعر کی اور حقیقت ہے کیا
حرفِ تمنا جسے کہہ نہ سکیں رو برو

......

خانہ خراب عشق سے بڑھ کر کوئی نہیں
سب چور میرے دل میں ہیں باہر کوئی نہیں

......

یہ روز و شب ہمیں اعزاز پہ اعزاز دیتے ہیں
مگر احساسِ ذلت میں کمی ہونے نہیں دیتے

......

رنگِ دل سے کوئی بادل نہیں اگتا، نہ اگے
اس زمیں میں کوئی ذرہ ہی نیا پیدا کر

اک نئے آدمی کی صورت میں
اپنی مٹی سے اٹھ رہا ہوں میں

......

نظر کے نور نے روشن کیا تھا سینے کو
اب اہلِ درد ترستے ہیں اس قرینے کو

......

بکھرے ہوئے ستاروں سے مری رات بھری ہے
یہ نور ہے یا نور کی دریوزہ گری ہے

......

دیکھ کر مہرِ درخشاں جو ہوئیں بند آنکھیں
روشنی نے مرے سینے میں اترنا چاہا

......

یہ جو جلتا نظر آتا ہے وہ گھر میرا ہے
اے خدا تیرے ہر اک شہر میں شر میرا ہے

......

دونوں عالم کی خبر رکھتی ہے مجھ کو شہزاد
یعنی ہر سمت بکھرنے کا ہنر میرا ہے

......

ڈوب رہا ہوں میں اپنی ہی تنہائی میں
کئی جگہ تو صحرا بھی گہرا ہوتا ہے

......

بلا کو شور ہے خالی مکاں کے اندر بھی
کوئی تو رہتا ہے اس آسماں کے اندر بھی

......

جس قدر ہیں آوازیں نقش بنتی جاتی ہیں
جنگلوں سے بڑھ کر ہیں شہر بے نوا میرے

......

آج تک اس کی محبت کا نشہ طاری ہے
پھول باقی نہیں خوشبو کا سفر جاری ہے

ہم کیا ہے اگر خاک بسر پھرتے ہیں شہزاد
دریا بھی تو مٹی کے قدم چوم رہا ہے

یا میری زندگی میں اجالا کرے کوئی
یا پھینک دے کہیں یہ ستارے اتار کے

میں اسے پیاس کہوں، آس کہوں، موت کہوں
ایک لذت جو مرا پورا بدن چاہتا ہے

پتھر نہ پھینک دیکھ ذرا احتیاط کر
ہے سطحِ آب پر کوئی چہرہ بنا ہوا

مثالِ موج تڑپنا تھا خوار ہونا تھا
نہ ڈوبنا تھا نہ دریا کے پار ہونا تھا

نور برسا پھول سے اور خون ٹپکا سنگ سے
اہتمامِ فصلِ گل ہے اپنے اپنے رنگ سے

ممکن ہو آپ سے تو بھلا دیجئے مجھے
پتھر پہ ہوں لکیر مٹا دیجئے مجھے

اک لمبی رات میں نے تری فرقت میں گزاری ہے
پھر اس کے بعد مجھ کو موت سے ڈر ہی نہیں آیا

کبھی پھولوں کبھی تاروں میں نظر آتی ہے
میری منزل ہی مجھے راہ سے بھٹکاتی ہے

جہاں پہ دنیا رکی ہوئی تھی رکی ہوئی ہے
عجب سماں ہے کہاں گئے روز و شب ہمارے

مجھے خبر ہے کہ اتنا گنہگار ہوں میں
وہ پھر سے خلق کرے گا مجھے منا کر بھی

وہ بے نیاز اگر ہو گیا تو کیا ہوگا
جو قہر ڈھاتا ہے شہزاد مسکرا کر بھی

عجب چمک سی مرے آنسوؤں میں رہتی ہے
چراغ تیرتے ہیں پانیوں کے اوپر بھی

آگ سے پھول چنوں ریت سے گوہر لاؤں
لا تو سکتا ہوں مگر کس کے لیے پر لاؤں

لذت اور یکتائی کا اک جھونکا آیا، بیت گیا
پھر سے اپنے اپنے دکھ ہیں، اپنی اپنی ذاتیں ہیں

کیا محبت کا تقاضا ہے نہ سمجھا تو بھی
میں بھی دنیا میں اکیلا، تنہا تو بھی

زمینِ آرزو میں جب ذرا سا زلزلہ آیا
دلِ دیوانہ سارے شہر کا چکر لگا آیا

جلوۂ حسن سے محروم نہیں ہیں آنکھیں
نظر آجاتے ہیں اس دشت میں آہو کیا کیا

نظر کے نور نے روشن کیا تھا سینے کو
اب اہلِ درد ترستے ہیں اس دفینے کو

اب جن کے اجالوں میں چمکتے ہیں اندھیرے
وہ صبح کے تارے مری آنکھوں میں جڑے تھے

رات کا جسم ہے تاروں کی حدوں کے اندر
باہر اک نور ہے اک عالمِ تنہائی ہے

آسمانوں پر لکیریں پھیر دے گی تیرگی
روشنی سورج کی آنکھوں سے چرائی جائے گی

کس آنکھ نے رکھا ہے قدم دل کی زمیں پر
مہتاب دکھتے ہیں نشان کفِ پا میں

......

گفتگو زرد ستاروں سے ہوئی آخرِ شب
بجھ گئی رات تو سینہ ہوا روشن میرا

......

منتظر دشت دل و جاں ہے کہ آ ہو آئے
سارے منظر ہی بدل جائیں اگر تو آئے

......

بے ہنر ہاتھ چمکنے لگا سورج کی طرح
آج ہم کس سے ملے آج کسے چھو آئے

......

اچھا ہے نہ دیکھیں گے نہ محسوس کریں گے
آنکھیں نہ رہیں گی تو تماشا نہ رہے گا

......

ہر پل میں لاکھوں تصویریں، ہر لحہ اک دنیا
کتنے عالم کھو دیتا ہے آنکھ جھپکنے والا

......

اے برق کی مانند گزرتے ہوئے لمحو
کیا آنکھ جھپکنے کی بھی مہلت نہیں دو گے

......

اب ترا ذکر کروں بھی تو حوالہ کیا دوں
اے گئی عمر ترا نام نہ پوچھا میں نے

......

خانہ خراب عشق سے بڑھ کر کوئی نہیں
سب چور میرے دل میں ہیں، باہر کوئی نہیں

......

مجھے لگتا ہے سفر اب نہیں ہو پائے گا
یہ تھکن اب تیرے پیروں میں حنا چاہتی ہے

......

کیا ضروری ہے کہ مجرم کوئی ثابت ہو جائے
میرے منصف کا سزا دینے کو جی چاہتا ہے

......

اتنی تاریک تھی شب، میں بھی نہ یہ جان سکا
اپنے نیزے پہ یہ رکھا ہوا سر میرا ہے

اس تھکی ہاری ہوئی رات کو سو لینے دو
ذرا ٹھہرو کہ ابھی صبح ہوا چاہتی ہے

......

پہلے کچھ منظر کیے تخلیق ہم نے اور پھر
تار تار ان منظروں کا تانا بانا کر دیا

......

دیکھیے سورج کی آنکھوں میں نہ آنکھیں ڈال کر
اک کرن بھیجے گا بینائی چرا لے جائے گا

......

پاس ہی منزلِ مراد خاک میں تھی چھپی ہوئی
راہ میں پا بریدہ لوگ بیٹھ چکے تھے ہار کر

......

گل گیا پانی میں مٹی کی طرح چاند کا عکس
گدلے دریا کا عجب شعبدہ دیکھا میں نے

......

یہ جہانِ رنگ و بو تو خواب اندر خواب ہے
جاگنے والوں کو بھی شاید جگا دینا پڑے

......

وسعتِ ذات چاہیے، غم سے نجات چاہیے
اپنی طلب کو کیا کروں، اس کی رضا ہی اور ہے

......

دشت میں راہ سے بھٹکا ہوا راہی میں ہوں
جو ابھی تک نہیں نکلا وہ ستارا تو ہے

......

اپنی پرچھائیں سے خوف آنے لگے تو دوستو
سائے کے پیچھے بھی اک سایا لگا دینا پڑے

......

لب اظہار تک آئی تھی تمنا اُس وقت
جب مرے دل کی طرح ٹوٹ چکا تھا تو بھی

......

ہماری آنکھ پھر سے آنسوؤں میں ڈوبی جاتی ہے
یہ وہ مچھلی نہیں جسے تڑپنے میں مزا آیا

....

....

......

محبت کی نفسیات کا ماہر غزل گو

احمد ندیم قاسمی

یوں تو ہماری غزل کا بنیادی موضوع ہی محبت اور اس سے وابستہ احساسات وجذبات کا فنکارانہ اظہار رہا ہے مگر شہزاد احمد اردو کا پہلا غزل گو ہے جس نے غزل کے اس بنیادی موضوع کو تجربے کے علاوہ علم کی سطح پر بھی برتا ہے اور یوں وہ محبت کی نفسیات کا ماہر غزل گو تسلیم کیا گیا ہے۔ محبت کے موضوع کو علم کی سطح پر برتنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ شہزاد احمد کی غزل علمی ثقاہت اور یبوست کی شکار ہو گئی ہے۔ میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جب شہزاد اس موضوع کو اپنی غزل میں کھپاتا ہے تو وہ نہ صرف اپنے تجربے اور مشاہدے سے بھرپور فائدہ اٹھاتا ہے بلکہ علم نفسیات کے جدید انکشافات سے بھی مسلح ہوتا ہے اور یوں اس کی غزل دیگر غزل گو شعراء سے مختلف اور منفرد ہو جاتی ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ اتنی چاق وچوبند اور تیکھی اور گہری غزل کے لیے شہزاد احمد جو زبان استعمال کرتا ہے وہ اتنی سادہ اور سلیس ہوتی ہے کہ کسی ایک مصرعے سے بھی یہ گمان نہیں ہوتا کہ اس نے بہت جان جوکھوں سے الفاظ کی ترتیب مکمل کی ہو گی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس نے جو کچھ کہا ہے انتہائی بے ساختگی سے کہا ہے اور صرف اس وقت کہا ہے جب شعر کہنے کے سوا اس کے لیے کوئی چارہ ہی نہیں تھا۔ کسی مقام پر شہزاد سے اپنے وسیع تجرباتی اور علمی پس منظر کی قربت سرزد نہیں ہوتی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس دور میں شہزاد کی غزل سے زیادہ سادہ غزل اور اس سادگی کے باوجود نہایت پرکار غزل شاید ہی کسی نے کہی ہو۔

غزل میں اپنا ایک اسلوب پیدا کرنے کے بعد اب گزشتہ کچھ عرصے سے شہزاد کی غزل میں ایک تبدیلی رونما ہوئی ہے۔ اسے شاید تبدیلی نہیں کہنا چاہیے کیونکہ تبدیلی کے ساتھ ترمیم کا تصور وابستہ ہے اور شہزاد کو اپنے موضوع میں کوئی ترمیم گوارا نہیں ہے اور شاید اسے اس طرح کی ترمیم کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ چنانچہ اسے شہزاد کے منفرد اسلوب میں اضافہ قرار دے لیجیے کہ اب وہ غزل میں فرد اور ذات کی نفسیات کے ساتھ ہی پورے معاشرے کی نفسیات کو بھی سمونے لگا ہے اور اس کے سے خالص غزل گو کے موضوع میں یہ اضافہ کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے۔ بحیثیت فن کار شہزاد کا ایک موضوع سے دوسرے موضوع تک مربوط سفر میری نظر میں ارتقائی سفر ہے۔ وہ فن کار ہی کیا جو ساری زندگی اپنے آپ ہی سے لڑتے جھگڑتے گزار دے اور بالواسطہ طور پر اپنی ذات سے باہر کی دنیا کی نفی کر دے۔ اپنے آپ سے پنجہ آزما ہونا بھی ایک حقیقت ہے اور اس کا اظہار کفر نہیں ہے لیکن جب شاعر اپنے معاشرے اور اپنے عصر کے پس منظر میں اپنی ذات کے تجزیاتی مطالعے پر قدرت حاصل کر لے تو اس کا مطلب ہوتا ہے کہ اس نے اپنی ذات سے بھی بڑی حقیقت کا اثبات کیا ہے اور شہزاد احمد ان دنوں اسی اثبات کے سفر میں ہے۔

شہزاد احمد اب نظمیں بھی کہنے لگا ہے۔ مجھے یہ نظمیں اس کی غزل کے ایک ایک شعر کی شعری تشریحات محسوس ہوتی ہیں کہ ان میں غزل کا سا حسن اور بے ساختگی ہے۔ نظم کے سلسلے میں مشکل یہ ہے کہ اس کے لیے خیال و احساس کی ایک جامعیت ـــــ ایک مرکزیت ضروری ہوتی ہے اسی لئے تو جس طرح ضروری نہیں کہ کامیاب نظم نگار اچھی غزل کہنے پر قادر ہو (مثلاً ن م راشد) اسی طرح یہ بھی ضروری نہیں کہ کامیاب غزل گو اچھی نظم تخلیق کرنے پر بھی قدرت رکھتا ہو (مثلاً فراق گورکھپوری) مگر غزل گو شہزاد احمد نے اپنی تخلیقی ہمہ گیری سے اس مفروضے کو غلط ثابت کر دیا ہے۔ اس کی نظمیں جہاں انسانی نفسیات کی بوقلمونی سے آراستہ ہیں وہیں ان کا فنی معیار بھی شہزاد کی غزل کی طرح صاف ستھرا اور بلند ہے۔

شہزاد احمد نے غزل اور نظم کے علاوہ علم نفسیات پر بھی کتابیں لکھی ہیں اور بعض غیر معمولی کتابوں کے ترجمے بھی کیے ہیں اور نفسیات اور فلسفے کے ساتھ ساتھ سائنسی موضوعات پر بھی بہت محنت اور کاوش سے لکھا ہے۔

غرض شہزاد احمد اردو ادب کی ایک ہمہ گیر اور ہمہ صفت اور سرمایۂ افتخار شخصیت ہے۔

شہزاد احمد کی شاعری

انتظار حسین
(لاہور)

شہزاد احمد نے شاعری کی وادی میں ایک ایسے وقت قدم رکھا تھا جب اردو غزل ایک نئی کروٹ لے رہی تھی۔ یہ نئی کروٹ اس بڑی انسانی واردات کی دین تھی جس سے غزل ابھی ابھی آشنا ہوئی تھی۔ اس نازک وقت میں کچھ بڑے واقعات رونما ہوئے۔ بڑے پیمانے پر ہندو مسلم فسادات، بستیوں کا اجڑنا، بہت بڑی خلقت کا گھر سے بے گھر ہونا، اجڑی ہوئی خلقت کا اپنے گھروں سے نکلنا اور نئے ملک کا رخ کرنا۔ یہ واقعات کتنے دکھ کتنی اذیتیں، کتنی تکلیفیں اپنے ساتھ لائے۔ ایسے دکھ اور تکلیفیں جو لگتا تھا کہ پہلی مرتبہ ہم ان سے آشنا ہوئے ہیں۔ اردو غزل نے اس سارے تجربے کو سمیٹا اور اپنے اندر جذب کر لیا۔ یہاں سے اس میں ایک نئے طرز احساس نے جنم لیا۔ سب سے بڑھ کر ان شاعروں نے اس طرز احساس کو اپنایا جنھوں نے اسی ہنگامی شاعری کی دنیا میں آنکھ کھولی تھی۔ ان کی آواز ان کا لہجہ ان کا سارا اسلوب بزرگ غزل گویوں سے بالکل مختلف تھا۔ اسی زمانے میں شہزاد کی غزلیں شائع ہونا شروع ہوئیں اور اسی نئے طرز احساس کی نمائندگی کرتی نظر آئیں۔

یہ نیا طرز احساس تو اس پوری نسل کا تھا۔ مگر شہزاد کے چند انفرادی اوصاف تھے جن کی وجہ سے اس کی غزل اپنے ہم عصروں سے الگ پہچانی گئی۔ اردو شاعری کی روایت اور بالخصوص غزل کی روایت سے آشنائی اگر شروع شاعری میں ہو گئی تھی تو اس کی وجہ امرتسر کا وہ ادبی ماحول تھا جس میں شہزاد نے ہوش سنبھالا تھا۔ اس فضا میں ہوش سنبھالتے ہی داغ، امیر جلالی، فانی اور اصغر جیسے شاعروں کو پڑھا اور سیف الدین سیف کی نظمیں دیکھیں۔ پھر جب لاہور آ کر گورنمنٹ کالج میں قدم رکھا تو فلسفہ اور نفسیات نے دامن پکڑ لیا اور ایسا دامن پکڑا کہ پھر جیسا شاعری سے رشتہ ویسا فلسفہ اور نفسیات سے رشتہ۔ پھر سائنسی علوم بھی اس شوق کا حصہ بن گئے اور اب شہزاد احمد کا کہنا ہے کہ "آج کل شاعری اور سائنس کا مطالعہ میرے دو محبوب کام ہیں۔ جب میں پریشان ہوتا ہوں یا ڈپریشن کا شکار ہوتا ہوں تو فزکس پڑھتا ہوں۔ اسے پڑھتے ہوئے مجھے ویسا ہی لطف آتا ہے جیسا اچھی شاعری پڑھنے سے آ سکتا ہے۔"

شہزاد کا کہنا ہے کہ "میں کبھی طبیعات پر کوئی کتاب لکھوں۔" واضح رہے کہ شہزاد اس سے پہلے جدید نفسیات کے مضمون کو نیا پرلا کر چکے ہیں۔ پہلے فرائڈ کے حوالے سے پھر یونگ کے حوالے سے کتابیں لکھیں۔

جس شاعر کا فلسفہ، نفسیات اور سائنسی علوم سے اتنا شغف ہو پھر اس کی شاعری ان اثرات سے بے نیاز تو نہیں رہ سکتی۔ پھر ایسا شاعر داغ اور امیر جلالی پر تو قناعت نہیں کر سکتا تھا۔ اس کی غزل تو افکار و تصورات سے آنکھ مچولی کھیل رہی تھی۔ شہزاد کے اپنے بیان کے مطابق اس ضمن میں دو شاعر اس کے رہنما بنے، یگانہ اور اقبال۔ یہاں سے شہزاد کو سراغ ملا کہ افکار و تصورات غزل میں کس طرح سموئے جاتے ہیں۔ اس طرح بہت جلدی شہزاد کی غزل نے اپنے ہم عصروں کی غزلوں سے الگ اپنی ایک شناخت پیدا کر لی۔

اس کے ساتھ شہزاد کی غزل نے ایک کروٹ اور لی۔ نئے زمانے کے افکار و تصورات اپنی جگہ پر مگر نئے زمانے کی زندگی و واقعیت کی سطح پر غزل میں کس طرح سموئی جا سکتی ہے۔ شہزاد نے یہ کام بھی کر دکھایا اور ایسے شعر لکھے۔

دو دن بھی کھل کے بات نہ شہزاد ہو سکی
دو سال ایک ساتھ رہے ہم کلاس میں

دس بجے رات کو سو جاتے ہیں خبریں سن کر
آنکھ کھلتی ہے تو اخبار طلب کرتے ہیں

نکل آیا ہے سورج اور مری آنکھیں نہیں کھلتیں
میں ڈرتا ہوں نہ جانے آج کا اخبار کیا ہوگا

یہ گویا نئے زمانے کی زندگی سے واقعیت کی سطح پر رشتہ پیدا کرنے کی کوشش ہے۔ مگر جسے تغزل کہتے ہیں اور جو غزل کے خمیر میں شامل ہے وہ تو اس قسم کی واقعیت پسندی کی اجازت نہیں دیتا۔ شہزاد نے بھی غزل کی روایت سے اس کام کے لیے اجازت حاصل نہیں کی۔ اس روایت سے بغاوت کی اور وہ غزل لکھنے کی کوشش کی جسے غیر متغزلانہ غزل کہنا چاہیے۔

مگر شہزاد کی غزل کا صرف ایک رنگ ہے۔ یوں سمجھئے کہ شاعر نے سوچا کہ نئی زندگی کی واقعیت کو بھی برت کر دیکھا جائے کہ غزل اسے کس طرح قبول اور ہضم کرتی ہے۔ مگر شاعر کا زیادہ شغف نئے زمانے کی فکر سے ہے۔ تو اس کی غزل نے نئے زمانے کے واقعات و حالات سے زیادہ نئے زمانے کے افکار و خیالات سے زیادہ غرض رکھی ہے۔

میں ابھی شہزاد کے بارے میں صرف شاعر کے طور پر بات کر رہا تھا۔ مگر وہ صرف شاعر تو نہیں ہے۔ اس کے اندر جو ایک مفکر بیٹھا ہے وہ صرف شعر کے پردے میں اپنے اظہار پر قانع نہیں ہے۔ براہ راست بھی اپنا اعلان کرتا ہے۔ تو شہزاد کے صرف شعری مجموعے شائع نہیں ہوئے ہیں بلکہ وہ تصانیف بھی

ہیں جہاں علوم حاضرہ سے بحث کی گئی ہے۔فرائڈ اور یونگ اس کے خصوصی موضوعات رہے ہیں۔پھر علمی کتابوں کے ترجمے بھی کیے ہیں۔

یوں شہزاد احمد ہماری ادبی دنیا میں ایک منفرد شخصیت ہے جس کی ذات میں شاعر اور مفکر گلے ملتے نظر آتے ہیں۔اس صورت حال نے یوں تو اس کی شاعری کو شروع ہی سے متاثر کیا تھا مگر اب آ کر اس نے ایک نئی شکل نکالی ہے۔بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ فلسفیانہ سطح پر غور و فکر نے رفتہ رفتہ اس کے تخلیقی تجربے ہی کو بدل ڈالا۔اب یہ تخلیقی تجربہ اس نوعیت کا ہے کہ غزل کی فارم کو اپنے اظہار کے لیے کافی نہیں سمجھتا ہے۔اب یہ تجربہ کوئی نیا اظہار مانگتا ہے۔تو نیا مجموعہ''معلوم سے آگے''غزلوں کا مجموعہ نہیں ہے نثری نظموں کا مجموعہ ہے۔

اس مجموعہ کو پڑھتے ہوئے احساس ہوتا ہے کہ ہم غزل کو شہزاد سے مختلف ایک شہزاد سے مل رہے ہیں۔اور لگتا ہے کہ ہم کسی نئے تجربے سے دوچار ہیں۔جیسے کوئی متجسس روح ہے جو اضطراب بھرے کائناتی نوعیت کے سوالوں سے دوچار ہے:

کیا انسان اس کائنات میں بالکل تنہا ہے
کیا ہمارے علاوہ کہیں کوئی موجود نہیں

یا اس قسم کے سوال

ممکن ہے ہم بیک وقت
بہت سی کائناتوں میں رہتے ہوں
اور ہمیں پیدا کرنے والے بھی بہت سے ہوں
جو یہ نہ جانتے ہوں
کہ کس نے کیا پیدا کیا ہے
کیوں پیدا کیا ہے

اور یہ کہ

کوئی ایسی کائنات
جس میں سب چیزیں
(اپنی نوعیت میں)
ایک دوسرے سے مختلف ہوں
ایک ہی کائنات کیسے ہو سکتی ہے
اور انہیں پیدا کرنے والا
واحد کس طرح ہو سکتا ہے

یہ سوالات ایسے اضطراب کا پتہ دیتے ہیں جس کی نوعیت مابعد الطبیعاتی اور کائناتی ہے۔اب وہ عشق کی دنیا نہیں ہے جس کا اظہار غزل میں ہوتا چلا آیا ہے۔یہ دنیا ہی دوسری ہے جہاں ایک متجسس اور مضطرب روح بھٹکتی نظر آتی ہے۔

ڈاکٹر یونس جاوید کی دو اہم کتابیں

ڈاکٹر یونس جاوید ہمارے دور کے نامور اور نابغہ فکشن نگاروں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ڈاکٹر صاحب کے قلم کی کاٹ اور دھار اُن کے مطالعے، مشاہدے اور تجربات کے باعث اس طرح بھر پور طور پر کہانی، کردار اور الفاظ کو بیان کرتی ہے کہ سب کچھ ہمیں اپنی آنکھوں کے سامنے ہوتا دکھائی دیتا ہے اور یہ سب کچھ کرنے والے ہمارے لیے مانوس بھی ہوتے ہیں اور جانے پہچانے بھی جن سے ہمارا قدم قدم پر سابقہ پڑتا ہے۔

ایک چہرہ یہ بھی ہے

(خاکے)

امتیاز علی تاج، پروفیسر حمید احمد خان، احمد بشیر، سلیم شاہد، ثریا بجی، یونس ادیب، عطاالحق قاسمی، طلعت پرویز بھٹی، کمال احمد رضوی، اے جی جوش، کنول فیروز، ماں جی اور پاکستان۔

میں ایک زندہ عورت ہوں

(افسانے)

''یونس جاوید گزشتہ نسل کا واحد حقیقت پسند افسانہ نگار ہے جس کے افسانے زمانے کی دستبرد سے محفوظ ہیں۔اس لئے کہ اس کے افسانے معاصر زندگی کے پیچ در پیچ تضاد سے اپنا آب و دانہ حاصل کرتے ہیں۔اس کے افسانے انسان اور اس کی دنیا کو کسی آدرش کے سپرد نہیں کرتے بلکہ انسان کی تشریح اس نظامِ زیست کے حوالے سے کرتے ہیں جو اسے جینے کا بہت کم موقع دیتا ہے''۔۔۔۔۔

ڈاکٹر انیس ناگی

دستیاب: دوست پبلی کیشنز، 8-A، خیابان سہروردی، پوسٹ بکس نمبر 2958، اسلام آباد

لامتناہیت کا لمس

وزیر آغا
(لاہور)

ہمارے بیشتر شعراء سوچتے کم اور محسوس زیادہ کرتے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ ان کے کسی ''خیال'' کی اڑان ''جذبے'' کی کشش ثقل سے مات کھا جاتی ہے۔ خیال ــــ خوشبو کی طرح سبک اور ہوا کی طرح متحرک ہوتا ہے۔ وہ عمودی اور افقی' دونوں جہات میں پھیلتا ہے۔ رشتوں میں خود کو منکشف اور اڑان میں خود کو بے پایاں کرتا ہے۔ خواہش کی فوری تسکین کے عمل کو ملتوی کرتے رہنا خیال کا امتیازی وصف ہے۔ جب کہ جذبہ ایک بھاری اور وزنی شے ہے جو فوری تسکین کی طالب ہے۔ اس کا انداز مائل بہ مرکز یعنی Centripetal ہے نہ کہ خیال کی طرح مرکز گریز یعنی Centrifugal ــــ وہ شعراء جن پر جذبہ غالب ہوتا ہے اپنے بیشتر لمحات میں چوما چاٹی کی شاعری کرتے ہیں اور بہترین لمحات میں نیم سیاسی نیم سماجی شاعری جو اخبار کی سرخیوں سے اپنے لیے مواد کشید کرتی ہے۔ تاہم یہ شعراء عصری واقعات و سانحات کو بھی ایک جذباتی خروش کے ساتھ اپنی مخصوص آئیڈیالوجی کے زاویے سے پڑھتے ہیں اور بعض اوقات پہلودار ابلاغی رویہ بھی اختیار کر لیتے ہیں۔

اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ شاعری جذبے سے منقطع ہو کر محض ''خیال'' کی اڑان کا منظر دکھاتی ہے۔ جذبہ تو اس ایندھن کی طرح ہے جو راکٹ کو اڑانے کے لیے استعمال ہوتا ہے مگر راکٹ جب اس ایندھن کو خرچ کر کے اپنے مدار میں جا پہنچتا ہے تو ایندھن کا دست نگر نہیں رہتا۔ گو اس کی مہیا کردہ Thrust ہر وقت اس کے ساتھ ہوتی ہے۔ لہذا بڑی شاعری نہ تو جذبے کی Thrust کو منہا کرنے سے وجود میں آتی ہے اور نہ ''خیال'' سے بے تعلق رہ کر۔ بڑی شاعری ان دونوں کا آمیزہ ہے۔

اس طولانی تمہید کا مقصد محض اس بات پر زور دینا ہے کہ شاعر وہی اچھا ہے جو اپنی ہر بند شخصیت میں روزن بنا کر خود کو لامتناہیت کے لمس سے آشنا کرتا ہے۔ یعنی جو شخصیت کو منہدم کرنے کی بجائے اسے بصارت اور بصیرت سے آشنا کرتا ہے۔ اس بات کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے مطالعے کے دائرے کو کشادہ کرے۔ بالخصوص ایسے علوم کا مطالعہ کرے جو اسے کائنات اکبر اور کائنات اصغر دونوں کے اندر ذرہ ذرہ تک جانے کا موقع فراہم کر دیتا کہ اس کا وژن وسیع ہو۔

شبیر احمد اردو کے ان معدودے چند شعراء میں سے ہیں جنہیں مسلسل مطالعہ نے معاصرین کے مقابلے میں کہیں بڑے تناظر میں اپنے تخلیقی ٹچ کی کارکردگی دکھانے کا موقع عطا کیا ہے۔ وہ ابتداً نفسیات کے طالب علم تھے اور نفسیات سے ان کا شغف آج بھی موجود ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے جو کتابیں لکھی ہیں وہ اس بات کا ثبوت ہیں کہ شبیر احمد کائنات اصغر کی کنہ میں جھانکنے پر ہمیشہ سے مائل رہے ہیں۔ نفسیات کے حوالے سے انسانی دماغ ہی کائنات اصغر ہے جس میں شعور' تحت الشعور اور لاشعور تہہ در تہہ موجود ہوتے ہیں۔ شبیر احمد نے اس کائنات اصغر کا خوب مطالعہ کیا ہے جس کے گہرے اثرات ان کے کلام پر مرتسم ہوئے ہیں۔ مگر شبیر احمد نے محض ''اندر'' تک ہی خود کو محدود نہیں رکھا۔ وہ ''باہر'' کے تہہ در تہہ عالم سے بھی آشنا ہوئے ہیں۔ اس ضمن میں انہوں نے کاسمولوجی Cosmology کے ایک اچھے طالب علم کی حیثیت میں جب بصیرت کے ساتھ ''کائنات اکبر'' کا مطالعہ کیا ہے وہ بے حد قابل تعریف ہے۔ کاسمولوجی کا مطالعہ انسان کو بیک وقت حقیر ہونے کا احساس دلاتا ہے اور بڑا ہونے کا بھی! حقیر ہونے کا یوں کہ وہ خود کو ان گنت کہکشاؤں میں سے محض ایک کہکشاں کے ایک گمنام گوشے میں موجود ایک غیر اہم ستارے کے گرد گھومنے والے سیاروں میں سے ایک چھوٹے سے سیارے کی ایک ننھی مخلوق کی صورت میں دیکھتا ہے جو مکانی اعتبار سے موہوم ہے۔ جب کہ کائناتی وقت کے حوالے سے دیکھیں تو اس کو وجود میں آئے محض چند لمحے ہی ہوئے ہیں اور شاید اگلے ہی چند لمحوں میں اس کی عمر طبعی اپنے انجام کو پہنچ جائے گی۔ تاہم ساتھ ہی کائنات کا مطالعہ انسان کو بڑا ہونے کا احساس بھی بخشتا ہے کہ کس طرح ایک ذرہ موہوم نے پوری کائنات کو اپنی مٹھی میں بھر لیا ہے۔ پرانے زمانے میں صوفیا اور ویدانتی جزو اور کل میں فرق نہیں کرتے تھے۔ اب طبیعیات نے بھی ان کی بات کو قبول کر لیا ہے۔ اب وہ بھی یہ کہنے لگی ہے کہ ہر پارٹیکل کائنات کے جملہ پارٹیکلز پر محیط ہوتا ہے۔ شبیر احمد کو نفسیات اور کاسمولوجی' دونوں علوم نے بے حد فائدہ پہنچایا ہے۔ اپنی شاعری میں ایک طرف تو وہ ''جزو'' کے اعماق میں اترے ہیں اور دوسری طرف ''کل'' کے اعماق میں۔ مگر وہ یہ دیکھ کر حیران ہوئے ہیں کہ ان دونوں یاتراؤں میں وہ ایک ہی بڑی منزل کی طرف گامزن تھے۔ انکشاف سے ان کے وژن میں جو وسعت آئی ہے اس کا گہرا اثر ان کی شاعری پر پڑا ہے۔ بالخصوص غزل میں انہوں نے جس وژن کی موجودگی کا احساس دلایا ہے وہ شاید ہی ہمارے آج کے غزل گو شعراء میں سے کسی کو نصیب ہوا ہو۔

واضح رہے کہ ''مطالعہ'' شاعری کے باب میں مفید بھی ہوتا ہے اور ضرر رساں بھی ــــ ضرر رساں اس اعتبار سے کہ بعض شعراء اپنے ''مطالعہ'' کو

اپنے اشعار پر اس طور لاد دیتے ہیں جیسے اشعار، اشعار نہ ہوں بار برداری کے جانور ہوں۔ چنانچہ قیامت کی نظر رکھنے والوں کو فی الفور معلوم ہو جاتا ہے کہ مطالعہ ہضم نہیں ہوا۔ دوسری طرف "مطالعہ" اس اعتبار سے کارآمد ہے کہ ایک اچھا شاعر مطالعہ کو اپنا جزوِ بدن بناتا ہے۔ مراد یہ کہ مطالعہ اس کے لہو میں جذب ہو جاتا ہے اور اس کے وژن کو کشادہ کرنے کا موجب بنتا ہے۔ شہزاد احمد کی غزل میں ان کا مطالعہ پوری طرح جذب ہو چکا ہے۔ نظم نگاری کی طرف وہ ذرا دیر سے آئے ہیں مگر ان کی نظم میں بھی ایک ایسی لرزش خفی صاف محسوس ہوتی ہے جو مطالعہ کے لہو ہی سے پھوٹتی ہے۔

پچھلے چند سو برس کی اردو شاعری کا جائزہ لیں تو ہمیں دو طرح کے شاعر نظر آتے ہیں۔ ایک قسم ان شعرا کی ہے جو یا تو مطالعہ کی طرف راغب ہی نہ ہو سکے یا جنہوں نے اپنے کلام میں "مطالعہ" کی نمائش کی۔ دوسری قسم ان شعراء کی جن کا نہ صرف مطالعہ ہمہ جہت تھا بلکہ جنہوں نے اس مطالعہ کو اپنی ذات میں جذب بھی کیا۔ میر، غالب اور اقبال ـــ یہ تینوں بڑے شاعر نہ صرف کثیر المطالعہ لوگ تھے بلکہ مطالعہ کو جزوِ ذات بنانے پر قادر بھی تھے۔ لہٰذا وہ پوری اردو شاعری میں قطعاً منفرد اور یکتا نظر آتے ہیں۔ ان کے مقابلے میں جو شعراء تھے (میں نام نہیں لیتا) انہوں نے مطالعہ کی کمی اور وژن کے فقدان کو چھپانے کے لیے زبان کے جوہر کی اور وژن کے فقدان کو چھپانے کے لیے زبان کے جوہر دکھائے، علم عروض کی نمائش کی اور آخر میں کسی نہ کسی آئیڈیالوجی کو بیساکھی کے طور پر استعمال کیا اور اپنے تئیں اس خوش فہمی میں مبتلا ہوئے کہ انہوں نے شاعری کو معراجِ کمال پر پہنچا دیا ہے۔ بالخصوص بیسویں صدی میں سرخ آئیڈیالوجی نے آزاد مطالعہ کے راستے میں جس طرح بند باندھے اور شاعری کے آفاق کو محدود کیا، وہ ہمارے سامنے کی بات ہے۔ شہزاد احمد کو اس قسم کی شعبدہ بازی کی کبھی ضرورت نہیں پڑی۔

شہزاد احمد نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ کتاب پڑھنے میں گزارا ہے مگر پچھلے چند سالوں میں انہوں نے مشاہدۂ ارض کا بھی آغاز کر دیا ہے۔ آدھی سے زیادہ دنیا دیکھ چکے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ ان کے ہاں "مطالعہ" اور "مشاہدہ" یک جان ہوتے ہیں اور ایک ایسا ادیب سامنے آیا ہے جس کے ہاں فکری پختگی، تجربے کی پختگی سے مملو ہو کر ایک ایسی شعری بافت پر منتج ہوتی ہے جو ہر اعتبار سے منفرد ہے۔ ہر تخلیق کار زندگی بھر اپنی شعری آواز کو آوازوں کے شور میں پہچاننے اور اپنے "دستخط" کو لکیروں کے اژدہام سے الگ کر کے دیکھنے کی تمنا کرتا ہے مگر بہت کم ایسے تخلیق کار ہیں جو اس میں کامیاب ہو پاتے ہیں۔ شہزاد احمد ان چند شعراء میں سے ہیں جن کی زندگی کے دوران میں ان کی آواز پہچان لی گئی ہے اور "دستخط" دیکھ لئے گئے ہیں۔ یہ کوئی معمولی تخلیقی واقعہ نہیں ہے بلکہ غور سے دیکھیں تو یہ ایک کارنامہ ہے۔

عرشؔ صہبائی (جموں کشمیر)

اندر سے کچھ ٹوٹا ٹوٹا لگتا ہے
وہ سب میں رہ کر بھی تنہا لگتا ہے
میں اپنی ہی بات کو جھٹلا دیتا ہوں
میں خود سے برہم ہوں ایسا لگتا ہے
کچھ منظر آنسو لاتے ہیں آنکھوں میں
دل ٹوٹے تو اور بھی اچھا لگتا ہے
یہ بھی ہے کوئی سازش ان آنکھوں کی
جو ملتا ہے وہ اُس جیسا لگتا ہے
مجھ کو اپنی ہی آواز نہیں آتی
میلوں تک گہرا سناٹا لگتا ہے
وعدے کا پابند نہیں ہرگز لیکن
دیکھنے میں وہ کتنا اچھا لگتا ہے
اُس کے دل پہ گہری چوٹ لگی ہوگی
بُجھا بُجھا بکھرا بکھرا سا لگتا ہے
اب دل میں احساس کہاں تنہائی کا
ساتھ ہے میرے کوئی سایا لگتا ہے
اُس کے ذکر پہ آنکھیں بھری آتی ہیں
پُوچھتے ہیں سب وہ میرا کیا لگتا ہے
ڈھونڈنے پر بھی ملتا نہیں ہے اسکا نشاں
غم کوئی آسیب کا سایا لگتا ہے
دل میں تھا جذبات کا تیز بہاؤ کبھی
اب یہ عالم ٹھہرا ٹھہرا لگتا ہے
خون کے آنسو بھی پینے پڑ جاتے ہیں
جب ہونٹوں پہ ضبط کا پہرا لگتا ہے
دل کے زخم ہرے ہوتے ہیں ساون میں
اس موسم میں غم کا میلا لگتا ہے
یہی محبت کی معراج ہے شاید عرشؔ
جو کوئی ملتا ہے اپنا لگتا ہے

''ریت اور دھوپ کے درمیان''

محسن احسان (پشاور)

لوٹ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو

بات ساٹھ برس پہلے یعنی ۱۹۴۹ء کی ہے۔ میری اور احمد فراز کی دوستی کے آغاز کو لگ بھگ تین برس ہو چکے ہیں۔ صبح و شام اکٹھے گزر رہی ہے۔ شعرا کے دیوان ہیں شعروں پر بحث مباحثے ہو رہے ہیں مصرعے دیئے جاتے ہیں۔ غزلیں تخلیق کی جا رہی ہیں۔ پشاور کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک صبح و شام تک آوارہ گردی جاری ہے نشستوں اور مشاعروں میں شرکت کے لیے جا رہے ہیں۔ لوگ Inseparable Friends سے ہمیں یاد کرتے ہیں۔ اور دن رات میں اور رات دن میں ڈھل جاتے ہیں۔ فراز تیز طبیعت ہے فقرے کستا ہے خوبصورت شعر کہتا ہے اور انجمن آرائی اور بذلہ سنجی میں اپنا ایک انداز رکھتا ہے۔ میں کم گو خوفزدہ حفظِ مراتب کا خیال رکھنے والا ڈرپوک سا شخص۔ دوسروں کا لحاظ پاس ہر وقت مدنظر ـــــ فراز کالج کی طرف سے گجرات کالج کے ایک بین الکلیاتی مشاعرے سے ٹرافی جیت کر آتا ہے تو پشاور کے ادبی حلقوں میں اس کی گونج سنائی دینے لگتی ہے۔ اس نے بتایا لاہور سے شہزاد احمد شہزاد بھی شریک مشاعرہ تھا۔ کچھ دنوں بعد مجھے ایک خط دکھایا کہ وہ اسے ملنے پشاور آ رہا ہے۔ شہزاد سے ملاقات ہوئی تو اس کی گوری رنگت، ایرانی نما صورت، چمک دار آنکھیں، چھریرے بدن اور باتیں کرنے میں پھولوں سی مسکراہٹ نے مجھے متاثر کیا۔ وہ فراز کی توجہ کا مرکز تو تھا ہی میری توجہ کا مرکز بھی بن گیا۔ اور پھر میری اور فراز کی دوستی کے درمیان مجھے اس کا وجود کھلنے لگا۔ اور بالآخر اس کی قربت، دوستی اور شخصیت کے سحر نے میرے دل و دماغ سے رقابت اور حسد کے جذبے یکسر دھونا شروع کر دیا۔ اکثر فراز اور میں لاہور جاتے تو اس کے نسبت روڈ والے گھر میں ٹھہرتے جہاں اس کی امی محبت کے ساتھ وقت بے وقت کھانا کھلاتیں۔ اور اس کے بڑے بھائی نہایت شفقت اور محبت سے پیش آتے اور شہزاد کے دوستوں کا بہت احترام کرتے۔ اسی محلے میں ندیم صاحب، ہاجرہ مسرور اور خدیجہ بھی رہتی تھیں۔ ہم شہزاد کی ہمراہی میں ان کے ہاں چلے جاتے۔ یہ تینوں بہن بھائی اردو ادب کے افق پر چمک رہے تھے۔ سویرا اور نقوش کی ادارت نے ان کا سکہ مدیرانِ جرائد کی حیثیت سے بھی جما دیا تھا۔ پاک ٹی ہاؤس، وائی ایم سی اے، عرب ہوٹل، چائینیز یا برسٹل ہوٹل میں ادیبوں شاعروں سے ملاقاتیں کرتے۔ شہزاد نے اسی زمانے میں نفسیات اور فلسفے میں ایم اے کرنے کے بعد ڈنلپ سائیکل میں ملازمت اختیار کر لی تھی۔ اس کا دفتر لکشمی چوک میں بلڈنگ کی سب سے اوپر والی منزل میں تھا۔ وہ ڈاکٹر اجمل کی شخصیت، وسعت مطالعہ اور تبحر علمی سے بے حد متاثر تھا۔ اکثر بڑی عقیدت سے ان کا تذکرہ کرتا۔ اس نے بہت سے فلسفیوں کے علاوہ فرائیڈ اور ژونگ کا ناقدانہ مطالعہ کیا تھا۔ اور ان کے حوالے گفتگو میں دے کر ہماری نااہلی کو متاثر کرنے کی کوشش کرتا۔ لیکن ہم بھی قدم جمائے ڈٹے رہتے۔ وہ لاہور میں تھا جہاں علم و ادب، شعر و سخن، رسائل، ریڈیو، طباعت و اشاعت اور نامور شخصیات کا قرب اسے حاصل تھا۔ ہم پشاور میں، جہاں یہ سب چیزیں تقریباً مفقود تھیں اور جہاں کی ادبی محفلوں میں روایت و قدامت کے ساتھ ساتھ نئی فکری تحریک ننھی ننھی آنکھوں سے باہر کی روشنی دیکھ رہی تھی۔ شہزاد اپنی تازہ خیالی اور ندرت گوئی سے افقِ شعر پر صبح کے ستارے کی طرح نمودار ہوا اور اس نے دیکھتے ہی دیکھتے ایک مثالی باغبان کی طرح گلزارِ شعر و سخن میں تازہ اور دل آویز پھول کھلانے شروع کر دیئے۔ اس کا پہلا مجموعہ ''صدف'' چھپا تو اس کی پذیرائی ملک کے تمام ادبی حلقوں میں ہوئی۔ اس کی تمثیلی پیکر تراشی میں کربِ ذات کا اظہار منفرد اور یاسی علامتوں اور استعاروں میں ہونے لگا۔ مزاجِ عصر سے باخبری نے اس کی غزل کو شعور اور حسن بخشا۔ اس کے فن میں غمِ جاناں اور غمِ دنیا کے عکس گلے ملتے ہوئے اور ایک دوسرے میں گھلتے ہوئے محسوس ہونے لگے۔ تنہائی کا دکھ، آسودہ روح کی پکار اور ضبطِ گریہ کا پُر وقار سوز و گداز اس کے لب و لہجے میں عجیب حزن و طرب کی کیفیت پیدا کرتا اور وہ نئے شاعروں میں ایک معتبر نام اور مقام کا مالک بن گیا۔

اب یہ عالم ہے کہ گزری ہوئی برساتوں کی
اپنے ہی جسم سے بو آتی ہے سیلن کی

آئینے میں بھی نظر آتی ہے تیری صورت
کوئی مقصودِ نظر تیرے سوا کیسے ہو

لے تو جائے گی ہمیں تہہ تک صدف کی جستجو
کیا کریں گے ہم اگر پانی بہت گہرا ہوا

کل تھی یہ فکر اسے حال سنائیں کیسے
آج یہ سوچتے ہیں اس کو سنا کیوں آئے

کوئی چہرہ ترے قابل نہیں ہونے پاتا
تیرے آئینے میں ہر شکل بگڑ جاتی ہے

میں کیا ہوں کس جگہ ہوں مجھے کچھ خبر نہیں
ہیں آپ کتنی دور صدا دیجئے مجھے

ساری مخلوق تماشے کے لئے آئی تھی
کون تھا سیکھنے والا ہنر پروانہ

ریت اور دھوپ کے درمیاں دشت میں
ڈھونڈتا ہوں اماں بے اماں دشت میں

اس وقت شہزاد کی شاعری اور شہرت بہت سی منزلیں طے کر چکی تھی اور امکانات کا ایک وسیع میدان اس کے سامنے موجود تھا اور اس میں وہ قدم بہ قدم آگے بڑھتا رہا۔ شہزاد نے غزل میں اپنا ایک منفرد اور الگ اسلوب دریافت کر لیا تھا جس پر شہزاد کی مہر ثبت تھی۔ اس نے اہل ذوق کے ذہن و ضمیر پر اپنا ایک رنگ مسلط کر دیا تھا۔ اور یہ اس کی غزل کا معجزہ تھا۔

شہزاد کے ساتھ مجھے ہمسفری کا موقع بھی میسر آیا۔ اندرون ملک اور بیرون ملک کئی مقامات پر اکٹھے سفر کیا۔ انگلستان، امارات، سعودیہ، امریکہ، چین کے دوروں پر ہمارا ساتھ رہا۔ ایک ہمسفر کی حیثیت سے اس نے ذوق سیاحت اور لذت ہمسفری میں کبھی کمی نہیں آنے دی۔ اس کے مزاج کی شوخی اور طبیعت کے دھیمے پن نے سفر کو خوشگوار اور دل آویز بنائے رکھا۔ اس کے لطیفے، چٹکلے، جملے سفر میں شگفتگی اور تازگی بھر دیتے۔ چین کے دورے کے دوران عبداللہ ملک، احمد ندیم، سید اے حیدر، زاہدہ حنا، حاجی صاحب، اللہ فیضی اور انور قمر علی کا ساتھ تھا۔ یہ یادگار سفر یادگار زمانہ عبداللہ ملک کی قیادت میں کیا گیا۔ اور وہ دن مختلف شہروں میں ایسے گزرے جیسے دو پل گزر گئے ہوں۔ یہ ہم سب کی زندگیوں کے نہایت ہی پرلطف اور دل خوش کن لمحات تھے۔

شہزاد کو دوستوں اور عزیزوں کے ہاتھوں صدمے بھی پہنچے، جوان بیٹی کے بیوہ ہو جانے کا دکھ بھی دیکھا۔ اپنے دل کی بیماری کو کمال حوصلے کے ساتھ برداشت کیا۔ ملازمت ہونے اور نہ ہونے کے جاں گسل مراحل سے بھی گزرا۔ وسیلہ رزق نہ ہونے کی صورت میں انسان جس جانکنی سے گزرتا ہے شہزاد نے اسے بڑی پامردی اور استقامت سے سہہ لیا۔ لیکن اس نے اپنے معمولات میں فرق نہیں آنے دیا۔ وہ مطالعہ کرتا ہے اپنے ہم عصروں میں سب سے زیادہ کتابیں پڑھنے کا شوق رکھتا ہے اور جنسیات کے موضوع پر لکھتا ہے۔ فکر سخن کے لیے بھی وقت نکالتا ہے۔ دھڑلے سے مشاعرے پڑھتا ہے اور سامعین کو اپنے کلام سے موہ لیتا ہے۔ اس کی بزلہ سنجی، ظرافت اور گفتگو ادبی حلقوں میں موضوع گفتگو رہتی ہے۔

شہزاد کی شادی پر صادق نسیم کوئٹہ سے اور میں پشاور سے لاہور پہنچا۔ نسبت روڈ والے گھر میں احباب جمع تھے۔ فریدہ خانم غزل سرا تھیں۔ اور محفل جھوم جھوم کر اس کے فن کو سراہ رہی تھی۔ دوسرے دن برات چلی۔ لاہور کے بھی سر برآوردہ ادبا شعرا شریک تھے۔ صوفی تبسم اپنی متانت و بزرگی کے سبب سب کے لیے واجب الاحترام تھے۔ بھاٹی دروازے سے جب برات گزری تو صوفی صاحب نے ایک مکان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "اس میں میری ایک سنگی رہا کرتی تھی۔" ہم نے سنگی کے بارے میں مزید پوچھنا چاہا تو انہوں نے اپنی ٹھوڑی پر انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا "او سے منڈیو۔۔۔ بہتوں زیادہ نہ چھیڑو" پھر کچھ مضطر سے ہو گئے۔

شہزاد کی بیگم سے جب ملاقات ہوئی تو ہمیں یہ گمان بھی نہ تھا کہ ان دونوں کی شکلوں میں اتنی مماثلت ہوگی۔ دونوں کی رنگت، ناک نقشہ، دانت، مسکراہٹ اس قدر ملتی جلتی تھی کہ ہم عجیب غلط فہمی میں مبتلا رہے۔ یہ حسن اتفاق تھا ورنہ پہلے ہم نے زندگی میں ایسے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ہم نے شہزاد کو شہزاد اور بھابی کو شہزادی کہنا شروع کر دیا۔ وہ نہایت خوش مزاج، خوش اطوار، خوش سلیقہ اور خوش گفتار خاتون ہیں۔ ہماری تواضع بیٹھے بٹھائے لذیذ کھانوں سے کی جاتی ہے۔ جن دوستوں نے شہزاد کے ہاں کھانا کھایا ہے وہ یقیناً اس کے گواہ ہوں گے۔ شہزاد کی اولاد بھی اسی محبت و احترام سے ملتی ہے جو انہیں خاندان سے ورثے میں ملی ہے۔

شہزاد ایک قابل اعتماد دوست، مشفق شوہر، محبت کرنے والا باپ ہے اور خوبصورت شعر تخلیق کرنے والا شاعر ہے۔ اس کے چہرے پر علم اور محبت کی جوت ہے۔ اس کے بات کرنے کا انداز شگفتہ اور دلچسپ ہے۔ اس نے لکھنے کے فن کے ساتھ زندگی گزارنے کے فن سے بھی غفلت نہیں برتی۔ لکھنا اس کے لیے جاں کنی اور عرق ریزی نہیں بلکہ زندگی کو خوشگوار اور پرلطف انداز سے بسر کرنے کا ایک خوبصورت انداز ہے اور شاید اسی لئے وہ تخلیقی اور تحقیقی کام کے ساتھ ساتھ ہنستے اور قہقہے لگاتے ہوئے زندگی بسر کر رہا ہے۔

☆

چودھویں صدی عیسوی میں جب یورپ طاعون کی زد میں تھا اس زمانے میں یورپی ممالک کے اندر شاید ہی کوئی گھر بچا ہو جس سے موت کی خبریں نہ آتی ہوں۔ خوف زدگی کے اس عالم میں اٹلی کے شہر فلورنس کی سات نوجوان عورتیں اور تین نوجوان مرد طاعون کی وبا سے بچنے کے لیے شہر سے بھاگ کر پہاڑی علاقے میں پناہ حاصل کرتے ہیں۔ ویران اور سنسان علاقے میں ایک دوسرے کو کہانیاں سنا کر وقت گزارتے ہیں۔ مگر یہ کہانیاں یونہی نہیں سنائی جاتیں بلکہ ان کے دس نوجوان ہر روز اپنا ایک حکمران مقرر کرتے ہیں۔ جو موضوع حکمران مقرر کرتا ہے اسی کے تحت اس روز وہ نوجوان کہانی سنانے کا پابند ہوتا ہے اس طرح دس دن میں ایک سو کہانیاں بن جاتی ہیں اور یہ کہانیاں مشہور اطالوی مصنف جیوانی بوکاچیو کی The Decameron ہے جس کا آج کل پوری دنیا میں بڑا چرچا اور مانگ ہے۔

ذہن انسانی.....حدود و امکانات

(شاعر شہزاد احمد اور سائنس دان)

ڈاکٹر سلیم اختر

(لاہور)

جب شاعر کا تخیل مردہ ہو جائے یا قوت پرواز میں کوتاہی کی بنا پر وہ ذہنی پرندہ کی مانند محض پھڑ پھڑا کر رہ جائے تو ایسے میں شاعر کیا کرتا ہے؟ کم تخلیقی توانائی کے حامل اور محض متشاعر کو تو شاید تخیل میں اضمحلال کا احساس بھی ہو کہ اس احساس کی عدم موجودگی کے باعث ہی تو شاعر بنتا ہے لیکن اچھے اور سچے شاعر کو یقیناً اس امر کا ادراک بے چین کر دیتا ہے کہ اب پرگوئی کا عجز علامت جز رکی زد میں ہے جیسا کہ غالب نے اپنے بعض خطوط میں اس پر تعجب کیا کہ میں لکی لکی غزلیں لکھ چکا ہوں یا ایک فقیر کو اپنی غزل گاتے سنا تو اداس ہو گیا۔

میں اس موقع پر تخیل اور تخلیقی توانائی کے باہمی تعلق کی بحث نہیں چھیڑنا چاہتا (کہ یہ علیحدہ مقالہ کی متقاضی ہے) تاہم اس اہم حقیقت کی طرف ضرور متوجہ کرنا چاہوں گا کہ تخیل کے اضمحلال کے باوجود بھی تخلیقی توانائی فعال رہتی ہے۔ تخیل تخلیقی توانائی کو معلوم سے نامعلوم کی طرف جست لگانے میں مدد دیتا ہے اور اسی سے ہم ابتدائی سوال کا جواب دے سکتے ہیں۔ یعنی جب شاعر کا تخیل وہ نہ رہے جو کبھی تھا اور وہ اچھا شعر کہنے سے خود کو قاصر سمجھے تو

پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے

کے مصداق توانائی کے اظہار کے لیے نئی تشکیل تلاش کرتا ہے اور اگر تخلیقی شخصیت نفسی توانائی سے بھرپور ہو تو وہ اس میں بھی انفرادیت کا اظہار کرنے میں کامیاب رہتا ہے۔ نمایاں ترین مثال غالب کی ہے کہ عمر کے آخری دور میں خطوط کی طرف رجوع کیا اور اس میں آپ اپنی مثال ثابت ہوا۔ اس انداز سے دیگر شعرا کا مطالعہ کرنے پر دلچسپ صورت حال نظر آئے گی مثلاً امیر مینائی نے لغت نویسی شروع کر دی، حفیظ جالندھری "شاہنامہ" سے "چونٹی نامہ" تک آ گئے، ضمیر جعفری ان دونوں خاکوں کے ساتھ ساتھ ماضی کی یادیں منظر عام پر لا رہے ہیں، ظفر اقبال کالم نگاری فرما رہے ہیں۔ یہ چند مثالیں کسی شعوری انتخاب کا نتیجہ نہیں اور جیسا کہ عرض کیا اس نقطہ نظر سے شعرا کی تخلیقی توانائی کے متبادل اظہار کے ذرائع کا مطالعہ ان کی اپنی نفسی افتاد کو سمجھنے میں بھی ممد ثابت ہو سکتا ہے۔ اور فیض، راشد، ندیم اور سلیم احمد کی صورت میں ایسے شعرا بھی ملتے ہیں جن کے لیے مملکت شعر سے حدود نثر میں آنے کے لیے کسی "ویزے" کی ضرورت نہیں ہوتی۔

ہم کیونکہ شاعر کو کیف ادراک سمجھتے ہیں لہٰذا اس کے عقلی علوم سے واقفیت ضروری نہیں سمجھی جاتی اور عروض، بیان اور بدائع کے ذریعے سے وہ شاعری کر سکتا ہے بلکہ بعض تو اس کی بھی ضرورت نہیں محسوس کرتے ۔۔۔ من ارد فم کا علاقہ ۔۔۔ اور بہت سے شعرا کا کلام دیکھ کر تو واقعی یہی محسوس ہوتا ہے مگر شہزاد احمد کا یہ معاملہ نہیں کہ کئی پڑھے لکھے ایم۔ اے اردو شاعروں کے برعکس اس نے فلسفہ اور نفسیات میں ایم۔ اے کر رکھا ہے۔ اگر محکمہ تعلیم کی ملازمت اختیار کی ہوتی تو اب تک کم از کم کسی مضافاتی کالج کا پرنسپل تو ہو چکا ہوتا لیکن اس نے آزادی کو پسند کیا اور یہ اچھا ہوا کہ وہ پیوست زندگی کی دیمک سے محفوظ رہا ورنہ آج وہ بھی محض پروفیسر شہزاد احمد ہوتا یا پھر زیادہ سے زیادہ ڈاکٹر شہزاد احمد۔ شہزاد احمد کی نثر نگاری اور شاعری ندی کے دو کناروں کی مانند ہیں پہلو بہ پہلو رواں۔ نفسیات سے اس کا شغف خاصا پرانا ہے چنانچہ کوئی ربع صدی پیشتر اس نے "مذہب، تہذیب، موت" کے نام سے جو کتاب لکھی اس میں فرائڈ کے جبلت مرگ کے تصور کا تجزیاتی مطالعہ کیا گیا تھا جبکہ "تخلیقی رویے" میں سائنس کے تراجم کیے گئے ہیں۔ شہزاد احمد نے ڈاکٹر محمد اجمل کی انگریزی کتاب کا "نفسی طریق علاج میں مسلمانوں کا حصہ" کے نام سے اردو میں ترجمہ بھی کر رکھا ہے۔

"ذہن انسانی کا حیاتیاتی پس منظر" 1987ء میں مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد سے شائع ہوئی تھی۔ یہی کتاب تین برس بعد "ذہن انسان حدود اور امکانات" کے نام سے سنگ میل پبلیکیشنز لاہور نے طبع کی ہے۔ میں دوسرے ایڈیشن کے موقع پر نام کی تبدیلی کی وجہ نہیں سمجھ سکا کیونکہ اگر دونوں کتابوں کو سامنے رکھ کر بطور خاص موازنہ کیا جائے تو مغالطے میں ان دونوں کو جداگانہ سمجھا جا سکتا ہے۔ بہرحال یہ مصنف اور ناشر کا مسئلہ ہے۔

جہاں تک "ذہن انسانی حدود اور امکانات" کا تعلق ہے تو یہ جدید بلکہ جدید ترین حیاتیاتی تصورات کی روشنی میں انسانی ذہن کے مطالعہ کی سعی ہے۔ مندرجات اور ان سے وابستہ مفاہیم کے اعتبار سے یہ کوئی آسان کتاب نہیں، اگر قاری خود بھی نفسیات اور حیاتیات اور ان سے متعلقہ مباحث کے ضمن میں تھوڑا بہت ابتدائی مطالعہ نہ رکھتا ہو اور کچھ سائنس کی واقفیت سے آگہی نہ ہو تو شاید کتاب کا نقطہ نظر سمجھنا آسان نہ ہو، گو چند کہ شہزاد احمد آسان اسلوب میں بات کرتا ہے۔ اگرچہ کتاب میں حیاتیات، اساطیر اور علم الانسان جیسے علوم سے وابستہ نظریات اور تصورات کی بازگشت سنائی دیتی ہے تاہم شہزاد احمد نے اپنے دو مصنفین کولن ولسن اور آرتھر کوسلر سے بطور خاص استفادہ کیا ہے۔ اگرچہ کتاب مختلف عنوانات کے حامل ابواب پر مشتمل ہے جیسے "ٹوٹتی پھوٹتی لکیریں" .... "دبے پاؤں کا سفر" وغیرہ.... لیکن ان سب میں ایک خاص نوع کا خصوصی ربط ملتا ہے اور یوں یہ متفرق مقالات ہونے کے باوجود بھی ایک سلسلہ خیال کی کڑیوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔

جہاں تک اس کتاب کے بنیادی تھیسس کا تعلق ہے تو اس ضمن میں عرض ہے کہ انسان کے لیے سب سے اہم اور غالباً مشکل ترین مسئلہ مطالعۂ ذات‘ شعورِ نفس‘ تفہیم خود اور خود شناسی رہا ہے اور یہ آج سے نہیں بلکہ قدیم ترین دور سے ہی رہا ہے۔ ایتھنز میں اپالو کے مندر کے صدر دروازے پر یہ لکھا تھا ”خود کو پہچانو!“ عہدِ قدیم میں اس مقصد کے لیے فلسفہ‘ شاعری اور تصوف سے کام لیا گیا۔ جدید دور میں یہ فریضہ حیاتیات اور نفسیات سرانجام دے رہی ہیں لیکن کیا انسان نے اپنے ”جگ سا پزل“ کو عملی طور پر حل کر لیا ہے تو آج بھی اس کا جواب غیر مشروط نہیں دیا جا سکتا۔ وہ ستاروں پر کمندیں ڈال رہا ہے مگر خود شناسی کی منزل تو تاریک راہوں میں لے جاتی ہے اور سب کٹھن کہاوت وہی رہی کہ آئینہ اپنا نظارہ کیسے کرے؟ آنکھ خود کو کیسے دیکھے؟ شہزاد احمد نے اسے ”بے معنی سفر“ قرار دیتے ہوئے کنکھجورے کی مثال دی ہے جسے کسی کے سوال نے الجھن میں مبتلا کر دیا تھا کہ وہ ٹانگوں پر کیسے چلتا ہے؟ وہ جیسے جیسے غور کرتا گیا الجھن بڑھتی گئی حتیٰ کہ چلنے پھرنے کے قابل بھی نہ رہا اور یوں بلا حرکت کے بھوکوں مر گیا... آشوبِ آگہی کو بھی اسی مثال سے سمجھا جا سکتا ہے۔

فلسفیانہ سطح پر قدیم ترین مسئلہ کی خوب جوابی کی یا متنوع تعبیریں کی گئیں اور نفسیات اور حیاتیات نے موجودہ صدی میں بے حد ترقی کی اور ان علوم سے متعلق بہترین ذہنوں نے ”مطالعۂ خود“ سے وابستہ اسرار شناسی کے لیے خود کو وقف کیے رکھا۔ شہزاد نے جدید ترین تصورات کی روشنی میں دماغ کی ساخت کا مطالعہ کرتے ہوئے انفرادی اور اجتماعی سطح پر اس کے اثرات سے بحث کی ہے وہ خود تخلیق کار ہے سو اس نے تخلیقی رویوں کو بطورِ خاص اجاگر کیا ہے۔

جدید حیاتیات میں دو ماہرین کے تصورات کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ پہلا ہے میکلین کا دماغ کا عمودی تصور جس کی رو سے انسانی دماغ دراصل تین دماغوں یعنی رینگنے والے جانور‘ پستانی حیوانات اور انسانی دماغ پر مشتمل ہے گویا تین انواع کی مخلوقات کی دماغی خصوصیات انسانی دماغ کی تشکیل کرتی ہیں۔ دوسرا نظریہ نوبل انعام یافتہ راجر سپیری کا ہے کہ جس کی رو سے انسانی دماغ دو حصوں (یا نصف کروں) میں منقسم ہوتا ہے لہٰذا ان کی باہمی اثر پذیری اور عمل و ردِ عمل سے انسانی شخصیت کا ”موزیک“ تیار ہوتا ہے۔ اس کی تخلیقی صلاحیتیں اور تخریبی رجحانات بھی انہی کی مرہونِ منت ہیں اور بقول شہزاد احمد ”بایاں دماغ منطقی‘ عقلی اور تجزیاتی رجحانات کو ظاہر کرتا ہے اور دایاں دماغ آرٹ‘ شاعری اور مذہب کا نمائندہ ہے۔ کوشش یہی جاری ہے کہ دونوں دماغوں کو تعاون اور دوستی کے رشتے میں منسلک کیا جائے تاکہ انسان ایک نامیاتی کل کے طور پر اپنا کردار ادا کرنے کے قابل ہو سکے۔“ (ص41) شہزاد احمد نے اس ضمن میں مختلف حوالوں سے دلچسپ معلومات بہم پہنچائی ہیں جیسے صفحہ 131 پر بائیں اور دائیں دماغ سے مشروط مختلف ذہنی اعمال کی فہرست اور صفحہ 233 پر بائیں دائیں دماغ کے وظائف کا نقشہ---- یہ تمام مباحث خاصی دقیق ہیں مگر شہزاد احمد نے انہیں سادہ اسلوب میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے اور ساتھ ہی اس نوع کے سوالات بھی کیے ہیں۔ پہلا سوال تو یہ ہے کہ بنیادی طور پر دماغ کی عملداری کی حدود کیا ہیں؟ اسے عمودی یا افقی طور پر تقسیم کرنے سے ہم پر علم یا معلومات کا کون سا در وا ہوتا ہے؟ تیسرا بے حد اہم سوال یہ بھی ہے کہ انسانی دماغ کا مستقبل کیا ہے؟ (ص232) اور دیکھا جائے تو کتاب کے مختلف ابواب درحقیقت ان ہی سوالات کے جوابات ہیں‘ اس ضمن میں میں قارئین کو ”بائیں ہاتھ کی تحریر“، ”دائیں ہاتھ کا ہنر“، ”یوریکا‘ ایک نثری نظم“، ”منقسم دماغ“ اور ”تخریبِ ذات کی خواہش“ کا مطالعہ کرنے کی دعوت دوں گا۔

”جنس‘ پیدائش اور ارتقا“ اس کتاب کا اہم مقالہ ہے جس میں حیاتیات‘ نفسیات اور انسانیت پہلو بہ پہلو ملتے ہیں۔ یہاں بھی بنیادی موضوع انسانی دماغ اور اس کی ساخت کا مطالعہ ہے لیکن شہزاد احمد نے اس موضوع سے متعلق بعض ایسے مباحث کی طرف اشارے کیے ہیں جو بظاہر متعلق نظر آتے ہیں جیسے فوسلز کا مطالعہ۔ یہ گفتگو دلچسپ بھی ہے معلومات افزا بھی۔

شہزاد احمد نے انفرادی زندگی‘ معاشرہ اور عمودی تقاضوں سے جدا کر کے دماغ کا مطالعہ نہیں کیا بلکہ وہ ان سب کو ایک وسیع کل کے اجزا تصور کرتے ہوئے بات کرتا ہے۔ یوں تو یہ کتاب جو بظاہر دماغ کے مطالعہ کے لئے ہے درحقیقت انسانی شخصیت کے مطالعہ میں تبدیل ہو جاتی ہے خواہ وہ انسانی شخصیت جو تخلیقی شخصیت کی صورت میں علم و ہنر‘ شاعری اور عشق کے جوہر دکھاتی ہے اور غیر تخلیقی شخصیت بن کر دوسروں پر ظلم ڈھاتی اور خودکشی کرتی ہے۔

شہزاد احمد نے دماغ سے وابستہ نظریات کی تفہیم و تشریح کے بعد آخر میں کچھ سوالات کیے ہیں اور کچھ نتائج اخذ کیے ہیں جیسے اس کے بقول:

> ”اتنی بات تو طے ہے کہ انسانی دماغ موجودہ انسانی ضرورت سے بہت بڑی شے ہے تو پھر یہ پوچھنا پڑے گا کہ آخر اتنی بڑی شے بغیر جدوجہد کے ہمیں کہاں سے مل گئی اور یہ بھی کہ اگر ہم نے اسے کبھی استعمال نہیں کیا تو یہ اب تک جوں کی توں (یا بقول آرتھر کیسلر) پہلے سے زیادہ ترقی یافتہ صورت میں موجود کیوں ہے؟ اس کا ایک سیدھا سادہ مگر بے حد متنازعہ جواب تو یہ ہے کہ ممکن ہے کہ انسان نے اپنے ارتقاء کے دوران کبھی دماغ کو اب سے کئی گنا بہتر طریقے سے استعمال کیا ہو.... اگر مقصدیت کو ارتقاء کے ساتھ شامل کر دیا جائے تو صورتحال بالکل تبدیل ہو جاتی ہے اور ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہو جاتے ہیں کہ قدرت ہمارے دماغ سے کوئی کام لینا چاہتی ہے مگر مستقبل میں۔“ (ص 241-240)

☆

ایک شاعر کا عروضی مطالعہ

بشیر رزمی
(لاہور)

کسی بھی شاعر کی قدر آوری کے تین اہم معیار ہیں۔

ا۔ اس نے کتنا کہا ہے ٢۔ اس نے کیا کہا ہے اور ٣۔ اس نے کتنے عروضی اوزان (بحور) میں کہا ہے۔ شہزاد احمد کی مندرجہ ذیل آٹھ کتابیں شاعری پر مشتمل ہیں۔

ا۔	صدف	۱۱۷	غزلیات
٢۔	جلتی بجھتی آنکھیں	۱۰۰	"
٣۔	ادھ کھلا دریچہ	۴۸	"
۴۔	خالی آسمان	۴۳	"
۵۔	بکھر جانے کی رت	۶۳	"
۶۔	ٹوٹا ہوا پل	۵۲	"
۷۔	کون اسے جاتا دیکھے	۲۹	"
۸۔	پیشانی میں سورج	۵۷	"
	کل	۵۱۴	"

شہزاد احمد نے ۵۱۴ غزلیات بارہ بحور ا۔ بحر مجتث ٢۔ بحر رمل ٣۔ بحر ہزج ۴۔ بحر مقتضب ۵۔ بحر مضارع ۶۔ بحر رجز ۷۔ بحر کامل ۸۔ بحر منسرح ۹۔ بحر سریع ۱۰۔ بحر خفیف ۱۱۔ بحر متدارک ۱۲۔ بحر متقارب کے چونتیس (۳۴) اوزان میں کہی ہیں جن کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے۔

ا۔ خزاں جب آئے تو آنکھوں میں خاک ڈالتا ہوں
مفاعلن فعلاتن مفاعلن فعلن (مجتث)

٢۔ ڈوب جائیں گے ستارے اور بکھر جائے گی رات
فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلات (رمل)

٣۔ تجھے کبھی رنگ حسن جان گلستان پتے
فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فعلن (رمل)

۴۔ عشق وحشی ہے جہاں دیکھے گا
فاعلاتن فاعلاتن فعلن (رمل)

۵۔ مرے اس اداس گھر میں کبھی روشنی تو آئے
فعلات فاعلاتن فعلات فاعلاتن (رمل)

۶۔ کبھی ان سے کبھی خود سے بھی غافل ہو گیا ہوں میں
مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن (ہزج)

۷۔ تمہارے ساتھ آگہی ہے کائنات دھیان میں
مفاعلن مفاعلن مفاعلن مفاعلن (ہزج)

۸۔ بکھر کے ہو گئے ستاروں سے مری رات بھری ہے
مفعول مفاعیل مفاعیل فعولن (ہزج)

۹۔ جھکی ہیں زمانے میں ہوائیں
مفاعیلن مفاعیلن فعولن (ہزج)

۱۰۔ تم نہ آتے نہیں آگہی کا دیا
مفعول مفاعلن فعولن (ہزج)

۱۱۔ کس وقت خزاں لوٹی کس وقت بہار آئی
مفعول مفاعیلن مفعول مفاعیلن (ہزج)

۱۲۔ افسانے نئے نئے سنائے میں نے
مفعول مفاعلن مفاعیلن فع (ہزج، رباعی کا وزن)

۱۳۔ آپ بھی نہیں آئے نیند بھی نہیں آئی
فاعلات مفعولن فاعلات مفعولن (مقتضب)

اسے بحر ہزج کے مندرجہ ذیل اوزان میں بھی تقطیع کر سکتے ہیں
فاعلن مفاعیلن فاعلن مفاعیلن (ہزج)

۱۴۔ کیسے گزر سکیں گے زمانے بہار کے
مفعول فاعلات مفاعیل فاعلن (مضارع)

۱۵۔ کس رت کے منتظر ہیں بیٹھے راستوں پہ
مفعول فاعلاتن مفعول فاعلاتن (مضارع)

۱۶۔ یہ چاند سورج کچھ نہیں کچھ اور منظر چاہیے
مستفعلن مستفعلن مستفعلن مستفعلن (رجز)

۱۷۔ جان حقدر میں تجھی جان سے پیارا تھا
مفتعلن مفاعلن مفتعلن مفاعلن (رجز)

۱۸۔ جسے بار بار ملے تھے تم وہ مرے سوا کوئی اور تھا

باقی: روشن چراغ میں

اسم اعظم کی مہک

جناب شہزاد احمد کے کلام سے منتخب انتخاب

فیصل عظیم (کناڈا)

☆

دل فسردہ اسے کیوں گلے لگا نہ لیا
قریب رہ کے بھی جس نے تیرا پتا نہ لیا

بس ایک لمحے میں کیا کچھ گزر گئی دل پر
بحال ہوتے ہوئے ہم نے اک زمانہ لیا

کسی بھی حال میں پہنچے تو ہیں کنارے پر
یہی بہت ہے کہ احسانِ ناخدا نہ لیا

خیال آیا' روانہ ہوئے سفر کے لیے
نہ ہم نے رخت ہی باندھا نہ آب و دانہ لیا

میں جی رہا ہوں مگر یادِ رفتگاں کی طرح
مجھے گئے ہوئے لمحوں نے کیوں بلا نہ لیا

تمام عمر ہوا پھانکتے ہوئے گزری
رہے زمین پہ مگر خاک کا مزا نہ لیا

ازل سے ہے وہی بے کیف روشنی اب تک
گلوں کا رنگ ستاروں نے کیوں اڑا نہ لیا

جو تھا عزیز اسی سے گریز کرتے رہے
گلی گلی میں پھرے گھر کا راستہ نہ لیا

امید شعلہ نہیں آفتاب ہے شہزاد
چراغ تھا تو ہواؤں نے کیوں بجھا نہ لیا

○

نظر کے سامنے ہے خلد کی فضا پھر سے
زمیں پر نہ کہیں پھینک دے خدا پھر سے

وہ آچکا ہے' مجھے جس کا انتظار نہ تھا
خبر نہ تھی' در دل ہے کھلا ہوا پھر سے

امید کی یہ کرن دل میں کس لئے پھوٹی
نئی رتوں نے یہ کیا گل کھلا دیا پھر سے

بجھا بجھا ہی سہی' دل تو اپنے آپ میں تھا
چراغ جان کے اس نے جلا دیا پھر سے

میں برگِ خشک جلانے کے کام آؤں گا
اڑا کے تیری طرف لے چلی ہوا پھر سے

رواں ہو میری رگوں میں میرا لہو بن کر
وہی ہے تو' تو اسی کیفیت میں آ پھر سے

وہ جا چکا تو پلٹ آئی میری بینائی
وہ جانا تو مجھے مڑ کے دیکھتا پھر سے

بہت اداس کیا' اک اداس لڑکی نے
وہی ہوں میں وہی دن رات جاگنا پھر سے

نہ میں نے دست شناسی کا پھر کیا دعویٰ
نہ اس نے ہاتھ مجھے چومنے دیا پھر سے

جمی رہے گی موسم کی برف بالوں پر
اگرچہ چرخ پہ سورج دہک اٹھا پھر سے

میں اس کی راہ کی دیوار بن گیا شہزاد
یہ سوچ کر کہ اگر وہ چلا گیا پھر سے

سب مزے دوری سے قلب و نظر نے پائے
کیا ملاقات ہوئی بات نہ کرنے پائے

مجھے دیکھا تو سرِ راہ گزرتے دیکھا
میری خاطر وہ ذرا بھی نہ ٹھہرنے پائے

آنے والا اگر آیا ...... میری جانب آیا
رنگ کیا کیا مری آہوں کے اثر نے پائے

شب وعدہ ہے تو جی کھول کے باتیں کر لے
اتنی فرصت اسے مت دے کہ مکرنے پائے

چند لمحوں کے لیے دیکھ لیا تھا اس کو
مدتیں بیت گئیں زخم نہ بھرنے پائے

موت بھی آئی تو ہم اپنے ہی سر لے لیں گے
کوئی اس شخص پہ الزام نہ دھرنے پائے

گو اجالے ہیں مگر تیرگیاں ہیں یہ کنار
رات کے رنگ بھی انوارِ سحر نے پائے

کوئی احساس جسے صبح سے تعبیر کریں
کوئی امکان کہ یہ رات گزرنے پائے

دل سلگتا ہی رہا آنکھ پگھلتی ہی رہی
دشت کو دھوپ ملی کوہ نے جھرنے پائے

کبھی ماتھے پہ رہی اور کبھی آنکھوں میں
کیا مقامات مری گردِ سفر نے پائے

☆

دل شرر بار نفس شعلہ فشاں رہتا ہے
ایک کوندا سا رگ و پے میں رواں رہتا ہے

بے نیازانہ گزرتا ہوں چمن سے لیکن
پتہ پتہ مری جانب نگراں رہتا ہے

اپنی ہی آگ سے جل اٹھتا ہے اپنا دامن
اتنا مجبور بھی احساس کہاں رہتا ہے

گو پلٹتے نہیں گزرے ہوئے لمحے پھر بھی
دل پہ کھنچی ہوئی یادوں کا نشاں رہتا ہے

رنگ بکھراتے گزرتے ہیں چہکتے ہوئے دن
میری آنکھوں کا مگر ایک سماں رہتا ہے

اوس پڑتی نہیں جلتی ہوئی امیدوں پر
خوں میں گرمی ہو تو احساس جواں رہتا ہے

پھیل جاتے ہیں لرزتے ہوئے سائے شہزاد
نورِ مہتاب تہِ ابر رواں رہتا ہے

○

☆

مثالِ موج تڑپنا تھا' خوار ہونا تھا
نہ ڈوبنا تھا نہ دریا کے پار ہونا تھا

طواف کرنا تھا صدیوں تک اپنے سورج کا
مجھے زمیں کی طرح بے قرار ہونا تھا

پکارنے کی بھی خواہش تمام عمر رہی
پکار کر بھی اسے شرمسار ہونا تھا

تو اپنے فہم میں' میں اپنے جہل میں کامل
تجھے ہی کیا مرا پروردگار ہونا تھا؟

وہ آرزو بھی مقید ہے ریزۂ دل میں
جسے خلا کی طرح بے کنار ہونا تھا

مسافروں کو بھی منّا تھا نقشِ پا کی طرح
یہ واقعہ بھی سرِ رہ گزار ہونا تھا

زبان کا آبلہ شیرینیِ بیاں بھی ہوئی
یہ ذائقہ بھی مجھے ناگوار ہونا تھا

تلاش کرنی تھی اک روز اپنی ذات مجھے
یہ بھوت بھی مرے سر پر سوار ہونا تھا

نگاہ ڈالنی تھی آئینہ پہ ڈرتے ہوئے
ادیبوں میں مرا بھی شمار ہونا تھا

○

☆

فصلِ دل اب کے برس بھی کاٹ ڈالی جائے گی
پھول روندے جائیں گے مٹی بچالی جائے گی

بادلوں میں دیکھ پائے ہیں کوئی چہرہ نہ چاند
اب تو لگتا ہے کہ یہ برسات خالی جائے گی

یہ ضروری تو نہیں گھر تک ہی آئے سیلِ غم
کچھ نہ کچھ دیوار بھی آگے بڑھالی جائے گی

رفتہ رفتہ اپنے مرکز سے نظر ہٹنے لگی
اب جہاں جائے گی آوارہ خیالی جائے گی

کشتِ دل اب تیری مٹی میں نمو پاتی نہیں
شاخِ گل اب سنگ ریزوں سے نکالی جائے گی

کارگر ہو یا نہ ہو شامِ زمستاں کی دعا
برف تو خالی ہتھیلی پر جمالی جائے گی

اپنے خوں سے جسم کی مٹی تو گیلی ہو چکی
دیکھئے کب تک دلوں کی خشک سالی جائے گی

آسمانوں پر لکیریں پھیر دے گی تیرگی
روشنی سورج کی آنکھوں سے چرالی جائے گی

○

☆

تلاش اس کی ہے جاری کئی جہانوں میں
وہ میرے دل میں مکیں ہے کہ آسمانوں میں

نظر کے سامنے ہے اور نظر نہیں آتا
وہ روشنی کی طرح ہے سیاہ خانوں میں

میں سن رہا ہوں مگر دوسروں کو کیسے سناؤں
جو گیت گونجتا رہتا ہے میرے کانوں میں

اسی نے دی ہے مجھے سوچنے کی آزادی
اسیر جس نے سمندر کیے چٹانوں میں

امید اس سے جو بالا اُمید و بیم سے ہے
مکان اس سے جو رہتا نہیں مکانوں میں

وجودِ آدم خاکی بھی کیا نہاں ہوگا
چھپی ہوئی ہے اگر فصل چند دانوں میں

الگ تھلگ بھی ہے دنیائے بے ثبات سے وہ
لہو کی طرح رواں بھی ہے خشت جانوں میں

○

☆

آگ سے پھول جنوں ریت سے گوہر لاؤں
لا تو سکتا ہوں مگر کس کے لیے پر لاؤں

ربط گر ٹوٹ گیا ہے، اسے تسلیم کریں
تو نے دیوار بنائی ہو تو پتھر لاؤں

ہاتھ جلتے ہیں، ادھر ہاتھ بڑھاؤں کیسے
وہ ستارہ ہے، زمیں پر اسے کیوں کر لاؤں

سر پہ قائم ہے فلک ٹوٹی ہوئی چھت کی طرح
اگر اڑنے کو فضا ہو تو میں شہپر لاؤں

اپنے ہونے کے اس احساس سے فرصت مل جائے
میں کہاں سے وہ نصیبہ، وہ مقدر لاؤں

ذہن میں، میں نے تجھے پھر سے کیا ہے تخلیق
چل تجھے میں تری تصویر دکھا کر لاؤں

دلِ وحشی مرے ہمراہ نہ مر جائے کہیں
بیڑیاں کاٹ دو اس کی، اسے باہر لاؤں

وہ اگر ساتھ ہو، پہچانے نہ جائیں رستے
گھر ہی موجود نہ ہو، اس کو اگر گھر لاؤں

دور ہوتے نظر آتے ہیں ستارے شہزاد
یہ زمیں ڈوب چلی ہے، اسے اوپر لاؤں

○

☆

جب آفتاب نہ نکلا تو روشنی کے لیے
جلا کے ہم نے پرندے فضا میں چھوڑ دیئے

تمام عمر رہیں زیرِ لب ملاقاتیں
نہ اس نے بات بڑھائی نہ ہم نے جنبش لبے

سپردگی کا وہ لمحہ کبھی نہیں گزرا
ہزار بار مرے ہم ہزار بار جیے

ہزار بار وہ آیا بھی اور چلا بھی گیا
اک عمر بیت گئی اس کا اعتبار کیے

خبر نہیں کہ خلا کس جگہ پہ ہو موجود
زمین پر بھی قدم پھونک پھونک کر رکھیے

سفر بھی دُور کا ہے اور کہیں نہیں جانا
اب ابتدا اسے کہیے کہ انتہا کہیے

ہوا اٹھا نہ سکی بوجھ ابر کا شہزادؔ
زمیں کے اشک بھی آخر سمندروں نے پیے

○

☆

دھیان اس کا مرے ذہن سے جاتا نہیں پھر بھی
اس شہر سے باقی کوئی ناتا نہیں پھر بھی

بادل کی طرح توڑ لیا خاک سے رشتہ
سورج مجھے سینے سے لگاتا نہیں پھر بھی

خطگی کی خبر دیتے ہیں ساحل کے پرندے
کشتی کو کنارا نظر آتا نہیں پھر بھی

آتی ہے ہر اک سمت سے آواز اسی کی
میں اس کو کہیں ڈھونڈنے جاتا نہیں پھر بھی

معلوم ہے دنیا مری حالت پہ ہنسے گی
میں حالِ دلِ زار چھپاتا نہیں پھر بھی

شب ڈھل گئی اور شہر میں سورج نکل آیا
میں اپنے چراغوں کو بجھاتا نہیں پھر بھی

ٹکراتا ہے' سر پھوڑتا ہے' سارا زمانہ
دیوار کو رستے سے ہٹاتا نہیں پھر بھی

تنہائی کے دکھ جھیل رہا ہوں ترے ہوتے
دریا میں ہوں اور پیاس بجھاتا نہیں پھر بھی

یاد آئے جسے دیکھ کے شہزادؔ بہت کچھ
وہ کون ہے یہ ذہن میں آتا نہیں پھر بھی

○

☆

اور اگر تجھ سے میں جدا ہو جاؤں
اپنے پیروں پہ خود کھڑا ہو جاؤں

کتنی چھوٹی سی میری خواہش ہے
میں نہیں چاہتا بڑا ہو جاؤں

دل میں گر خوفِ عاقبت نہ رہے
دادِ حشر کیا سے کیا ہو جاؤں

ڈوبنا ہی میرا مقدر ہے
اپنی کشتی کا ناخدا ہو جاؤں

میرے سارے نشان مٹ جائیں
اور ترے دل میں رونما ہو جاؤں

خود سے کوئی بھی رابطہ نہ رہے
میں ترا حرفِ مدعا ہو جاؤں

دن کا سورج مجھے پسند نہیں
شبِ تاریک کا دیا ہو جاؤں

روح میں شور سا اُٹھے ہر دم
اور کہنے کو بے صدا ہو جاؤں

رُخ ہمیشہ رہے تری جانب
میں ترے گھر کا راستہ ہو جاؤں

تیرگی اک عذاب ہے شہزاد
پھر بھی خواہش نہیں خدا ہو جاؤں

○

سیاہ بخت ہوں، گر بندہ پروری ہو جائے
چراغ بھی نہ جلاؤں تو روشنی ہو جائے

قریب و دُور کی ہر اِک چیز دیکھ سکوں
خود اپنے حال سے اتنی تو آگہی ہو جائے

ہیں ایک جیسے ہر اک سمت ریت کے ٹیلے
بھٹکتا پھرتا ہوں صحرا میں، رہبری ہو جائے

اِدھر بھی ایک نظر اے بہار کے موسم
جو شاخ سوکھ رہی ہے ہری بھری ہو جائے

ہر ایک گھر میں تری رحمتوں کی بارش
دعا کہ دُور گھروں کی یہ تیرگی ہو جائے

ہر ایک گھر سے مہک آئے اسمِ اعظم کی
میں جس گلی سے بھی گزروں تری گلی ہو جائے

ملے وہ دولتِ دل جو شمار ہی میں نہ ہو
ہمارا ہاتھ سخی اور دل غنی ہو جائے

وہ جس کی خاک کفِ پا ہے آنکھ کا سُرمہ
گناہگار اگر ڈال لے، ولی ہو جائے

نصیب ہو مجھے زم زم بھی، آبِ کوثر بھی
کبھی خدا نہ کرے ختم تشنگی ہو جائے

وہ مہربان مجھے پھر بھی دیکھ ہی لے گا
تمام خلق اگر راہ میں کھڑی ہو جائے

مجھے بتا کہ میں اپنی دعا میں کیا مانگوں
جو تو پسند کرے اور قبول بھی ہو جائے

جدھر نگاہ اُٹھاؤں وہی مناظر ہوں
جو تیرے عہد میں تھی زندگی وہی ہو جائے

بہت دنوں سے ہے شہزاد تنگ دامانی
ہماری جھولی بھی اب آسمان سی ہو جائے

ایک نامو جود سیارہ

شہزاد احمد

اگر آپ اردو شاعری کے طالب علم ہیں تو آپ سات آسمانوں سے ضرور واقف ہوں گے اور آپ کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ آسمان کھوجتے ہیں اور زمین اپنی جگہ پر ٹھہری ہوئی ہے۔ آسمانوں کی اسی گردش کے باعث انسان مصائب کا شکار ہوتے ہیں، اگر کبھی یہ گردش رک جائے تو دنیا بھر میں امن وامان ہوسکتا ہے۔ ممکن ہے آپ غالب کی طرح ان گردشوں کے بیک وقت غیب اور منفی ہونے پر بھی یقین رکھتے ہوں۔

رات دن گردش میں ہیں سات آسمان
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

اقبال نے جاوید نامہ میں آسمانوں کا ذکر کیا ہے یعنی فلک قمر، فلک عطارد، فلک زہرہ، فلک مشتری، فلک مریخ اور فلک زحل۔ زمین چونکہ ایک ایسا سیارہ ہے جس پر ہم مادی زندگی میں ہوتے ہیں، اس لیے اس کے فلک کے بارے میں کوئی قابل ذکر بات نہیں کی گئی۔

کلاسیکی تصور یہ ہے کہ ہر سیارہ کے ساتھ ایک فلک کو منسلک کر دیا گیا ہے اور اس نقطہ نظر کو محض سیاروں تک ہی محدود رکھا گیا ہے، مثال کے طور پر فلک آفتاب کا ذکر مجھے یاد نہیں کہ میں نے کب پڑھا ہو، شاید اس زمانے میں بھی آفتاب کو عام سیارہ نہیں سمجھا گیا۔ جدید اصطلاحوں میں ہم سیارے اور ستارے کے مابین واضح فرق کرتے ہیں، مثلاً نظام شمسی میں سورج کو مرکزی حیثیت حاصل ہے، اس کے تمام سیارے بشمول زمین اس کے گرد گردش کرتے ہیں اور ہماری نسبت سے سورج غیر متحرک ہے، چاند بھی بالواسطہ طور پر سورج کے گرد نہیں گھومتا بلکہ زمین کے گرد گھومتا ہے اور اس طرح کے کئی چاند دوسرے سیاروں سے بھی متعلق ہیں، میں نظام شمسی کو ایک چارٹ کے حوالے سے واضح کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔

	سیارہ	سورج سے فاصلے کی اوسط ملین کلومیٹر میں	محور کا دوران	گردش کا دوران	قطر کلومیٹر میں
۱	عطارد	57.9	88دن	59دن	4.870
۲	زہرہ	108.2	225دن	243دن	12,140
۳	زمین	149.6	365دن	23 گھنٹے 56منٹ	12,756
۴	مریخ	228	687دن	24 گھنٹے 37.5منٹ	6,800
۵	مشتری	778.3	11.9سال	9 گھنٹے 50 منٹ	142,600
۶	زحل	1427	29.5سال	10 گھنٹے، 14 منٹ	119,300
۷	یورانس	2870	84سال	10 گھنٹے، 49 منٹ	49,000
۸	نیپچون	4500	165سال	15 گھنٹے، 48 منٹ	48,000
۹	پلوٹو	5900	248سال	153 گھنٹے	3000

یورانس (Uranus) سیارہ اتفاقی طور پر 1781ء میں دریافت ہوا۔ ہرشل (Harschel) جو بنیادی طور پر موسیقار تھا۔ 13 مارچ کو جمنی (Gemini) یا رامنڈل (Constellation) پر نظریں جمائے ہوئے تھا تو اسے ایک سیارہ دوسروں کے مقابلے میں زیادہ روشن نظر آیا۔ اس کے پاس 61/2 انچ کی دوربین تھی، جو اس نے اور اس کی بہن کیرولین (Caroline) نے مل کر بنائی تھی۔ اس دوربین کی مدد سے اس نے جلد ہی یہ اندازہ کرلیا کہ روشن شے ستارہ نہیں ہے پھر اسے خیال آیا کہ یہ کہیں دمدار ستارہ (Comet) ہی نہ ہو، کیونکہ جس مقام پر وہ نظریں جمائے ہوئے تھا وہاں کئی سیاروں اور سورج کی کافر مائی تھی، ویسے بھی اس زمانے میں سات سیارے ہی تصور کیے جاتے تھے، اور سات کا یہ ہندسہ ایک جادوئی عدد بن چکا تھا، بہرصورت اس نے اگلی رات بھی اس کا مشاہدہ کیا، اس نے محسوس کیا کہ وہ اپنی جگہ سے تھوڑی سی حرکت کر چکا ہے۔ اپریل میں اس نے فلکیات کی رائل سوسائٹی کو اپنی دریافت سے مطلع کیا اور ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ سیارہ ہے اور اس کے کومٹ ہونے کے امکانات بہت کم ہیں۔ چنانچہ یوں ایک گمنام موسیقار شہر کا فاقی ماہر فلکیات بن گیا۔

نیپچون (Neptune) کی دریافت کی کہانی دلچسپ بھی ہے اور عجیب وغریب بھی ہے اس میں کئی موڑ آتے ہیں۔ نیپچون سیارہ یورانس ہی کی وجہ سے دریافت ہو پایا تھا، جب تک یورانس دریافت نہ ہوا اس امر کا کوئی امکان ہی نہیں تھا کہ انسانی ذہن کی رسائی نیپچون تک ہو پاتی۔ ہرشل نے 1781ء میں یورانس کو دریافت تو کر لیا تھا مگر دوربین کے حوالے سے اس پر کچھ کام ہونا ابھی باقی تھا۔ چنانچہ دو ریاضی دانوں نے یورانس کو اسی طرح پکڑا جس طرح پولیس مجرموں کو گرفتار کرتی ہے۔ یورانس کی دریافت کے چالیس برس کے بعد ایک

فرانسیسی ماہر فلکیات الیکسی بووارڈ (Alexis Bou vard) نے اس کے مدار کا ایک تخمینہ (Table) شائع کیا اور اس کی بنیاد پر اس نے کہا کہ یہ تخمینہ نیوٹن کے انعکاسی مربع قانون (Inverse Squarelaw) کی نفی کرتا ہے کیونکہ وہ بار بار اپنے راستے سے بھٹک جاتا ہے اس کے خیال میں یہ ممکن تھا کہ نیوٹن کا یہ قانون آفتاب سے زیادہ فاصلہ رکھنے والے سیاروں پر منطبق ہی نہ ہوتا ہو لیکن اس کے ساتھ، اس کے خیال میں یہ بھی ممکن تھا کہ یورانس کے ساتھ کوئی اور سیارہ بھی موجود ہو، جو ابھی تک دریافت نہیں ہو پایا، وہ سیارہ دوری کے باوجود یورانس کے مدار پر اثر انداز ہو رہا ہو۔

بیس برس کے بعد یعنی 1841ء میں ایک نوجوان کورنش ریاضی داں جان کوچ ایڈمز (John Couch Adams) نے اپنے دل سے فیصلہ کیا کہ وہ اس مسئلہ کا حل تلاش کر کے رہے گا۔ لہذا دو برس کے بعد جب اس کو فیلو شپ مل گئی تو اس نے پنسل کاغذ کی مدد سے اس مسئلے کو حل کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ اس کی سب سے پہلی ضرورت تو یہی تھی کہ اسے یورانس کی گردش کے بارے میں پوری تفصیلات مل جائیں تا کہ وہ یہ معلوم کر سکے کہ کس کس وقت نیوٹن کے قانون کی نفی ہوتی ہے۔ یہ مواد اسے فلکیات کی رائل سوسائٹی کے سر جارج بیڈل (Sir George Biddel) نے ستمبر 1845ء تک مہیا کر دیا۔ اس دوران میں ایڈمز نے موجود قوانین کا مطالعہ بڑی گہرائی سے کیا اور اس نے اس مواد کی مدد سے یہ نتیجہ نکال لیا کہ اگلے ماہ یکم اکتوبر میں یہ سیارہ کہاں ہوگا۔

مگر اس کی قسمت نے اس کا ساتھ نہ دیا، اس کا کیمبرج کا پروفیسر چیلس (Chillis) ان معلومات کی اہمیت کو سمجھنے میں ناکام رہا۔ اس دوران ایک اور سائنس داں جس کا نام ایئری (Airy) تھا ملک سے باہر گیا ہوا تھا، جب ایڈمز نے اسے ملنے کی کوشش کی تو اس کے ملازم نے اسے نیند سے جگانے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ یکم اکتوبر کی تاریخ گزر گئی۔ سو اس نے پھر سے اس مسئلے کا مطالعہ شروع کر دیا۔

سائنس کی دنیا میں یہ واقعہ کئی بار ہو چکا ہے کہ بعض دریافتیں مختلف سائنسدانوں نے ایک ہی وقت میں کی تھیں۔ لہذا ان دریافتوں کو دونوں سے بیک وقت منسوب کیا گیا، اسی زمانے میں ایک فرانسیسی اربین جین جوزف لیوریئر (Urbain Jean Josoph Leverrier) بھی اس معاملے میں دلچسپی لیتے لگا تھا، اور اس سلسلے میں مقامی طور پر اس کی حوصلہ افزائی بھی کی گئی تھی۔ 1845ء میں ایڈمز نے اس غیر معلوم سیارے کی حرکات کا درست تخمینہ لگایا تھا، اس دوران میں لیوریئر نے اس سلسلے میں کچھ مواد شائع کیا تھا مگر وہ اس سیارے کے وجود کے امکان کو پوری طرح ثابت نہیں کر سکا تھا، پھر 1846ء میں اس نے ایک مقالہ لکھا تھا جس میں یہ کہا تھا کہ یورانس کی بے قاعدہ گردشوں کا ذمے دار کوئی اور سیارہ ہے، جس کے کھچاؤ (Pull) کی وجہ سے اس کی رفتار میں یہ تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اس نے یہ بتا دیا تھا کہ اس سیارہ کو کہاں تلاش کرنا چاہیے اور اس کا تخمینہ ایڈمز کے تخمینے کے اس قدر قریب تھا کہ اس میں صرف ایک ڈگری کا فرق باقی رہ گیا تھا۔ ایئری نے لیوریئر کے کام کے سلسلے میں اپنے ردعمل کا اظہار کیا تھا مگر وہ ایڈمز کی طرف متوجہ نہ ہوا تھا۔

اب تلاش شروع ہو چکی تھی مگر سوال یہ تھا کہ کسی ماہر فلکیات کے لیے یہ کس طرح ممکن ہے کہ نئے سیارے (Planet) اور ستارے (Star) میں امتیاز کرے ایسا کرنے کے لیے اس کے پاس آسمان کے اس حصے کا مکمل چارٹ ہونا چاہیے۔ مگر یہ چارٹ نہ فرانسیسیوں کے پاس تھا نہ انگریزوں کے پاس۔ ایک ایسا چارٹ موجود تھا مگر اسے بنانے والے بے حد منظم لوگ یعنی جرمن تھے، برلن کی پرشین (Prussian) سائنس گاہ کے جوہان گوٹ فرائیڈ گالے (Johann Gott Fried Galle) وہ پہلا سائنس داں تھا جس نے دوربین کی مدد سے نیپچون کو دیکھا تھا۔

انگلستان میں ایئری نے ایڈمز کے پروفیسر چیلس سے کہا تھا کہ وہ کیمبرج کی سائنس گاہ سے نیپچون کو دیکھے مگر یہ کام کرنے میں چیلس نے خاصا وقت لگایا۔ واقعہ یہ تھا کہ وہ نیپچون کو کئی بار دیکھ چکا تھا مگر اسے یہ اندازہ نہ ہوا تھا کہ وہ نیپچون ہے۔ بعد میں اس نے کہا تھا کہ اسے گمان نہیں تھا کہ ایڈمز کا لگایا ہوا حساب اس قدر درست ہو سکتا ہے۔

پھر برٹش میدان میں اتر آیا اور اس نے کوشش کی کہ ایڈمز کو اس کا کھویا ہوا حق دلوا دیا جائے پھر اس سلسلے میں اس نے خط بھی لکھا تھا، مگر فرانسیسی یہ کہتے رہے کہ ان کے ایک ہم وطن کو اس کے جائز حق سے محروم کیا جا رہا ہے ایک اخبار نے تو یہاں تک بھی لکھ دیا کہ برٹش، چیلس اور ایئری کی سازش کے باعث اس دریافت کا کریڈٹ ایک انگریز کو دیا جا رہا ہے۔

چند ماہ میں یہ سکینڈل ختم ہو گیا، اور ایڈمز کو اس کا کھویا ہوا مقام واپس مل گیا، اب یہ کہا جاتا ہے کہ نیپچون کو دریافت کرنے والے دو لوگ تھے یعنی ایڈمز اور لیوریئر۔ پھر ایک انگریز ماہر فلکیات ولیم لیسل (William Lassell) نے اس کا ایک چاند بھی دریافت کیا تھا اور اس کا نام ٹرائی ٹن (Triton) رکھا تھا۔ یہ چاند حجم میں ہمارے چاند سے بڑا ہے دوسرا چاند جس کا نام نیریڈ (Nereid) تھا 1949ء میں دریافت ہوا تھا، ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ دونوں چاند ایک ہی سمت میں نیپچون کے گرد گردش نہیں کرتے۔ نیریڈ تو عام چاندوں کی طرح ہے مگر ٹرائی ٹن کی گردش الٹی ہے۔

نیپچون کی دریافت سے یہ بات کھل کر سامنے آ گئی تھی کہ اس بات کا پورا امکان ہے کہ کم از کم ایک اور سیارہ بھی نظام شمسی میں موجود ہو، کیونکہ چاند کے علاوہ موجود کشش (Gravity) اس قدر ضروری تھی کہ نیپچون سے چار گنا زیادہ فاصلے کے کسی سیارے پر اثر انداز ہو سکتی تھی، چنانچہ نیپچون کی دریافت کے پانچ برس بعد ہی ایک نئے سیارے کی تلاش شروع ہو گئی تھی۔ ایک آدھ بڑے

شہاب ثاقب (Asteroid) پر بھی سیارہ ہونے کا شبہ کیا گیا تھا، اور اسے تلاش کرنے میں وہ تمام طریقے استعمال میں لائے گئے تھے جو سیاروں کو تلاش کرنے کے لیے استعمال میں آتے ہیں مگر چند سالوں کے بعد یہ ثابت ہو گیا تھا کہ اس کے دریافت کنندہ یعنی فرگوسن (Furguson) سے غلطی سرزد ہوئی تھی۔

نئے سیارے کی تلاش میں بہت سے لوگ کئی برس تک سرگرداں رہے۔ اس دوران میں کچھ دمدار ستارے (Comets) اور شہاب ثاقب تو دریافت ہوئے مگر کوئی سیارہ دریافت نہ ہو پایا۔ اسے دریافت کرنے کی سعادت ایک ایسے شخص کو ملی جسے کوئی جانتا ہی نہیں تھا۔ وہ ایک غریب لڑکا تھا اور اس کا نام کلائیڈ ولیم ٹام بو (Clyde William Tombangh) اور وہ 1906ء میں پیدا ہوا تھا۔ بارہ سال کی عمر میں اسے دوربین پر چاند کو دیکھنے کی دعوت دی گئی تھی۔ اس دعوت نے اس کی زندگی کو بدل کر رکھ دیا تھا، اس کا وہی حال ہوا تھا جو تین صدیاں پہلے گلیلیو کا ہوا تھا۔ اس نے فلکیات کے موضوع پر سستی قسم کی کتابیں پڑھنی شروع کر دی تھیں یا پھر وہ مقامی لائبریریوں سے بعض کتابیں حاصل کر لیا کرتا تھا، چند برس میں اس نے اپنے لیے ایک دوربین بھی بنا لی تھی اور پھر اس کی مدد سے مریخ کو دیکھ کر وہ حیرت زدہ ہو کر رہ گیا تھا مگر اس کے باپ نے اسے صاف لفظوں میں یہ بتا دیا تھا کہ ان کے پاس اتنے پیسے نہیں ہیں کہ اسے کالج بھجوایا جا سکے۔ چنانچہ اس نے اپنے طور پر فلکیات کا مطالعہ جاری رکھا اور دن بھر کھیت میں مزدوری کرتا رہا۔ پھر اس نے ہرشل کی طرح دوربین کا شیشہ بھی تیار کر لیا تھا۔ 1928ء میں اس نے اپنے بنائے ہوئے بعض شیشوں کو اول آبزرویٹری (Lowell Observatory) کے ڈائریکٹر وسٹو ملون سلی فر (Vesto Melvin Slipher) کو بھجوائے تھے، جس کی بنیاد پر سلی فر نے اسے رصد گاہ میں ایک اسامی پر ملازم رکھ لیا تھا چنانچہ 1929ء میں کلائیڈ ٹوم بو نے ایک سیارہ کی تلاش کا آغاز کیا تھا اور ایک مقام پر کیا تھا، جہاں رات بے حد سرد تھی۔ آگ اس لیے نہیں جلائی جا سکتی تھی کہ اس سے ہوا میں ایسی تبدیلی پیدا ہو جاتی تھی، جس کے باعث ستارے دیکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔

جنوری 1930ء میں اول ٹام بو نے جمنی (Gimini) کے مشرقی حصے کی تین تصاویر اتاری تھیں، پھر اس نے ان پر غور کرنے کا طویل اور دشوار عمل شروع کیا تھا، پلیٹ پر ہزاروں ستارے اور سیارے موجود تھے، لہٰذا ان کو لکیروں ہی میں دیکھا جا سکتا تھا۔ پھر 18 فروری کو اس نے اس خاص حصے پر غور کرنا شروع کیا جسے ڈیلٹا جیمی نورم (Delta Geminorum) کہا جاتا ہے۔ اسے یکایک ایک حرکت نظر آئی، ایک ایسا نقطہ جو ایک مقام سے اچھل کر دوسرے مقام پر پلا گیا تھا۔

یہ تو کوئی شہاب ثاقب بھی ہو سکتا ہے مگر شاید ایسا نہیں تھا۔ حرکت بہت تھوڑی سی تھی، جس سے یہ ظاہر ہوتا کہ دوری خاصی زیادہ ہے، جو جست لی گئی تھی وہ صرف ساڑھے تین لی میٹر تھی۔ جو شہاب ثاقب کی حرکت سے بہت کم تھی، کیونکہ وہ تو ایک ہفتے میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچ سکتا تھا۔

ٹام بو کو اب کوئی شبہ نہ رہا تھا، اسے معلوم تھا کہ وہ نیا سیارہ دریافت کر چکا ہے۔ اس وقت اسے سیارہ ایکس کہا جاتا تھا، اب یہ اسے پلوٹو (Pluto) کے نام سے جانتے ہیں، وہ خوشی سے بے چین تھا، لیکن اسے معلوم تھا کہ ابھی بہت احتیاط کی ضرورت ہے مگر اب بادل چھا گئے تھے اور آسمان کے اس حصے کی نئی تصاویر لینا مشکل ہو گیا تھا۔ پھر ایک دن کے بعد آسمان صاف ہوا تو ٹوم بو نے ایک گھنٹے تک فوٹو گرافی کی، پھر اس نے نئی پلیٹ کو پرانی پلیٹ سے ملا کر دیکھا، اس کا مطلوبہ معروض اپنے مقام سے کوئی ایک سنٹی میٹر حرکت کر چکا تھا، اب تو غلطی کا کوئی امکان ہی نہ تھا۔

چنانچہ 13 مارچ 1930ء کو ایک سیارہ کی دریافت کا اعلان کر دیا گیا تھا، وہ دن لوول کا 75 واں جنم دن تھا، اس نے کہا تھا کہ یہ سیارہ بھی مشتری، زحل اور یورانس اور نیپچون کی طرح ہے لیکن اصل میں پلوٹو زمین کے چاند کے برابر تھا اور اس کا قطر ایک ہزار میل تھا۔ دوسرا اختلاف یہ تھا کہ اس کا محور اس سطح پر نہیں تھا جیسے کہ دوسرے سیارے تھے، عطارد کوئی سات ڈگری جھکا ہوا ہے جبکہ پلوٹو کا محور بیضوی بھی تھا اور 17 ڈگری تک جھکا ہوا تھا اور شاید اسی باعث اس کی تلاش آسان بھی نہیں تھی اور سورج سے اس کا کم سے کم فاصلہ نیپچون کے ایسے ہی فاصلے سے کم تھا، لہٰذا اس کا محور نیپچون کے محور کو کاٹتا تھا۔

اب ایک سوال یہ بھی اٹھتا تھا کہ پلوٹو کو سیارہ بھی کہا جا سکتا ہے یا نہیں، وہ تو ایک ایسا چاند تھا جو تمام سیاروں سے آزاد ہو گیا تھا۔ لیکن پھر 1978ء میں جیمز کرسٹی (James Christy) اور رابرٹ ہیرنگٹن (Robert Harrington) نے ایک امریکی رصد گاہ میں پلوٹو کا بھی ایک چاند دریافت کر لیا تھا اور اس کا نام کارون (Charon) تھا مگر وہ پلوٹو سے پانچ گنا چھوٹا تھا۔ لہٰذا وہ ہمارے چاند سے بہت ہی چھوٹا تھا۔ اب تک بھی یہ امکان موجود ہے کہ نیپچون کے بعد کوئی اور سیارہ بھی ہمارے نظام شمسی میں موجود ہو، کیونکہ جدید تر فکر کے مطابق پلوٹو جمی ہوئی گیسوں کا ایک برف کا گولا ہے جو نظام شمسی میں کہیں باہر سے داخل کر دیا گیا ہے۔ شاید وہ اوپک (Opiks) دمدار ستارے کے ذخیرے کا ایک حصہ ہے۔

اب تک تو ہم نے ان سیاروں کے بارے میں بات کی ہے جو سورج سے دور ترین سیارے ہیں اور فلکیات کے حوالے سے انہیں بعد میں دریافت کیا گیا تھا، اگر سورج سے فاصلے کے حساب سے دیکھا جائے تو عطارد (Mercury) قریب ترین ہے اور جب وہ اپنی گردش میں قریب ترین ہوتا ہے تو اس کا فاصلہ 46 ملین کلومیٹر رہ جاتا ہے (Prihelion) اور جب دور ترین ہوتا ہے تو یہ فاصلہ 70 ملین کلومیٹر ہو جاتا ہے (Aphelion)۔ پہلی صورت میں اپنے محور پر اس کی رفتار 56 کلومیٹر فی سیکنڈ ہوتی ہے اور دوسری صورت میں صرف 37 کلومیٹر فی سیکنڈ رہ جاتی ہے، لہٰذا اس کی رفتار کا اندازہ لگانا کوئی

آسان کام نہیں ہے ایک وجہ اور بھی ہے، چونکہ عطارد زمین کے مقابلے میں سورج کے قریب ہے لہٰذا وہ کبھی بار زمین اور سورج کے درمیان آجاتا ہے اور ماہرین فلکیات ایک سیارہ دائرے کو سورج کے آگے حرکت کرتے ہوئے دیکھتے ہیں۔

عطارد کے اس طرف سورج اور زمین کے درمیان حائل ہو جانا کوئی باقاعدگی نہیں رکھتا، اس لیے بھی کہ اس کا محور ایک جیسا نہیں ہے (Eccentric)۔ اور زمین کی طرف سات ڈگری جھکا ہوا بھی ہے لہٰذا یہ مرور (Transit) کبھی اور نومبر میں پیدا ہوتا ہے۔

1700ء میں اس حالت کا خصوصی مطالعہ کیا گیا تھا۔ اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ یہ عمل صرف آنکھوں سے نہیں دیکھا جا سکتا، مگر قدیم دوربینیں بھی اس قابل نہیں کہ وہ اسے دیکھ لیں، یہ بھی آسان کام نہیں تھا کہ اس کے بارے میں یہ معلوم ہو کہ وہ کب وقوع پذیر ہوگا اور زمین کے کس مقام سے اسے بہتر طور پر دکھائی دینے کے امکانات ہیں، مگر ایسا کرنا ضروری اس لیے تھا کہ اس کی مدد سے عطارد کے فاصلے کا صحیح اندازہ کیا جا سکتا تھا اور پھر اس کی وساطت سے دوسرے سیاروں کے فاصلے ناپنے میں بھی مدد ملتی تھی۔

جو تخمینے اس وقت لگائے جاتے تھے ان میں وقت کا کچھ نہ کچھ فرق بھی نکل آتا تھا، وجہ یہ تھی کہ آسمان پر صرف سورج اور عطارد نہیں تھے اور سیارے بھی موجود تھے، اگر ایسا نہ ہوتا تو حساب لگانا آسان ہو جاتا، قریب تر سیارے جن میں زہرہ زمین، مریخ اور مشتری جیسے سیارے شامل تھے، سورج جیسے اثرات تو نہ رکھتے تھے مگر ان کے اثرات اس قدر طاقتور ضرور تھے کہ ان کے باعث بعض بے قاعدگیاں پیدا ہو سکتی تھیں، ہر سیارے کے باعث عطارد کے محور میں تھوڑی بہت تبدیلی آجاتی تھی، یہ تبدیلی سیاروں کی کمیت اور باہم فاصلے کے تناسب سے معلوم کی جا سکتی ہے اور اس کی بنیاد نیوٹن (Newton) کے قانون تجاذب (Law of Gravitation) سے ہے مگر درست حساب کتاب لگانا کچھ اتنا بھی آسان نہیں ہے۔

حساب کتاب لگانا کیسا ہی مشکل عمل کیوں نہ ہو، مگر کرنا تو پڑتا ہے اور اس میں تمام عوامل کو پوری طرح پیش نظر بھی رکھنا پڑتا ہے چنانچہ 1843ء میں مشہور فرانسیسی ماہر فلکیات لیورئیر (Leverrier) نے بڑی احتیاط کے ساتھ حساب لگایا اور یہ ثابت کیا کہ چھوٹی چھوٹی بے قاعدگیاں موجود ہیں اور ان سب حسابات کی پڑتال کے بعد بھی ایک ایسی بے قاعدگی باقی رہ جاتی تھی جس کے بارے میں یہ اندازہ نہیں لگایا جا سکتا تھا کہ وہ کہاں سے آگئی ہے؟ جب عطارد سورج کے قریب ترین مقام پر جاتا تو حرکت اس حرکت سے قدرے تیز تر ہو جاتی تھی جو حساب کتاب لگانے کے بعد ہونی چاہیے تھی۔

پھر 1882ء میں کینیڈا کے ایک ماہر فلکیات نے ان مشاہدات کا پھر سے جائزہ لیا تھا اور لیورئیر کے مشاہدات کو بہتر بنانے کے لیے تھوڑی بہت تبدیلی بھی کی تھی، مگر اصل سوال پھر بھی جوں کا توں قائم رہا تھا، کہ قریب ترین فاصلے (Prihelion) پر حرکت تیز کیوں ہو جاتی ہے؟ اگرچہ یہ حرکت بے حد معمولی تھی اور زمین کے سو برس میں اس کا فرق صرف 43 سیکنڈ تھا اور اسے واضح ہونے کے لیے کئی صدیوں کی ضرورت تھی، اور کوئی 30 لاکھ برس میں وہ اتنی زیادہ ہو سکتی تھی کہ عطارد کے پورے مدار پر اثر انداز ہو جائے۔

بہر حال درست تھا کہ عطارد پیری ہی لین مقام پر آگے کی طرف یہ حرکت کیسے کرتا ہے یہ ایک پریشان کن سوال تھا، اور اس سے یہ نتیجہ نکلتا تھا کہ خود نیوٹن کے قانون تجاذب میں بھی کوئی خرابی ہو سکتی ہے، مگر اسی دوران جو حساب کتاب لگائے گئے تھے ان کی مدد سے قوانین غیر معمولی طور پر درست بھی ثابت ہو جاتے تھے۔

اس زمانے میں سائنسی علوم کے حوالے سے، سورج سے دوری پر واقع یورانس ہی آخری سیارہ تھا، اس کی حرکت میں بھی تھوڑی بہت بے قاعدگی پائی جاتی تھی اور اس کی وجہ دوسرے سیارے تھے، جو فرق اس کے باوجود پائی رہ جاتا تھا اس سے یہ اندازہ کیا جاتا تھا کہ کوئی اور سیارہ بھی موجود ہے جو دریافت نہیں کیا جا سکا۔ پھر اس بنیاد پر نتیجہ دریافت کر لیا تھا، اس کی روداد بیان کر چکا ہوں، 23 ستمبر 1846ء کو اس حوالے سے چند گھنٹوں کے اندر گالے (Galle) نے نیا سیارہ دریافت کیا تھا۔

مذکورہ بالا صورت حال سے یہ تو واضح ہو جاتا ہے کہ نیوٹن کا قانون تجاذب درست ہی ثابت ہوتا رہا، چنانچہ عطارد کی بے قاعدگی کی وجہ بھی کسی ایسے سیارہ کو سمجھا جا سکتا تھا، جو اس وقت دریافت نہیں ہوا تھا۔ وہ سیارہ کتنا بڑا ہو سکتا تھا، اس کا اندازہ کرنا آسان نہیں تھا کیونکہ تقریباً سبھی سیاروں سے کچھ نہ کچھ چاند بھی متعلق ہو جاتے ہیں اور ان کی موجودگی میں سیارے کی کمیت (Mass) کا اندازہ کرنا آسان نہیں رہتا مگر کمیت کا اندازہ کیے بغیر سیارے کے اثرات کا اندازہ بھی نہیں کیا جا سکتا۔ زہرہ کا مثال کے طور پر کوئی چاند نہیں لہٰذا یہ اندازہ لگایا گیا کہ جو کچھ نظر آتا ہے کمیت اس سے زیادہ ہو سکتی ہے چنانچہ اس میں دس فیصد کا اضافہ ہوا، چنانچہ اگر کوئی اور کمیت عطارد پر اثر انداز ہو رہی ہوتی تو اس سے بے قاعدگی پیدا ہونا لازم تھا۔

اب مشکل یہ پیدا ہوئی کہ اگر زہرہ کو واقعی زیادہ کمیت والا سیارہ سمجھ لیا جائے تو اس کے اثرات دوسرے سیاروں پر بھی مرتب ہونے چاہئیں، اس کا ایک سایہ تو خود ہماری زمین ہے۔ لہٰذا لیورئیر کے خیال کے مطابق اس بے قاعدگی کی وجہ زہرہ سیارہ نہیں ہو سکتا تھا۔ لہٰذا اب صرف ایک ہی صورت باقی رہ گئی تھی کہ یہ بڑی کمیت والا سیارہ عطارد کے نزدیک ہو مگر باقی سیاروں کے نزدیک نہ ہو، لہٰذا یہ سیارہ عطارد کے محور کے اندر ہی تصور کیا جا سکتا تھا جس کی وجہ سے پیری ہی لین (Prihelion) کے ساتھ تیز رفتاری پیدا ہو جاتی تھی۔ یہ امکان بظاہر نہیں تھا کہ کوئی دوسرا سیارہ اس طرح اثر انداز ہوتا ہو۔

چنانچہ لیوریئر نے عطارد کے گرد کے اندر موجود سیارے کا نام ولکن (V a l c a n) رکھ دیا، یہ ایک رومن دیوتا ہیفائیس ٹوس (Hephaistos) کا ہمسر تھا اور دیوتاؤں میں لوہار سمجھا جاتا تھا، یہ ایک ایسا سیارہ تھا جو ہمیشہ سورج کی دہکتی ہوئی آگ کے قریب رہتا تھا، اس لیے اسی نام کو موزوں خیال کر لیا گیا تھا۔

ایک سوال یہ بھی اٹھایا گیا تھا کہ اگر عطارد کے گرد کے اندر کوئی سیارہ واقعی موجود ہے تو آج تک دیکھا کیوں نہیں جا سکا؟ اس سوال کا جواب مشکل نہیں تھا، جب آپ زمین سے ایسے سیارہ کو دیکھنے کی کوشش کریں گے تو وہ ہمیشہ ہی سورج کے سامنے آ جائے گا اور دیکھا نہ جا سکے گا۔

البتہ دو بار ایسا ممکن تھا کہ ولکن سیارے کو دیکھا جا سکے، ایک تو وہ موقع تھا جب مکمل سورج گرہن ہو، اور جب سورج کے قریب کی فضا تاریک ہو جائے، چونکہ ماہرین فلکیات ایسے وقت کا تعین آسانی سے کر سکتے تھے لہذا ولکن کا دیکھا جانا ممکن تھا۔ البتہ یہ مشکل ہو سکتی تھی کہ سورج گرہن کبھی کبھی واقع ہوتا تھا، بہت تھوڑی دیر کے لیے ہوتا تھا اور اکثر نامکمل ہوتا تھا۔

دوسرا موقع وہ تھا جب ولکن سورج اور زمین کے درمیان میں سے گزرتا تھا تو دیکھنے والے کو یہ لگتا تھا کہ سورج میں کوئی داغ پڑ گیا ہے مگر یہ داغ سیدھی لکیر میں مغرب سے مشرق کی طرف سفر کر رہا ہے۔

مگر ایسا کرنا اس وقت ممکن نہیں تھا جب تک ولکن کے حقیقی محور کا پوری طرح علم نہ ہو، اور یہ اسی وقت ہو سکتا تھا جب ولکن کو کئی بار مختلف حالتوں میں دیکھا جا سکتا کہ اس کے سفر کا راستہ معلوم کیا جا سکے۔

اگر سیارے کی دریافت سے قبل دیکھا گیا ہو مگر یہ اندازہ نہ لگایا گیا ہو کہ یہ سیارہ ہے تو اسے دریافت کا درجہ نہیں دیا جا سکتا، مثلاً ہرشل کے یورینس کو دریافت کرنے سے پہلے برطانیہ کے ایک شاہی ماہر فلکیات جون فلام سٹیڈ (John Flamsteed) نے کوئی سو برس پہلے یورینس کو دیکھا تھا مگر اسے ستارہ سمجھا تھا اور 34 توری (Tauri) کا نام بھی دیا تھا، لہذا ہرشل کا کمال یہ نہیں تھا کہ اس نے یورینس کو پہلی بار دیکھا بلکہ یہ تھا کہ اس نے پہلی بار اسے سیارہ سمجھا۔

ایک بار لیوریئر نے کہا تھا کہ اگر مکمل طور پر کسی ماہر فلکیات کو وہ سیارہ نظر آ جائے تو اسے ولکن کا نام دیا جائے، اس کا فوری ردعمل بھی ہوا تھا اور فرانسیسی غیر پیشہ ور ماہر فلکیات ڈاکٹر لیس کار بالٹ (Dr. Lescarbault) نے لیوریئر کو بتایا تھا کہ اس نے 1845ء میں سورج کے آگے سے ایک سیاہ چیز کو گزرتے ہوئے دیکھا تھا، مگر اس نے اس بات کو زیادہ اہمیت نہیں دی تھی مگر اب وہ محسوس کرتا ہے کہ وہ ولکن ہی تھا۔

لیوریئر نے اس کی رپورٹ کو بڑے ذوق و شوق سے پڑھا تھا اور یہ اندازہ بھی لگا لیا تھا کہ ولکن سیارہ سورج سے 21 ملین کلومیٹر کے فاصلے پر گردش کر رہا ہے۔ یہ گردش عطارد کی سورج کے گرد گردش کا ایک تہائی ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ اس کا سال 19.7 دن میں مکمل ہو جاتا ہے۔

اس مقام پر وہ سورج سے آٹھ ڈگری سے زیادہ نہیں ہو سکتا تھا لہذا اس کا مطلب یہ تھا کہ اسے صرف ایک ہی وقت میں دیکھا جا سکتا تھا اور یہ وقت سورج کے طلوع سے آدھ گھنٹہ پہلے کا وقت تھا، چونکہ ایسا کرنا انتہائی مشکل تھا اس لیے یہ نتیجہ نکالا گیا کہ اسی باعث ولکن کو آج تک دریافت نہیں کیا جا سکا۔

پھر لیس کار بولٹ (Lescarbault) کے مشاہدے سے لیوریئر نے ولکن کے قطر کا بھی اندازہ لگایا اور اسے تقریباً دو ہزار کلومیٹر قرار دیا، یہ قطر چاند کے قطر کے نصف سے ذرا سا زیادہ ہے پھر اس نے یہ بھی کہا کہ اس کی ترکیب (Composition) عطارد جیسی ہے کمیت عطارد سے سترہ گنا کم اور چاند سے ایک چوتھائی ہے، مگر اس سے بھی معاملہ حل نہیں ہو سکا تھا کیونکہ یہ شے عطارد کے پری ہیلین کی وجہ نہیں ہو سکتی تھی، اس سے تو محض یہ ثابت ہوتا تھا کہ ولکن سورج اور عطارد کے درمیان کا سب سے بڑا شہاب ثاقب ہے اور ایسے کئی اور شہاب ثاقب بھی موجود ہیں۔

پھر لیوریئر نے مذکورہ بالا استدلال کی بنا پر یہ اندازہ لگایا کہ ولکن کو کب اور کس جگہ سے دیکھا جا سکے گا اور اس بات کا تعلق سورج گرہن سے بھی تھا کیونکہ اس کے بغیر اس کا نظر آنا مشکل تھا۔

مگر یہ موقع آیا تو کوئی واضح فیصلہ نہ ہو سکا لیکن خبریں بھی ملیں کہ ولکن کو کئی بار دیکھا جا چکا ہے اب یہ ضروری ہو گیا تھا کہ اگلی نشاندہی کی جائے تاکہ آخری فیصلہ ہو سکے۔

لیوریئر کا انتقال 1877ء میں ہوا مگر ابھی تک کوئی حتمی نتیجہ نکل سکا 1878ء میں ولکن کو امریکا میں دیکھا جانے کا امکان تھا، چنانچہ امریکن ماہرین فلکیات نے تمام تیاریاں مکمل کر لی تھیں اور وہ ولکن کو دیکھنے کے لیے بیقرار تھے۔

زیادہ تر ماہرین فلکیات کو کچھ بھی نظر نہیں آیا تھا، دو ماہرین یعنی جیمز گریگ واٹسن (James Graig Watson) اور لیوس سوفٹ (Lewis Swift) نے کوئی ایسے شے دیکھی تھی جسے ولکن کہا جا سکتا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ ولکن کا قطر 650 کلومیٹر ہے اور عطارد کے مقابلے میں 14 گنا کم روشن ہے مگر یہ سب نتائج اسے سیارچہ ہی ثابت کر رہے تھے۔

انیسویں صدی کے اختتام تک فوٹوگرافی متعارف ہو چکی تھی اور اب یہ ممکن تھا کہ کسی خاص موقع پر فوٹو لے لی جائے اور اس کے بعد اس کا تفصیلی مطالعہ کسی وقت بھی کیا جا سکے۔ چنانچہ ایڈورڈ چارلس پکرنگ (Edward Charles Pickering) نے کہا تھا کہ عطارد کے اندر کوئی اجرام فلکی ایسا نہیں جو 4 شدت (Magnitude) سے زیادہ روشن ہو۔ 1909ء میں ایک امریکی ماہر فلکیات ولیم والیس کیمبل (William Wallace

Campbell) نے بڑے یقین کے ساتھ یہ کہہ دیا کہ عطارد کے محور کے اندر کوئی بھی شے 8 قامت سے زیادہ روشن نہیں ہے جس کا مطلب یہ تھا کہ وہاں کوئی ایسی شے نہیں ہے جو 48 کلومیٹر سے زیادہ بڑی ہو۔ چنانچہ ایسے لاکھوں سیارچے (Astroids) مل کر ہی عطارد کا پریکی لیس اثر پیدا کر سکتے ہیں۔

چنانچہ اس کے بعد یہ امید باقی رہنے کا موقع بے حد کم ہو گیا کہ ویلکن کی طرح کا کوئی سیارہ سورج اور عطارد کے درمیان موجود ہو، پھر 1915ء میں آئن سٹائن نے اپنے عمومی نظریہ اضافیت (General Theory of Relativity) کی مدد سے اس مسئلے کو حل کر دیا۔

آئن سٹائن کا نظریہ نیوٹن ہی کے نظریے کی توسیع تھی، عام حالات میں تو نیوٹن کا نظریہ ہی کام دیتا تھا مگر خصوصی حالات میں وہ کارآمد نہیں تھا، عطارد کا سورج کے اس قدر قریب واقع ہونا ایک ضروری حالت تھی، اس لیے اسے نیوٹن کی بجائے آئن سٹائن ہی کی مدد سے بیان کیا جا سکتا تھا۔

آئن سٹائن کا نظریہ اضافیت یہ کہتا ہے کہ کمیت (Mass) اور توانائی مساوی ہیں، مگر تھوڑی سی کمیت میں بہت سی توانائی موجود ہو سکتی ہے جیسا $E=mc^2$ یعنی توانائی = کمیت x روشنی کی رفتار x روشنی کی رفتار۔

سورج کا بہت بڑا تجاذبی میدان بہت زیادہ توانائی کا ذخیرہ ہے مگر یہ توانائی تھوڑی کمیت کے بعض اجسام کے برابر ہو سکتی ہے چونکہ تمام اجسام کچھ نہ کچھ تجاذبی میدان ضرور بناتے ہیں تو جب سورج کے تجاذبی میدان کو کمیت کے حوالے سے دیکھا جائے تو وہ اپنے لیے بہت چھوٹا تجاذبی میدان تشکیل دیتی ہے۔

لہٰذا اس کی ثانوی کشش (Pull) جو اصل میں سورج کے بڑے تجاذبی میدان کی مساوی کمیت کی ثانوی کشش ہے جو اضافی کمیت کا سبب ہے اور یہ عطارد کے محور پر اضافی اثر انداز ہے اور اسی وجہ سے عطارد کا پریکی لیس اثر پیدا ہوتا ہے اور اسی باعث دوسرے سیاروں میں اسی طرح کے اثرات رونما ہوتے رہتے ہیں۔

کہتے ہیں کہ یونانی دیوتا زیوس (Zeus) اور ہیرا کا ایک بیٹا ہیفائس ٹوس (Hephaistos) تھا، اس کا اپنے باپ سے اس بات پر اختلاف ہوا تھا کہ وہ اس کی ماں کو اس کے باغیانہ رویے پر سزا دے رہا تھا، ہیفائس ٹوس نے زیوس کو روکا، زیوس غصے میں تھا، اس نے ہیفائس ٹوس کو زمین پر دے مارا جس سے اس کی ٹانگیں ٹوٹ گئیں مگر وہ مر نہ سکا کیونکہ دیوتا مرتے نہیں ہیں۔ یہی حال ویلکن کا بھی ہے وہ سیارے کے طور پر تو موجود نہیں مگر وہ توانائی کے طور پر ضرور موجود ہے جو سورج کے قریب گردش کرتے ہوئے سیارے عطارد کی گردش میں بے قاعدگی پیدا کر دیتی ہے۔

(آزاد ترجمہ: از لکی مروف)

☆

بقیہ..... غالب خستہ کے بغیر

فرد میں تبدیل ہو جانے والی صورت حال ہے، اور اب ہم اس حیثیت میں نہیں ہیں کہ ہم اس طرح کا مابعد الطبیعاتی نظام تشکیل دے سکیں، جو غالب کے زمانے میں موجود تھا، کلاسیک کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے اندرونی نظام میں مکمل ہوتا ہے مگر اس کا ابلاغ نہیں کیا جا سکتا، ابلاغ کا امکان تو صرف اسی وقت ہوتا ہے جب کوئی شے صورت پذیر ہو رہی ہو۔ اقبال نے اسے کھلا امکان (Open Possibility) کہا تھا۔

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں

بہت سے لوگوں کو جن میں خاص طور پر کلاسیکی مزاج رکھنے والے شامل ہیں یہ کارخانے کا لفظ شاعری کے لیے غیر موزوں محسوس ہوا ہوگا۔ مگر اب جب ہم پلٹ کر دیکھتے ہیں تو اس سے بہتر لفظ ہمیں نہیں ملتا۔ جدید معاشی نظام نے پوری کائنات کو ایک کارخانہ ہی تو سمجھا ہوا ہے، جس کا وجود محض دولت پیدا کرنے کے لیے ہے اس بات کی پروا حکمران طبقے کو نہیں ہے کہ انسان اور دیگر مخلوقات پر اس کے کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ خواہ سمندر آلودہ ہو جائے، فضا میں زہر بھر جائے، زمین بنجر ہو جائے، مگر دولت ضرور پیدا ہو، قوت ضرور حاصل ہو۔

یہ صورت حال غالب کے زمانے میں نہیں تھی، مگر غالب کا زمانہ اس صورت حال کی طرف سفر کرنے کے لیے تیار ہو رہا تھا، سر سید کو کہنا پڑا تھا کہ جدید علوم سیکھے بغیر گزارہ نہیں ہے، غالب کے چہیتے شاگرد حالی سے یہ شعوری کوشش شروع ہو جاتی ہے کہ موجودہ صورت حال کو بدلا جائے، مگر ایسی کوئی خواہش غالب کے ہاں نظر نہیں آتی۔ وہ تو چاہتا تھا کہ جو کچھ ہے وہ اپنی خوبصورت ترین صورت میں موجود ہے مگر اس کے ساتھ ہی ساتھ اسے یہ احساس بھی تھا کہ کچھ ہونے والا ہے اور جو کچھ ہونے والا ہے وہ ایسا نہیں ہے جو اس سے پہلے کبھی ہوا ہو، جبھی تو غالب نے کہا تھا:

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یا رب
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

یہ شعر غالب کے اعلیٰ ترین اشعار میں سے ایک ہے مگر غالب نے اسے اپنے دیوان میں شامل نہ کیا، اس کی وجہ کیا تھی؟ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ شعر کے دوسرے مصرعے میں نقشِ پا پایا میں دو پ بہت بری طرح ٹکرا رہے تھے، اس لئے اس شعر کو قابل اعتنا نہیں سمجھا گیا، مگر خود غالب کے دیوان میں ایسی مثالیں مل جائیں گی جہاں ایک حرف کی تکرار اس سے کہیں زیادہ ہے مثلاً

میرے پتے سے خلق کو کیوں تیرا گھر ملے

مجھے لگتا ہے کہ غالب اس شعر کے معانی سے اس قدر زیادہ آشنا تھا کہ وہ خود اسے قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھا ورنہ اس کو تو دعویٰ تھا

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھئے
جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے

نئے سورج کا چہرہ

محترم شہزاد احمد کے کلام سے مختصر انتخاب
صفوت علی صفوت (نیوارک)

اپنی سالگرہ پر ایک نظم

کیا کیسے ہی
گزر جائے گی ساری زندگی
دل ہمارا مانگتا ہے
کوئی دشمن' کوئی دوست
کوئی ایسا شخص
جس کو دیکھ کر زندہ رہیں
جس کی خاطر
جان دینے کے لیے تیار ہوں
عمر کی لمبی مسافت
ہم نے تنہا کاٹ دی
اس سفر میں
کوئی ہمراہی' کوئی ساتھی نہ تھا
پھر بھی
تنہائی نہ تھی' ہر سمت کتنے لوگ تھے
اور ان لوگوں میں
کچھ ایسے بھی تھے جو رفاقت کے لیے تیار تھے
اور ہمیں
درپیش تھا ایسا سفر
جس میں
ساتھی کی ضرورت ہی نہ تھی
ذات کا زنداں تھا
زنجیرِ انا تھی پاؤں میں
اور ان سے بھاگنے کی
کوئی صورت ہی نہ تھی

○

کہاں تک ساتھ دے سکتی ہیں آنکھیں

کہاں تک ساتھ دے سکتی ہیں آنکھیں
یہ منظر کیسی تیزی سے بدلتے جا رہے ہیں
اگر ہم آنکھ جھپکیں
کتنے عالم بیت جاتے ہیں
اگر سو جائیں تو لگتا ہے
ہم نے ان گنت صدیاں گنوا دیں
ہم نے وہ شمعیں بجھا دیں
روشنی جن کی کئی قرنوں سے آئی تھی

جہاں تک دیکھنے کی ہم میں طاقت ہے
وہاں سے بھی نئے افلاک کا آغاز ہوتا ہے
جہاں ہم ختم کرتے ہیں کہانی
اس جگہ بھی
اک نئے قصے نئی روداد کا امکان ہوتا ہے
جہاں کچھ بھی نہیں رہتا
وہاں تکوین کا سامان ہوتا ہے
کوئی ارمان ہوتا ہے
حقیقت جس کو بننے میں کوئی مشکل نہیں ہوتی

عجب اک سلسلہ ہے
سلسلہ در سلسلہ ہے
اور ہم چھوٹے سے سیارے میں بیٹھے ہیں
سمجھتے ہیں کہ ان پہنائیوں کا مدعا ہم ہیں
مگر ان وسعتوں کے سحر سے ناآشنا ہم ہیں

○

نارسا

راستے چھپ گئے ماضی کے گھنے جنگل میں
منزلیں خواب ہوئیں
دھند میں ڈوب گئے کتنے دہکتے سورج
کسی ناؤ کے چمکتے سائے
گیلی مٹی سے ہم آغوش ہوئے
سو گیا ذہن میں امید کا شور!
اب یہاں کوئی نہیں نوحہ کناں
اب خوشی ہے رگ و پے میں رواں
کوئی آیا ہے، نہ آئے گا یہاں
بس یہی ایک دھواں ...... مجھ کو نگل جائے گا

میرے ذرے خس و خاشاک میں مل جائیں گے
کسی بپھری ہوئی آندھی کی طرح آئیں گے
تیرے دامن سے لپٹ جائیں گے...... (میں جسے چھو نہ سکا)

○

کٹھالی

جب میں نے شب و روز کو
آسمان کی کٹھالی میں ڈالا
اور اس کے نیچے
سورج کی آگ جلائی
تو میرا اندازہ تھا
کہ اس عمل سے جو سونا تیار ہو گا
عام سونے سے کہیں بہتر ہو گا

عام سونا بنانے کے لیے
آخر اتنا تردد کون کرتا ہے؟
آسمان کو کٹھالی بننے کے لیے تیار کرنا
کوئی آسان کام تو نہیں ہے!
سورج تو خیر جلنے جلانے کے لیے
ہر وقت تیار ہی رہتا ہے

اس کے با وجود
میں یقین سے نہیں کہہ سکتا
کہ سونا تیار بھی ہو گا یا نہیں!
اور اگر تیار ہوا بھی تو کیسا ہو گا
اگر ویسا بھی ہوا، جیسا میں چاہتا ہوں
تو یہاں کون سا ایسا دیدہ ور موجود ہے
جو اسے پہچان لے
یہ جان لے
کہ اس سونے کے اندر
(اور چیزوں کے علاوہ)
میں خود بھی شامل ہوں!

○

بہت بے آبرو ہونے کے دن ہیں

فضا نا آشنائی سے بھری ہے
زمیں خوشبو سے خالی ہو چکی ہے
سمندر میں رواں نشہ بھی ہے
کوئی آہٹ مسلسل آ رہی ہے

مگر یہ کون ہے کیا چاہتا ہے
ہیولا سا کہاں سے آ گیا ہے
کوئی چلتی ہوا سے پوچھتا ہے
سوائے خاک تیرے پاس کیا ہے

چلو موسم کا اندازہ کریں ہم
زمیں کے اس طرف بھی دیکھ لیں ہم
کھڑے کیوں ہیں کسی جانب چلیں ہم
خود اپنے پاؤں کی آہٹ سنیں ہم

کوئی آواز تو آئے کہیں سے
کہیں لاوا ابل آئے زمیں سے
ہمیں آغاز کرنا ہے یہیں سے
زمانہ چاہتا ہے کچھ ہمیں سے

مگر اپنے تو یہ سونے کے دن ہیں
بہت بے آبرو ہونے کے دن ہیں

عجب ہیبت سی طاری ہے جہاں پر
یہ کیا لکھا ہوا ہے آسماں پر
زمانہ آن پہنچا ہے کہاں پر
نہیں ہے رنج بھی ہم کو زباں پر

کہیں بادل نہ بادل کا نشاں ہے
مری بستی پہ خالی آسماں ہے
مگر یہ آسماں بھی اب کہاں ہے
فقط اک گرد سی ہر سو رواں ہے

دلوں میں بے حسی ٹھہری ہوئی ہے
مچلتی روشنی ٹھہری ہوئی ہے
ہمکتی زندگی ٹھہری ہوئی ہے
ہماری تو گھڑی ٹھہری ہوئی ہے

کوئی جنبش کوئی آواز آئے
کہیں سے اب کوئی دمساز آئے
ہم ان تنہائیوں سے باز آئے
ہمیں جینے کہ کب انداز آئے

خود اپنے حال پر رونے کے دن ہیں
بہت بے آبرو ہونے کے دن ہیں

وہ کیسی صبح تھی کیسا سماں تھا
سفر جب کارواں در کارواں تھا
جو دریا اپنی آنکھوں سے نہاں تھا
نئے آغاز کی جانب رواں تھا

بہت سے مرحلے راہوں میں آئے
وہ سوچا تھا کہ جو سوچا نہ جائے
خود اپنے ہی لہو میں ہم نہائے
مگر کچھ روشنی تو دیکھ پائے

ہماری روشنی میں گرد کیوں ہے
نئے سورج کا چہرہ زرد کیوں ہے
ہمارا خون اتنا سرد کیوں ہے
ہمارا دل مجسم درد کیوں ہے

نہ تاریکی میں رہنا چاہتے ہیں
نہ سورج کا اجالا چاہتے ہیں
خدا معلوم ہم کیا چاہتے ہیں

جو پایا ہے اسے کھونے کے دن ہیں
بہت بے آبرو ہونے کے دن ہیں

اندھیرے کی چادر

ہر لمحہ اک تلخی کا احساس ابھرتا ہے
کون ہے وہ آسیب
جو مجھ کو ہر دم گھورتا رہتا ہے
اور دکھائی بھی نہیں دیتا
لیکن اس کے ہونے کا احساس اندھیرے کی چادر ہے
اس چادر میں ایک نہیں، لاکھوں آسیب چھپے ہیں

ان گنت ان کی آنکھیں ہیں
جو دیواروں جیسی تاریکی میں
اڑتی پھرتی رہتی ہیں

یہ بجھے ہوئے جگنو ہیں
لیکن مرے نہیں ہیں

میں بھی کب زندہ ہوں
لیکن چلتا پھرتا ہوں

لوگوں سے باتیں کرتا ہوں
ان کی ڈینگیں سنتا ہوں

اور دل ہی دل میں سوچتا ہوں
کیا ان لوگوں کو تلخی محسوس نہیں ہوتی؟
وہ تلخی ----
جو ہر لمحہ مرے ساتھ لگی رہتی ہے
اور اندھیرے کی چادر میں لپٹی ہے

○

میں تیرا اثبات کر رہا تھا

میں تیرا اثبات کر رہا تھا
اور اپنا انکار کر رہا تھا
میں چاہتا تھا کہ تیری خاطر
تمام دنیا کو چھوڑ دوں میں

مگر یہ دنیا عجیب شے ہے
یہ جو بھی جھولی میں ڈالتی ہے
فریب ہوتا ہے!
چند لمحوں میں اپنی صورت بگاڑ لیتا ہے

میری جھولی ازل سے خالی ہے
اور ابد تک یونہی رہے گی
میں تیرا انکار کر رہا ہوں

○

گڑیا

مجھے زندگی کاٹنی ہی نہ آئی
کبھی سیدھے رستے پہ چلنا مقدر ہوا ہی نہیں
زندگی میں نہ ایسے گزاری
کہ جیسے مجھے زندگی کی ضرورت نہیں تھی
مجھے زندگی یوں ملی
جیسے نادان بچے کو کوئی کھلونا ملے
کوئی ایسی گڑیا
جو حرکت بھی کرتی ہو، باتیں بھی کرتی ہو
اور ہنستی روتی بھی ہو
میں بہت خوش ہوا
چند دن خوب گڑیا سے کھیلا
مگر بعد میں
میں نے گڑیا کو توڑا مروڑا
میں یہ جاننا چاہتا تھا
کہ گڑیا کہ اندر وہ کیا چیز ہے
جو اسے پیاری گڑیا بنائے ہوئے ہے
مگر میں نے دیکھا
کہ گڑیا کے اندر کوئی چیز ایسی نہ تھی
جو اس راز کو فاش کرتی
جسے جاننے کے لئے
میں نے گڑیا گنوادی
مرے ہاتھ میں
اب فقط چند ٹکڑے ہیں
کچھ دھجیاں ہیں
کچھ ایسی بھی چیزیں ہیں جن پر میں حیران ہوں
آخر ان کا تعلق مری پیاری گڑیا سے کیا ہے؟
کچھ سمجھ میں نہیں آرہا
میں نے گڑیا کو کھولا تو تھا
مگر اب اسے بند کیسے کروں؟
اس کو اس شکل میں کیسے لاؤں
کہ وہ مجھ سے باتیں کرے
مرے ساتھ کھیلے
میں ننھا سا نادان بچہ تھا
لیکن مرے ہاتھ سے جرم سرزد ہوا
اور اس کی سزا
رات دن مجھ کو ملتی رہے گی
وہ گڑیا بہت خوبصورت تھی
لیکن مجھے کیا ضرورت تھی!
میں اسکا سرا رکو جانتا
زندگی جس طرح کی بھی تھی
ہنستے ہوئے، مسکراتے ہوئے
بیت جاتی تو کیا تھا!
مجھے جاننے کی ضرورت ہی کیا تھی
اور اب
جبکہ گڑیا کا میں نے برا حال کر ہی دیا ہے
تو میں
اس کے بارے میں کیا جانتا ہوں!

○

روشن چراغ

انوار شریف (لاہور)

شہزاد احمد نے اپنی زندگی کا آغاز پیشہ نہیں کس نظارتی سامان سے کیا البتہ اتنا ضرور پتہ چلتا ہے کہ شروع جوانی میں اس نے اپنے وجود کی بخیہ کاری علم و آگہی کے ''پکے کام'' سے کی جس میں نمایاں نقوش شاعری کے ابھرے اور وہی اس کے سارے کام پر چھائے رہے۔ ہم بڑی دیر تک اسے شاعری لکھتے رہے وہ بھی اپنے آپ کو شاعری کہلوانا رہا لیکن ایک بڑے بیک ڈراپ کے پیچھے کچھ اور بھی آگ رہی رہے تھے جن سے سامنے کے لوگ بالکل ناواقف تھے۔ شہزاد احمد خود بھی ان ناواقف لوگوں میں شامل تھا حالانکہ تماشائیوں کی سب سے اگلی قطار کے وسط میں بیٹھا رہا پردہ اٹھا اور شہزاد سٹیج پر شعر سناتے سناتے ایک ایسے موضوع کی گہرائی میں اتر گیا جو بہت سے لوگوں کے لیے ایک اجنبی موضوع تھا۔ مغرب کا نازشرق سے مل رہا تھا اور شرف کی جہت الٹ کر مغرب کے وجود پر پڑ رہی تھی۔ اور یوں اردو زبان کے ایک بڑے شاعر کے اندر ایک ایسے تخلیقی عمل کی ابتدا ہوئی جس سے ہم شرق کے لوگ کم کم واقف ہیں۔

(اشفاق احمد)

وہ کراچی میں خوشحال زندگی گزار رہے تھے اور انہیں الطاف گوہر صاحب کی رفاقت بھی حاصل تھی کہ ان کا دل انہیں دغا دے گیا۔ وہ دل جو عیار اور طرحدار حسیناؤں کے سامنے کبھی نہ جھکا تھا بیماری کے ایک جھٹکے نے اسے سرنگوں کر دیا۔ میں ان دنوں کوئی مشاعرہ پڑھنے کراچی گیا ہوا تھا۔ معلوم ہوا کہ شہزاد کی حالت بہت خراب ہے۔ میں انہیں ہسپتال میں دیکھنے گیا تو وہ پورے ہوش و حواس میں تھے۔ وہ حوصلہ ہارے ہوئے مریض نہ تھے بلکہ گردش دوراں کا مذاق اڑانے والے شاعر نظر آ رہے تھے۔ میں نے دل کی بیماری کے دوران شہزاد احمد کی جو حوصلہ مندی دیکھی وہ قابل داد ہے۔

(قتیل شفائی)

فن شعر میں شہزاد نے بڑی ریاضت کی ہے۔ وہ بے تکان شعر لکھنے پر قادر ہے۔ اس کی غزلوں میں شعروں کی تعداد دوسرے عام شاعروں کی غزلوں کے مقابلہ میں کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ جس سے اگر ایک طرف اس کے زور قلم کا اندازہ ہوتا ہے تو دوسری طرف فن شعر سے اس کی لگن کا پتہ چلتا ہے۔ جب غزل کہتے ہوئے وہ کسی نئی زمین میں طبع آزمائی کرتا ہے تو اس کی یہی کوشش ہوتی ہے کہ اس زمین کے تمام امکانات بروئے کار آ سکیں۔ مجھے فخر حاصل ہے کہ اس کے شعری مجموعوں میں شامل کئی غزلیں میرے سامنے تکمیل مراحل سے گزری ہیں۔ ان خوبصورت غزلوں کو دیکھ کر یقین نہیں آتا کہ وہ ایک ہی نشست میں اور انتہائی کم مدت میں لکھی گئی ہوں گی۔

(ڈاکٹر توصیف تبسم)

شہزاد اور میری زندگی اور مزاج میں اتنا ہی فرق تھا جتنا کہ ہے جتنا ایک جنگلی حیوان اور ایک پالتو جانور میں ہوتا ہے میں انتہائی جذباتی وہ انتہائی بر خلاف۔ میں تحمل وہ بردبار۔ میں انتہا پسند خواہ دوستی ہو محبت ہو یا سیاسی نظریات ہوں وہ آہستہ رو اور معتدل میری زندگی آتش فشانی سے عبارت اس کی حیات میں ٹھہراؤ تھا۔ کبھی کبھی آؤ تھا لیکن اس کے باوجود یا غالباً اسی سبب سے ہماری دوستی قائم و دائم رہی ہے۔

(احمد فراز)

شہزاد احمد پرانے موضوعات کو بھی نئے قالب میں ڈھال دیتا ہے احساس تنہائی' انتشار و تحفظ ذات' کا اور شکست انا' بے سمتی و کج رفتاری' بے مقصدی اور لاحاصلی' بے چہرگی اور چہرے پر کئی چہروں کی نقاب ہجرت' بے گھری' اور دربدری جو کہ معاصر شعراء کے کلام کے موضوعات رہے ہیں ان کو بھی شہزاد احمد نے ایک لئی نئی زبان اور نیا اسلوب عطا کر دیا ہے جو دور حاضر کی حسیت سے ہم آہنگ ہو کر پرانی بنیادوں پر قائم رہتے ہوئے بھی نئے امکانات کی طرف اشارہ کرتا ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ان کی غزلیں مستقبل کی غزلیں اور غزلوں کا مستقبل ہیں۔

(ملک زادہ منظور احمد)

میں نے گزشتہ دنوں ایک گفتگو میں شہزاد احمد کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا کہ شہزاد صاحب نے اپنی Intelect کو اپنی تخلیقیت کا سرچشمہ بنایا اور اپنی شاعری کو نیا ذائقہ اسی سے سیراب کیا۔ اس سے میری مراد یہی تھی کہ شہزاد احمد جذبے سے کہیں زیادہ جذبے کے ادراک کو موضوع شعر بناتے ہیں۔ ان کے تخلیقی عمل میں منظر کی جب ان کے ہاں جذبہ بلکہ خود جذبہ عقلی تجزیہ کی صورت میں آ جاتا ہے لیکن وہ اپنی شاعری کو محض تعقل نفسی بھی نہیں بننے دیتے اور ایک ایسے تخیل کی مدد سے' جو حیات سے زیادہ کائنات کے حسن کا جویا ہے' وہ اپنے ادراکات (Perceptions) کو شعری پیرایہ عطا کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ یہی وہ چیز ہے جسے ہم نئے طرز احساس سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔

(ڈاکٹر اسلم انصاری)

شہزاد احمد ان خوش قسمت شعراء میں سے ہیں جنہیں ہر دور میں ناشرین کا تعاون حاصل رہا اور ان کے دیوان زمانی ترتیب کے ساتھ چھپتے رہے اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی اہم ہے کہ ان کے اظہار کا چشمہ بھی طغیان آسا رہا اور اب تک ندرت اظہار اور تازہ کاری کا ثبوت نئی غزلوں اور نظموں کی صورت میں پیش کر رہے ہیں جبکہ ان کے متعدد معاصر تھکے ماندے نظر آتے ہیں۔ اور بعض تو شاعری سے ہی ''ریٹائر'' ہو چکے ہیں یعنی خود اپنی تکرار کر رہے ہیں۔

(ڈاکٹر انور سدید)

شہزاد احمد کے یہاں محبت کے ضمن میں ایسے خیالات بھی سامنے آتے ہیں جن کی نوعیت محبت کی دنیا میں بڑی مختلف ہوتی ہے لیکن محبت کے یہ پہلو نفسیاتی اعتبار سے توجہ طلب ضرور ہیں۔ شہزاد احمد محبت کے تجربے کا گہرا شعور رکھتا ہے اس کے یہاں محبت کے نازک پہلوؤں سے بخوبی آگاہی ہے۔ شہزاد احمد اپنے جذبوں کو اچھوتے خیالوں کی قبا سے سجاتا ہے اور اس کے خیالوں نے پارس کی طرح لفظوں کو چھو کر کندن بنا دیا ہے۔

(ڈاکٹر شبیر صمدانی)

شہزاد احمد ہماری معاصر ادبی شخصیات میں ایک قابل قدر اور لائق افتخار فرد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے علمی، ادبی اور تخلیقی معاملات متنوع اور رشک خیز ہیں۔ انہوں نے ہماری اردو نثر کو بھی باثروت بنایا ہے اور اقلیم شعری کی توسیع کا فخر بھی انہیں حاصل ہے۔ اردو نثر اس حوالے سے ان کی ممنون ہے کہ انہوں نے اس میں جدید ترین فکری، فلسفیانہ اور نفسیاتی باتوں اور رویوں کو بڑی سہولت اور روانی سے بیان کیا ہے اور اردو شاعری اس اعتبار سے ان کی شکر گزار ہے کہ اس میں انہوں نے ندرت اظہار اور تازہ کاری کی ایسی جوت جگائی ہے جو ہماری جدید شاعری میں کمیاب ہے۔

(ڈاکٹر تحسین فراقی)

شہزاد احمد مذکورہ دور کی غزل کے ایک اہم نمائندہ شاعر اور اس کے باریک بین قاری ہیں۔ وہ بہت وسیع المطالعہ شخص ہیں اور ان کے مطالعے کی حدود اتنی وسیع ہیں کہ اس میں اردو ادب کے علاوہ دنیا کی چند بڑی زبانوں کے ادب سے شناسائی بھی شامل ہے۔ علاوہ ازیں سائنس، فلسفہ، نفسیات اور دیگر علوم جدیدہ سے ان کی آشنائی قابل رشک ہے۔

(خواجہ محمد زکریا)

شہزاد احمد عمر میں مجھ سے چھوٹا ہے مگر تعلیمی قابلیت اور عقل مندی میں مجھ سے بڑا ہے۔ وہ ذہین اور پڑھا لکھا شاعر ہے۔ بہت اچھے اور بے عیب شعر کہتا ہے۔ اس کی شاعری فکر انگیز بھی ہے اور فکر آلود بھی ہے۔ جہاں تک میں شہزاد کی شاعری کو سمجھ سکا ہوں وہ خالص اپنے مزاج کے شعر کہتا ہے۔ ہر چند اس نے فلسفے میں ماسٹر کیا ہے مگر اس کی شاعری میں کہیں جو فلسفہ نظر آتا ہے وہ حسی تخلیق اور محبت کے امر اور ہونا کا حال ہے۔ اور میرے نزدیک یہی ایک پڑھے لکھے شاعر کی خوبی اور خوش قسمتی ہوتی ہے۔

(اے حمید)

شہزاد احمد کے ہاں زبان و بیان کی وہ ریاضت ملتی ہے جو اب قصہ پارینہ ہوتی چلی جا رہی ہے۔ وہ مشرقی روایت جس کے مطابق شاعر کو اساتذۂ سلف کے دس بیس ہزار شعر حفظ ہونے چاہئیں شہزاد احمد کا تعلیم ہے۔ چنانچہ انہوں نے اردو شاعری کے کلاسیکی سرمائے کو بہت ڈوب کر پڑھا ہے اور جذب کیا ہے۔ ان کے شعری مذاق اس کی گواہ ہے جن کا اثر ان پر زیادہ نمایاں ہے وہ میرؔ، غالبؔ، انیسؔ، داغؔ، اقبالؔ، فراقؔ اور یگانہؔ ہیں۔ تاہم شہزاد ان شعراء میں سے نہیں ہیں جن کے کلام پر اساتذہ کی چھاپ اتنی گہری ہو جاتی ہے کہ اپنا آپ باقی نہیں رہتا۔ وہ زبان کی سلاست اور غزل کی روایت کے شیدائی ضرور ہیں لیکن محض روایت پسند ہرگز نہیں۔ ان کے ہاں جدید احساسات کے اظہار کے لیے الفاظ اور تمثالوں کے اس ذخیرے کا بے تکلف استعمال بھی ملتا ہے جو انہوں نے آج کے ماحول سے اخذ کیا ہے اور جو اساتذہ کے ہاں نہیں پایا جا سکتا تھا۔

(خورشید رضوی)

شہزاد احمد ہمارے عہد کے اہم اور ممتاز شاعر ہیں اور قوت اظہار اور خلاقی کے ساتھ ساتھ اپنے ذہنی آفاق کی وسعت، فکر کی گہرائی اور احساس کی گیرائی کی بدولت ہم عصر شاعری میں انہیں منفرد مقام حاصل ہے۔ شہزاد کی شاعری کے جمالیاتی اور فکری دونوں ہی پہلو دلکار اور خیال انگیز ہیں اور یکساں طور پر کشش کے حامل۔

(عرفان صدیقی)

شہزاد احمد نے اپنی شاعری میں شروع سے آخر تک ایک سے ہنر کا مظاہرہ کیا ہے اور اس ہنر کو ظاہر کرنے کے لیے انہوں نے شاعری کے آداب اور اس کی تہذیب کا پورا خیال رکھا ہے۔ اپنے کثیر شعری سرمائے میں انہوں نے ہر گل پر یہ کوشش کی ہے کہ شعر اپنے اصل مرتبے سے محروم نہ ہونے پائے۔ وہ خیال کو لفظ میں ڈھال دینے اور لفظ اور خیال کو ایک کر دینے کا ہنر خوب جانتے ہیں۔ ان کی شعری کائنات میں قدم رکھ کر قاری کو اولین احساس یہ ہوتا ہے کہ وہ نور کی دنیا میں قدم رکھتا ہوا آگے بڑھ رہا ہے۔

(ڈاکٹر انیس اشفاق)

شہزاد احمد ایک سنجیدہ اور غور کرنے والا شاعر ہے۔ اس کی شاعری صرف رومان کے دھندلکوں اور بدن کی آواز کی گونج تک محدود نہیں رہتی۔ وہ اس سے آگے بھی دیکھنے اور سوچنے کی کوشش کرتا ہے اور چونکہ وہ بیسویں صدی کے نصف آخر کا شاہد اور ترجمان ہے اس کے یہاں بہت پرانے سوال بھی اپنے جدید سیاق و سباق اور تناظر کے باعث مختلف اور نئے سے لگتے ہیں۔

(امجد اسلام امجد)

شہزاد احمد نے شاعری کے ساتھ ساتھ جس شان یا جستجو میں نئے علوم کے دائروں میں قدم رکھا اس نے ان کے ذہنی افق کو بے حد وسیع کر دیا ہے۔ ایک سکالر کی طرح وہ عالمی تحریکوں اور عالمی ادب کے ہر کارواں چل رہے ہیں۔ آج ادب میں اور شاعری میں صرف وہی کسی مقام پر پہنچ سکتا ہے جو اکیسویں صدی کے علم اور ادب کا باقاعدہ طالب علم ہے۔ آج مشق کے زور پر شاعری کرنے والے کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ آج تمام علوم سے رابطے اور

فطری تخلیقی صلاحیت کے کمال کیسل سے کوئی نئی حقیقت جنم لے سکتی ہے۔ شہزاد احمد کا مقام ہمارے بہت سے مقبول شاعروں سے جدا اور منفرد ہے۔ ان کے ہاں بصیرت کی مختلف جہتیں شعری اظہار میں ڈھلی ہوئی ہیں۔

(اصغر ندیم سید)

شہزاد احمد کا بڑا مسئلہ ہے۔ ان کی شاعری کے بالکل ابتدائی دور کو جو نہایت مختصر تھا، نظر انداز کر دیا جائے تو ہم پورے یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ "صدف" سے لے کر "معلوم سے آگے" تک کا سفر ایک ورٹیکل تسلسل اور وحدت رکھتا ہے۔ جس میں راستے اور پڑاؤ تو بدلتے رہے ہیں مگر مسافر اور اس کا مقصد سفر کسی تغیر کی زد میں نہیں آیا۔ شہزاد احمد کی نوجوانی کی شاعری بھی ایک رومانوی فضا رکھنے کے باوجود ان تخلیقی سطحوں کو چھوتی نظر آتی ہے جہاں محبت اپنی جبلی شدت سے دیگر دلی کیے بغیر ایک ایسا تجربہ اور احساس تشکیل دیتی ہے جو محبوب کی جمالیاتی معنویت میں فزوں پیدا کرتا ہے اور اپنے سچے پن کی وجہ سے شعور کی اس غیر ذہنی تخلیق سے ہم آہنگ ہے جو حق کو نیتاً خالص اور آزاد حالت میں صورت سے ممتاز رکھتا ہے۔

(احمد جاوید)

خدا، کائنات اور انسان کی تثلیث ادب کا بہت بڑا موضوع ہے لیکن ہر سچا ادیب، شاعر اس موضوع کو ایک نئی جہت دے کر اس سے کچھ تازہ معنی پیدا کرنے کی خواہش کرتا ہے۔ اپنے وجود کے اثبات اور معنویت کی طلب میں شہزاد احمد نے بھی ایک Genuine فن کار کا رویہ اختیار کیا ہے۔ لیکن اس پرانے موضوع کو انہوں نے جس طرح تازہ کرنے کی کوشش کی ہے وہ ہماری شاعری کا یکسر منفرد تجربہ ہے۔ اس تجربے کی انفرادیت یہ ہے کہ اس میں خدا، کائنات اور انسان کو تثلیث کے زاویوں کی صورت جوڑ کر دیکھنے اور یہ طے کرنے کی کوشش نہیں کی گئی کہ کا تریز اویکون سا ہے؟ بلکہ شہزاد احمد نے فکر و کا اصول اختیار کیا ہے۔ انہوں نے انسان اور کائنات کو آپس میں ٹکرا کر اور ایک دوسرے کے مقابل رکھ کر دیکھا ہے۔ اب یہ نیا تجربہ اگر ہمارے لیے یقین کا جواز بن رہا ہے تو کیا کیا جا سکتا ہے! شہزاد احمد کے ساتھ ہم جس نئے شاعرانہ Domain میں داخل ہو چکے ہیں وہاں کے انکشافات پر غصے اور جھنجھلاہٹ سے تو خیر کچھ ہوگا ہی نہیں لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ اب آنکھیں بند کر لینے سے بھی بات نہیں بنے گی۔ اصل میں یہ اردو شاعری کو اس کی آنکھوں کی سوئیاں نکال کر طلسمی قید سے آزاد کرانے کی ایک کوشش ہے۔

(تحسین مرزا)

لسانی کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو شہزاد احمد نے نہ صرف اپنے قریبی کم عمر غزل نگاروں کو متاثر کیا بلکہ اپنے قریبی ہم عصروں کو بھی اس حد تک متاثر کیا کہ شہزاد احمد کے طرز اظہار سے ایک پورا عہد جدید غزل کے عہد سے عبارت ہو گیا۔

(خالد احمد)

شہزاد احمد ہمارے دور کے قد آور ادیب اور شاعر ہیں۔ انہوں نے شعر و ادب میں اردو کے لئے جو خدمات سرانجام دی ہیں۔ اس کا ایک زمانہ معترف ہے۔ انھوں نے صنف شعر کے لطیف ذریعہ کو سائنس جیسے خشک موضوع کیلئے اپنا کر ایک خوبصورت امتزاج پیدا کیا ہے۔

(آغا امیر حسین)

شہزاد احمد کے متعلق مختصر ترین لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ وہ ایک اعلیٰ پائے کا شاعر، ایک اعلیٰ پائے کا مترجم اور صاحب اسلوب سوانح نگار ہے۔ سوانح حیات اور علمی نظریات کو "بام آفتیدہ" کرنے کا فن وہ خوب جانتا ہے۔ خالص علمی مباحث میں بھی اس کی نثر کا اسلوب انگریزی محاورے کے مطابق اور کچھ نہیں تو Readable کے درجے کو پہنچ جاتا ہے اور یاد رکھئے یہ معمولی بات نہیں ہے۔ ایک ایسی صفت ہے جو کم کم نصیب ہوتی ہے۔

(ریاض احمد)

عجیب سی بات ہے غزل میں لیٹے ہوئے شہزاد احمد نے اب اپنے لیے ایک نئی کھڑکی کھولی ہے شاید یہ دیکھنے کے لیے کہ دوسری طرف کیا ہے؟ "معلوم سے آگے" شہزاد احمد کا پہلا نثری نظموں کا مجموعہ "معلوم سے آگے" کے موضوعات میں گرفت بھی ہے اور چونکاہٹ بھی۔ گرفت اس لیے کہ موضوعات میں تنوع ہے، آدمی جیسا گرد و غبار ہے، جانے والے لمحوں کی سنسناہٹ اور آنے والے لمحوں کی آہٹ ہے اور چونکاہٹ اس لیے ان دیکھے دروازے ایک دم کھلتے ہیں۔ ذہن کے تمام دریچے باری باری جھلملانے لگتے ہیں اور کبھی کبھی تو یوں لگتا ہے جیسے کوئی تار غیر متوقع طور پر مرتعش ہو کر ٹوٹ گیا ہے اور تمام ہالے بکھر گئے ہیں۔

(اظہار شاہین)

شہزاد احمد ایک ذہین اور زیرک شخص ہیں۔ انہوں نے خود اپنی دوستی کی طرح اپنی روایت کو سامنے رکھتے ہوئے نئے امکانات کا جائزہ لیا اور پھر موضوعات اور ڈکشن کے حوالے سے نئی راہ نکالی اور سخن میں اپنی ایک پہچان بنائی۔ ان کے ہاں تبحر علم کے باوجود اضافت بہت کم ملتی ہے۔ کھلے قافیے کا استعمال عام ہے۔ موضوعات میں فلسفے کی گہرائی، سائنس کی حقیقت اور نفسیات کا ابہام موجود ہے مگر اس عمل کے ساتھ ساتھ ان میں کلاسیکی رنگ ضرور موجود ہے کہ وہ بھی ایک قادر الکلام استاد کی طرح غزل کے امکانات کو تمام پہلوؤں سے دیکھتے ہیں۔ ان کے فن میں مکمل ریاضت ہوتی ہے۔

(سعد اللہ شاہ)

شہزاد احمد کے ادب پاروں میں معقولی دبستان کی چھل بل جادو بکھیرتی محسوس ہوتی ہے۔ اسی کے اعجاز سے ان کے شعری و نثری صحیفے یکساں

طور پر وافق مطالعہ ہیں۔ ایک کہنہ مشق کی طرح انہوں نے لفظ و معانی کے رشتے میں خداداد فراست کی آنچ سموئی۔ ان کا قلم غالب تمکن، یاس یگانہ چنگیزی یا ناسخ آب دار بھی بنا، تاہم ان کا آہنگ نشاطیہ لے سے محروم رہا۔ انہوں نے حسی توازن سے انسان کے مخفی مسائل اجاگر کیے جن کا خلاصہ "عدم آسودگی" ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس کرب سے نجات کا طریقہ بھی تجویز کیا۔

(سیف اللہ خالد)

تکنیکی حوالے سے شبیر احمد کی شاعری جہاں فنی لحاظ سے اپنے دامن میں نت نئے اوزان کی ایک کہکشاں آباد کیے ہوئے ہے وہاں ہیت کے لحاظ سے یہ سہل ممتنع اور گہرائی فکر کا ایک حسین امتزاج ہے۔ ادبی افق پر جگمگ جگمگ کرنے والی اس کہکشاں سے ہر قاری اپنے ذوق کے مطابق ستاروں کا انتخاب کر سکتا ہے۔

(احسان اللہ ثاقب)

شبیر احمد کی شاعری مونتاج کی طرح گوناگوں اور ہمہ رنگ ہے جہاں ideas اور احساسات اپنے بے شمار رنگ اور زاویے لیے سامنے آتے ہیں۔ یہ امتزاج بہت نادر اور کمیاب ہے۔ کبھی اندر کی واردات باہر کے مظاہر سے ٹکرا کر چنگاریاں پیدا کرتی ہے، کبھی اندر کی پگڈنڈیاں جنگل میں نئے راستے کھول دیتی ہے۔ شبیر احمد کی کتابوں میں سفر کرتے ہوئے آہستہ آہستہ ایک جہاں صورت پذیر ہونے لگتا ہے۔ جو صرف دو دریا کا روایتی دوآبہ نہیں بلکہ ان فصیلوں کے بیچوں بیچ ایک اور ادیدہ کائنات بھی ہے جس کی تعمیر شبیر احمد کے تخیل اور خواہشوں نے کی ہے۔

(منصور واحد)

ہمارے سامنے شبیر احمد ایک صوفی کے روپ میں آتے ہیں جو کائنات کے مظاہر میں اپنے رب کو تلاش کرتا ہے اور اسے کسی بھی لمحے خود سے جدا نہیں محسوس کرتا۔ اس کے ساتھ میں ہمارے سامنے ایک بچہ بھی آ جاتا ہے جسے استاد نے کلاس کے تمام لڑکوں میں سے چن کر مانیٹر بنا دیا ہو اور اس کی آنکھوں کے جگنو یہ خوشی پا کر جگمگا رہے ہوں۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ شبیر احمد کا مضبوط حوالہ غزل ہے لہذا انہیں نثری شاعری کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ ہمارے خیال میں شبیر احمد کو واقعی نثری شاعری کی ضرورت نہیں تھی لیکن شاید شاعری کو شبیر احمد کی ضرورت تھی۔ اس لیے شبیر احمد نے نثری شاعری میں قدم بلکہ قلم رکھا۔ "معلوم سے آگے" میں جو کچھ بھی ہے وہ باہر سے نہیں لایا گیا بلکہ ہمارے وجود میں پہلے سے موجود ہے لہذا "معلوم سے آگے" تک پہنچنے کے لیے ہمیں اپنے کتھارسس کی ضرورت ہے۔

(فاخرہ بتول)

☆

بقیہ: ایک شاعر کا عروضی مطالعہ

متفاعلن متفاعلن متفاعلن متفاعلن (کامل)

۱۹۔ وقت لہو کی ترنگ سا مہکا شباب
مفتعلن فاعلان مفتعلن فاعلان (منسرح)

۲۰۔ دوری منزل کا ٹھکانہ نہیں
مفتعلن مفتعلن فاعلن/فاعلات (سریع)

۲۱۔ رات بھر جاگنا پڑا ہے
فاعلاتن مفاعلن فعلن (خفیف)

۲۲۔ مدھ بھری جتنی آنکھیں بھی تھیں تم سے ملتی رہیں مسکرا کر
فاعلن فاعلن فاعلن فاعلن فاعلن فع (متدارک)

۲۳۔ کبھی دھوپ نہیں ہے سورج میں کبھی دھوپ میں پیڑ کا سایہ نہیں
فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن (متدارک)

۲۴۔ دل تھا جن مندروں کا کبھی دیوتا
فاعلن فاعلن فاعلن فاعلن (متدارک)

۲۵۔ یہ جگمگی ہوئی چاندنی یہ فقار رات کی رات ہے
فاعلن فاعلن فاعلن فاعلن فاعلن (متدارک)

۲۶۔ پکارا کیے دوستو دوستو
فعولن فعولن فعولن فعل (متقارب)

۲۷۔ زمین و آسماں اندھیرے میں گم ہیں سارے
فعول فعلن فعول فعلن فعول فعلن (متقارب)

۲۸۔ ندیوں کو تیرے دکھ نے ہم بیاباں سے لوٹا گئی
فعول فعلن فعول فعلن فعول فعلن فعول فعلن (متقارب)

۲۹۔ سب کچھ دیکھ رہے ہیں لیکن کہنے سے معذور
فعلن فعل فعولن فعلن فعلن فع (متقارب)

۳۰۔ گردش میں خالی پیمانہ لگتا ہے
فعلن فعلن فعلن فعلن فع (متقارب)

۳۱۔ جس کے ساتھ بس اک لمحہ گزارا ہوتا ہے
فعلن فعل فعولن فعلن فعلن فعلن (متقارب)

۳۲۔ اب تجھ کو اپنانا ہے
فعلن فعلن فعلن فع (متقارب)

۳۳۔ پچھلے پہر میں بجتے ناد یہ کیا جادو کرتے ہو
فعل فعولن فعلن فعلن فعلن فعلن فع (متقارب)

۳۴۔ پریت بنا جگ سونا سونا پریت سے دکھ ہوئے
فعل فعولن فعلن فعل فعولن فعلن (متقارب)

☆

دعائے التفات

حمد شریف

○

میں نے جو حمد کے لیے مانگی دعائے التفات
اُس کے کرم سے ہٹ گئیں راہ و ثنا سے مشکلات

اس میں بھی کچھ نہ کچھ تو ہے حکمتِ ربِّ کائنات
نظمِ بے ثبات میں ہوتے ہیں جو تغیرات

بخشیں خدائے پاک نے ذرّوں کو وہ تجلیات
کوئی شمار کیا کرے اتنی ہوئیں نوازشات

جن کی نہ کوئی ابتداء، جن کی نہ کوئی انتہا
گوشۂ دل میں اک طرف رکھ دیں عجیب خواہشات

ظلمتِ شب میں آدمی اُس کو بنائے راہبر
پھیلا ہوا فلک پہ ہے نورِ زرخ نگارشات

ایسے پڑھیں کتاب کو، حمدِ خدائے پاک کو
دیدۂ دل سمیٹ لیں سارا کلامِ دینیات

کچھ بھی نہیں ہمارے پاس، اُس کا اگر کرم نہ ہو
اُس کے ہی سب حروف ہیں، اُس کے ہی سب تخلیات

غنچے کھلیں گے ایک دن لوحِ مراد پر سہیلؔ
لوحِ قلم کو چوم کر، لکھتے رہو خدا کی ذات

سہیل غازی پوری (کراچی)

حمدِ ربِّ باری

○

ربِّ کعبہ خالقِ کل اے خدائے ذوالجلال
بالیقیں ہے تیری قدرت باکمال و بے مثال

اے خدا تیری تعریف کے قابل فقط ہے تیری ذات
کر رہی ہے حمد تیری ہر گھڑی کل کائنات

تو ہی سب کا خالق و رازق ہے اے ربِّ علا
رزق پتھر میں بھی تو کیڑوں کو کرتا ہے عطا

آب و گل سے بیج کو کرتا ہے تن آور شجر
سیپیوں میں بحر کی تخلیق کرتا ہے گوہر

تو ہی دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سحاب
پھر گھٹاؤں میں بدل کر ان سے برساتا ہے آب

عظمتیں بخشی ہیں کیا کیا تو نے مشتِ خاک کو
کر دیا انسان کے زیرِ قدم افلاک کو

حمد تیری ہو رقم ماہرؔ سے یہ ممکن نہیں
حمد کرتے ہیں بیاں تیری امام المرسلیں

محمد حسین ماہر اجمیری
(میرپورخاص)

نعت

○

کسی انسانیت کے جسم کا سایا نہیں
آج تک کوئی پیمبر آپؐ سا آیا نہیں

چلچلاتی دھوپ کو بھی کر دیا ساون صفت
ابر ایسا پہلے کوئی زیست پر چھایا نہیں

بیکسانِ دہر کے سر پر رکھا دستِ اماں
اور کسی کے ہاتھ یہ طرزِ عمل آیا نہیں

ہر تہی دامن کو بخشا آپؐ نے اوجِ کمال
ان کا فوز و فیض کس انسان نے پایا نہیں

ہر پیمبر سے ملا اونچا محمدؐ کو مقام
کوئی بھی ذی مرتبہ تو آپ کے جیسا نہیں

سرخرو کر دیجیے مجھکو بھی شاہِ انبیاء
آپؐ نے تو دشمنوں کو در سے لوٹایا نہیں

کیا کرو گے مال و دولت جمع کر کے تم حصیرؔ
آپؐ کی ہستی سے بڑھکر کوئی سرمایا نہیں

حصیر نوری
(کراچی)

سلام

○

کسی سے پوچھو کہے گا حسینؑ زندہ ہے
حسینؑ زندہ رہے گا، حسینؑ زندہ ہے

چھڑے گی بات جہاں بھی صداقت و حق کی
زباں پہ آ کے رہے گا حسینؑ زندہ ہے

نصیب اُس کو شہادت ہوئی ہے سجدے میں
حسینؑ کیسے مرے گا، حسینؑ زندہ ہے

لہو سے جس کے ہوئی ہے جہاں میں تابانی
چراغ اُسی کا جلے گا، حسینؑ زندہ ہے

یزیدیوں کو یہی فکر کھائے جاتی ہے
حسینؑ چھا کے رہے گا، حسینؑ زندہ ہے

ستم گروں کے مقابل اٹھیں گے جب مظلوم
وہ عصر خود یہ کہے گا حسینؑ زندہ ہے

رہے گا کذب و صداقت میں معرکہ جب تک
ثبوت ملتا رہے گا حسینؑ زندہ ہے

سید خورشید انور رضوی
(اسلام آباد)

تیسری دنیا

جوگندر پال (دلی بھارت)

السلام علیکم!۔۔۔۔ آپ کے ساتھ بیٹھنے میں مجھے کوئی عذر نہیں مگر میں کہیں بیٹھ جاتا ہوں تو لوگ میری داستان سنتے ہوئے اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور مجھے شرمندگی ہونے لگتی ہے میں کیسا مہمان ہوں کہ میرے میزبان مجھ سے چھٹکارا پانے کے لیے اپنے ہی گھروں سے باہر ہو لیتے ہیں۔ لیجیے بیٹھ گیا۔۔۔۔ پیرانہ سالی سے یہ حال ہے کہیں بیٹھ جانے کا حیلہ مل جائے تو خدا کا شکر بجا لاتا ہوں ورنہ کبھی وہ وقت تھا کہ لوگ باگ پیچھے سے آوازیں دے دے کر روک لینا چاہتے تھے مگر میں ہمیشہ آگے کی آوازوں کی جانب رواں دواں ہوتا تھا۔۔۔۔

السلام علیکم۔۔۔۔ آیئے آپ بھی بیٹھ جایئے۔ میں نے ابھی اپنی داستان شروع نہیں کی۔ دراصل میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اپنی داستان کی ابتداء کہاں سے کروں۔ بڑھاپے کی بھی ایک مصیبت ہے کہ ساری کی ساری عمر آدمی کے سامنے کھڑی ہوکے اس کا منہ چڑاتی ہے اور لٹھ لے لے کے کھاتے ہوئے اس کے پیچھے دوڑتا ہے کیا مجال جو بے چارے کے ہاتھ اس کا بازو کندھا سر یا پاؤں آ جائے۔۔۔۔ جو بیت گئی وہ بیت گئی۔۔۔۔ مجھے تو لگتا ہے کہ جو بھی مجھ پر بیتی ہے وہ مجھ پر نہیں بیتی۔۔۔۔ کہیں پر بیتی، جو ایک کے بعد ایک روپوش ہوتے گئے۔ اب کس کس مردے کو کھود کر کھڑا کروں کہ آؤ بھئی پہلے شہادت دو۔ ہاں' مجھے معلوم ہے آپ ان ہوئی باتوں کے اتنے عادی ہو گئے ہیں کہ شہادت کے بغیر ہی بھی واقعات پر باور کر لیتے ہیں۔ لیکن آپ نے داستان سنتے ہوئے کس وقت کا شاہد ہوتا ہے مجھے تو وقت جھیلنا ہوتا ہے جیسے جھیلنا ہو میری ہوئی شہادتوں کو بھی اپنے پیروں پر کھڑا کرنے کا جتن کرنا رہتا ہے کہ کسی طرح جھیلنے سے بچ جائے۔ لیکن جھوٹ یا سچ کے محض اعلان سے کوئی بھوگتا ہے نہ مرتا ہے سچائی کی شہادت کی صورت تو جھیلتے چلے جانے سے ہوتی ہے۔ بڑی مشکل کا سامنا ہے مگر کیا کیجیے؟

السلام علیکم! بیٹھیے۔ میں نے ابھی اپنی داستان شروع نہیں کی۔ کسی کو کسی اور کی داستان سناتا ہوں تو وہ ایک ہی بے لاگ لمحے میں اسے فر فر بیان کر دیتا ہے۔ داستانیں اوروں کی سنائی جاتی ہیں لیکن میں ہمیشہ اپنی ہی داستان سنانے پر مصر ہو جاتا ہوں اور کہیں سے شروع ہو کر کہیں اور ہی آ نکلتا ہوں۔ نہیں، میری جوانی میں ایسے نہیں ہوتا تھا۔ اس وقت تو میں کوئی بات شروع کرنا چاہتا تھا تو میرے کچھ کہے بغیر بات خود آپ ہی اپنے آپ کو اٹھا لیتی تھی اور میں اس سے خفا ہو جاتا تھا کہ اپنے آپ کو خود آپ ہی بیان کرنا تھا تو مجھے کیوں خواہ مخواہ بیچ میں لے لیا۔ جوانی کی باتیں چھوڑیے، اتنی خالی ہوتی ہیں کہ باتیں کرنے والا بیچا

ں کھڑے کا کھڑا رہ جاتا ہے اور اس کی باتیں خوابوں کی مانند اپنے آپ بھر بھر کر وہاں آسمان میں پہنچی ہوتی ہیں۔ سنا اس وقت روشن ہوتا ہے جب آپ پوری میں بیان کی ذمہ داری قبول کر لیں۔

پیری میں آپ کو اپنی آواز اتنی ہوزنی معلوم ہوتی ہے کہ آپ اسے دل و دماغ سے اٹھا کر منہ تک بھی نہیں لا پاتے۔ میری عمر؟ آپ یقین نہیں کریں گے کہ جب میں پیدا ہوا اس وقت پورے ایک سو دو برس کا تھا پھر یہ ہوا کہ میری عمر ہر سال کے بعد ایک سال کم ہوتی گئی اور اس طرح آج پورے ایک سو دو برس بیت چکے ہیں یعنی اپنی عمر کے حساب سے مجھے جتنا بھی جینا تھا، جی چکا اور اب جو جی رہا ہوں اپنی عمر کے اوپر جی رہا ہوں۔ میں تو بہت بوڑھا ہوں۔ مگر میرا خیال ہے کہ ہر شخص۔۔۔۔ بچہ یا بوڑھا۔۔۔۔ ہر دم اپنی عمر کھا پی کر اس سے اوپر ہی جی رہا ہوتا ہے۔ آپ میری لمبی عمر اور صحت کا راز جاننا چاہتے ہیں؟ راز واز کیا، میں اس لیے نہیں مرا کہ ابھی میری داستان ادھوری ہے۔

پھر بھی کیا؟ صحت بھی کوئی راز کی شے ہے۔ میری ساری زندگی کھلے کھلے ہی گزری ہے۔ اچھی خوراک؟ اچھی خوراک کیا ہوتی ہے؟ جو بھی جب ملا اللہ کا شکر ادا کر کے کھا لیا۔ ورنہ ملا تو؟ ہاں نہ ملا تو محسوس ہوتا ہے کہ ہم اپنا آپ کھا رہے ہیں۔ ہاں، عمر کھانے سے پیٹ تو بھر جاتا ہے مگر اُسے کھاتے ہوئے دانت ٹوٹ جانے کا اندیشہ رہتا ہے۔ ہاں، پیٹ بھر جانے کے باوجود بھوک نہیں مٹی۔

السلام علیکم! کیا آپ بھی میری داستان سننے آئے ہیں؟ آیئے ابھی میں نے اپنی داستان شروع نہیں کی نہیں، میں بال شول سے کام نہیں لے رہا ہوں۔ مجھے اپنی داستان تو سنانا ہی ہے کسی نئے مقام پر اپنی ساری گزشتہ داستان کھول کر سناتا ہوں تو یہی لگتا ہے کہ ابھی پرانے مقامات سے نکلا نہیں ہوا اور جہاں آیا ہوں وہاں ابھی نہیں پہنچا۔ مگر عجیب بات ہے کہ جوں جوں جس کی طرف قدم اٹھتے ہیں توں توں اپنا ازلی ذہن سے کھوتا جا رہا ہے۔ بس اتنا یاد ہے کہ ایک پیغام لے کر چلا تھا۔ نہیں، نظم میں ہوگا۔ ہاں، نظم میں ہی تھا کیونکہ میں اُسے گنگنایا کرتا تھا اور گنگناتے ہوئے مجھ پر رقت طاری ہو جاتی تھی اور میں رونے لگتا تھا۔ میری ماں اسی دم آنچل کر کے مجھے گود میں لے لیتی اور اپنا پستان میرے منہ میں ٹھونس دیتی اور اس کے دودھ کی بوندوں کو حلق میں ٹپکتے ہوئے محسوس کر کے میں روتے روتے مسکرانا شروع کر دیتا۔ نہیں، تفصیلات مجھے یاد نہیں مگر مجھے یقین ہے کہ ایسے ہی ہوتا ہوگا۔ ہاں، وہ پیغام نہایت اہم تھا۔ معلوم کس نے دیا تھا؟ اور کس کے نام تھا؟ ہاں، مجھے یہ احساس ضرور ہے کہ وہ پیغام بہت اہم تھا۔ کئی بار سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے ذہن پر پورا زور ڈالتا ہوں کہ کم سے کم اتنا ہی یاد آ جائے کہ پیغام دینے والا کون تھا۔ یا نہیں تو کم سے کم یہ کہ مجھے وہ پیغام کس کے پاس پہنچانا تھا۔ شاید اسی سے پتہ چل جائے کہ وہ کہاں سے کس

پیغام کا انتظار کر رہا ہے ہر ایک سے پوچھتا پھرتا ہوں۔ مگر سبھی میری طرف اس طرح دیکھتے ہیں گویا کوئی پاگل بول رہا ہو۔

السلام علیکم! آیئے ابھی میں نے اپنی داستان شروع نہیں کی۔ ٹھہریے نہیں کہیں آپ ہی تو نہیں؟ کہیں کہ عین وقت پر وہی پہنچتا ہے جس کا ہمیں انتظار ہو۔ کیا آپ کہیں سے کسی نہایت اہم پیغام کی راہ تک رہے ہیں؟ ہاں ـــــ ہاں ـــــ دیکھا آپ نے؟ جس کا ہمیں انتظار ہوتا ہے وہ عین وقت پر پہنچ جاتا ہے ہم خواہ مخواہ مایوس ہو جاتے ہیں۔ واہ صاحب واہ! آپ کو پورے ایک سو دو برس سے ڈھونڈ رہا ہوں نہیں یوں نہیں۔ یوں کہیے کہ جب آپ پیدا ہوئے تو آپ اکیاون برس کے تھے یعنی میرے اکیاون برس رہ گئے تھے تو آپ پیدا ہوئے۔ ہاں صاحب اپنی پیدائش سے پہلے تو آپ سے ملنے سے رہے لیکن نہیں ایسے بھی نہیں۔ ایک دفعہ واقعی میرا ایک ایسے گداگر سے ملنا ہوا جو ابھی پیدا نہ ہوا تھا۔ میں نے بھی آپ کی مانند اس کی بات کو ہنس کر ٹال جانا چاہا مگر وہ بڑی متانت سے کہا ہوا کہ زندگی بھر میری ایک بھی خواہش پوری نہیں ہوئی تو میں پیدا کیسے ہو گیا! میں سراسیمہ سی ٹکٹکی سے اس کی طرف دیکھنے لگا تو وہ بولا، اگر آپ کو اطمینان کرنا ہو تو یہاں بڑی سے بڑی آگ بھڑکا کر ایک طرف کھڑے ہو جایئے اور دیکھیے میں کس طرح جوں ہی جلے بغیر اس میں سے نکل جاتا ہوں آدمی تو خواہش پوری ہونے سے وجود میں آتا ہے۔ جس کا وجود ہی نہیں اسے آگ کیا جلائے گی؟ میں نے اس کے چہرے کی طرف بغور دیکھا تو محسوس ہوا کہ وہ قہقہے لگا رہا ہے مگر ان قہقہوں کی آواز مجھے سنائی نہ دے رہی تھی۔ نعوذ باللہ! اس کے بعد راستے سے بھاگ کر میں نے ایک شاہراہ پہنچ کر دم لیا۔

خیر یہ قصہ چھوڑیے، بات یہ ہو رہی تھی کہ اپنی پیدائش سے پہلے آپ مجھ سے کیونکر مل سکتے تھے۔ ٹھیک ہے ملنا تو پیدائش کے بعد ہی ہوتا ہے لیکن پیدائش کا انحصار بھی تو وصل پر ہوتا ہے۔ عین ممکن ہے کہ آپ کی پیدائش سے پہلے ہماری ملاقات ہو جاتی تو آپ اسی دم پیدا ہو جاتے۔ بہر حال خدا کا شکر ہے کہ بالآخر ہماری ملاقات ہو گئی۔ اب آپ سوچ سمجھ کر بتایئے کہ آپ کو کس پیغام کا انتظار تھا۔ مجھے قطعاً یاد نہیں کہ میں آپ کے لیے پیغام لے کر چلا تھا۔ جھجکیے نہیں، جو ہے سو بول دیجیے، شاید باقی ساری بات مجھے آپ ہی یاد آ جائے کیا؟ کوئی ایسی بڑی بات نہیں؟ کیا خفا تھے؟ کوئی بڑی بات نہیں ہوتی۔ بات تو صرف بات ہوتی ہے اور صرف کرنے کے لیے ہوتی ہے۔ آپ کی بیوی کے حمل ٹھہرا ہوا ہے؟ اور وہ بچے کی پیدائش کے لیے اپنے ماں باپ کے یہاں گئی ہوئی ہے؟ اچھا آپ کو اپنے بچے کی آمد کی خبر کا انتظار ہے نہیں، پھر وہ پیغام آپ کے لیے نہیں۔ شاید آپ کے وارث کے لیے ہو جس نے ابھی پیدا ہونا ہے۔ ہاں کوئی وارث ہو تو اچھا ہی ہے مگر آپ اسے وراثت میں کیا دے کر مریں گے؟ اپنی بھوک؟ خفا نہیں ہوجیے، جواب دیجیے۔ لیکن نہیں، پہلے میری بات سن لیجیے۔ میں ابھی تک اسے روک کر بیٹھا تھا کہ آپ میں سے کسی کو آپ ہی سوجھ جائے گی اور میرے بولنے کی نوبت نہ آئے گی۔ بات یہ ہے کہ بھوک سے میرا دم نکلا جا رہا ہے؟ تو شاید آپ کی بھوک سے ہی میرا یہ حال ہے۔ تو جو کچھ بھی ہے لے آیئے، باہم بیٹھ کر بسم اللہ کریں۔ کیوں؟ کیا۔ کھانے کو کچھ بھی نہیں؟ ہے ہے ہا ـــــ ہا ہا اسی لیے آپ سب اپنے آپ یہاں جمع ہو گئے ہیں بھوکوں کو بلایئے نہ بلایئے، آپ ہی آپ دنیا بھر سے چلے آتے ہیں کہ شاید بھوک مٹنے کا سامان ہو جائے اور جہاں سامان ہو جائے وہیں سکونت اختیار کر لیتے ہیں اور بھانت بھانت کی بولیاں بولنے کے باوجود سچے ہم وطن معلوم ہوتے ہیں۔ بھوک کا رشتہ بڑا گہرا رشتہ ہوتا ہے صاحبو ـــــ بے حساب لوگوں میں اسی ایک درد اور اضطراب کا رشتہ۔ ہاں، ماں باپ کا، بھائی بہن کا، بیوی، بچوں کا رشتہ بھی اس رشتے سے چھوٹا ہے۔ ٹھہریے، میرا خیال ہے میرے ذہن میں وہ پیغام اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائے بے تحاشا چلا آ رہا ہے۔ ہاں، ہاں وہی ہے۔ پوری ایک صدی میرے ذہن کے بے کراں جنگل میں بھٹکتا رہا اور اب اچانک وارد ہو گیا ہے۔ ٹھہریے صاحبو! بے صبر نہ ہو جیے۔ ہاں ہاں یہ پیغام آپ سبھوں کے لیے ہے۔ نامعلوم کون سی نیرنگی زبان بول رہا ہے مگر سیدھا سادہ مطلب یہ ہے کہ عدم میں کھانے پینے کو کچھ مہیا نہیں ہوتا جیسے بھی ہو اس دنیا میں اپنی روٹی روزی کی صورت کیجیے۔

السلام علیکم! آپ بھی آیئے، ابھی میں نے اپنی داستان شروع نہیں کی ـــــ

☆

☆

"آج کے ترقی یافتہ زمانے میں یہ اصول حرفِ آخر ہے کہ وہ قوم جو اپنے تجربہ کار ذی فہم و عقل مند افراد کی قدر نہیں کرتی اور ان کو اہمیت نہیں دیتی اس قوم کے مقدر میں عبرت ناک انجام اور تباہی لکھی ہے۔ تمام ہماری تمام معاشرتی کشش تمام ظرافت ذہنی سمندروں اور زمین پر تمام فتوحات، قسمت کا لکھا ہی یہ تبدیل نہیں کر سکتے۔ ہم آج اگر اپنی زندگی کے مسائل حل کرنے میں کامیاب ہیں تو سائنس یقیناً ایک قدم آگے بڑھ چکی ہوگی اور اس فیصلے کے خلاف ہم کوئی اپیل نہیں کر سکیں گے جو کہ غیر تعلیم یافتہ، غیر تجربہ کار قوم کے خلاف دیا جائے گا۔"

(پروفیسر ڈاکٹر الفریڈ نارتھ وائٹ ہیڈ)

ایک سائیکلوسٹائل وصیت نامہ

منشا یاد (اسلام آباد)

جس روز شہر میں ایک بڑا خودکش دھماکہ ہوا، خیریت معلوم کرنے کے لیے رات بھر دوسرے شہروں سے احباب اور رشتے داروں کے ٹیلی فون آتے رہے۔ گاؤں سے ابا جان کا فون بھی آیا۔ وہ خاصے متفکر تھے۔ انہوں نے شہر کی صورت حال کے بارے میں تفصیل پوچھی تو میں نے دل کا غبار نکالا۔

"یہ محض ایک شہر کی بات نہیں ہے ابا جان۔ چوریوں، ڈاکوں، دھماکوں اور پے در پے خودکش حملوں نے سارے ہی بڑے شہروں کو یرغمال بنا کر رکھ دیا ہے۔ خود علاقے کے نگہبان اور محافظ سب سے زیادہ غیر محفوظ ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے حکومت امن و امان قائم رکھنے میں ناکام ہو گئی ہو۔ دفتر جاتے ہوئے بھی ڈر لگا رہتا ہے۔ پتہ نہیں کب اور کہاں کوئی دھماکا ہو جائے۔ سب سے زیادہ فکر بچوں کی رہتی ہے۔ بس سٹاپ اور دفتر محفوظ ہیں نہ سکول اور کالج۔ بچوں کو بھیڑ والی جگہوں پر جانے سے منع کرتے اور خود بھی احتیاط برتتے ہیں لیکن پھر ضرورتیں لے جاتی ہیں۔ اس سے زیادہ بدقسمتی کیا ہو گی کہ جہاں کہیں قانون نافذ کرنے والے کسی ادارے کی گاڑی کھڑی ہو یا جہاں پولیس یا سیکورٹی والے موجود ہوں، لوگ قریب جانے سے ڈرتے ہیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کیا کریں"

"میری مانو تو بچوں کو میرے پاس گاؤں بھیج دو"

"یہ کیسے ممکن ہے ابا جی۔ ان کی تعلیم کا کیا ہو گا؟"

"بیٹا! جان ہے تو جہان ہے اور اب تو بڑے بڑے لیڈر بھی اپنے ٹھکانے چھوڑ کر محفوظ مقامات پر منتقل ہو رہے ہیں"

"یہ تو کوئی حل نہ ہوا ابا جی۔ صرف اپنی جان کی فکر کرنا تو خود غرضی ہے"

"لیکن بیٹا مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے شدت پسندی کی آگ نے تمہارے شہر کو اندر اور باہر سے اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہو"

"وہ تو ٹھیک ہے ابا جان۔ لیکن ہم بچوں کو کہیں نہیں بھیج سکتے"

"جیسے تمہاری مرضی۔ اللہ تم سب کو اپنی امان میں رکھے۔ کہیں آنے جانے میں بہت احتیاط کرو"

"ٹھیک ہے ابا جان"

"اور ہاں وہ مولانا سراج الدین کا آدمی تمہارا ایڈریس لے گیا ہے۔ اس نے یہ تو نہیں بتایا کہ کام کیا ہے لیکن چندے وغیرہ کا کام ہی ہو گا۔ جو بھی ہو کوشش کرنا، ناراض نہ ہو جائیں"

"آپ نے تو بتایا تھا کہ وہ چندوں اور خیرات کے خلاف ہیں اور اسے گداگری سے تعبیر کرتے ہیں"

"ہاں پہلے ایسا ہی تھا مگر اب مدرسے اور طلبہ کی ضروریات پوری کرنے کے لیے مخیر حضرت کا تعاون قبول کر لیا جاتا ہے"

میں مولانا سراج الدین سے کبھی ملا تو نہیں تھا مگر ان کے بارے میں بہت کچھ سنا تھا۔ ان کا گاؤں ہمارے گاؤں سے چند ہی کوس کے فاصلے پر ہے۔ وہ پورے علاقے میں اپنے فدائین کی وجہ سے بہت بااثر سمجھے جاتے ہیں۔ اگرچہ ایک بڑے زمیندار گھرانے سے تعلق ہے لیکن ان کی شہرت کی وجہ زمین داری نہیں بلکہ ایک دینی درس گاہ کا قیام اور درویشی ہے۔ کہتے ہیں کہ جن دنوں وہ پنجاب یونیورسٹی میں ایم اے کر رہے تھے اور ہوسٹل میں رہتے تھے، بعض ہم جماعتوں کے ذریعے ان کی ملاقات ایک ایسے عالم دین سے ہو گئی جن کا سلسلہ کسی کالعدم جہادی تنظیم سے جڑا ہوا تھا۔ اس سے پہلے وہ ایک عام سے طالب علم تھے اور ان کے مشاغل بھی ویسے ہی تھے جیسے شہر میں آ کر کھاتے پیتے زمیندار لڑکوں کے ہوتے ہیں لیکن پھر ان کی ایسی مکمل کایا کلپ ہو گئی کہ انہوں نے سارے لہو و لعب ترک کر دیے اور نماز روزے کی سختی سے پابندی شروع کر دی۔ دین کا رنگ ان پر ایسا غالب ہوا کہ کچھ ہی عرصہ بعد ان کا لباس، وضع قطع اور ذوق تبدیل ہو گیا۔ یہاں تک کہ انہیں یونیورسٹی کی تعلیم بھی فضول لگنے لگی اور وہ دینی شعائر کی سختی سے ادائیگی میں اپنے رہنماؤں سے بھی دو ہاتھ آگے نکل گئے۔ وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر گاؤں واپس آ گئے اور مسجد سے ملحقہ حجرے میں قیام کیا۔ انہوں نے ماڈرن دور کی ان ساری چیزوں اور خرافات کا استعمال ترک کر دیا جن کی سنت اور حدیث میں گنجائش نہیں تھی۔ حجرے سے بجلی کا کنکشن کٹوا کر وہاں سرسوں کے تیل کا دیا رکھ دیا گیا۔ فریج اور کولر کے پانی کی بجائے وہ گھڑے کا پانی استعمال کرنے لگے جبکہ وہ پانی نلکے یا بجلی کے موٹر پمپ کی بجائے بوکے یا ڈول کے ذریعے کنوئیں سے نکالا گیا ہو۔ ٹیلی فون یا موبائل فون کا استعمال تو دور کی بات ہے انہوں نے مشینی اور ریشمی لباس ترک کر کے کھڈی پر بنا ہوا کھدر پہننا شروع کر دیا۔ پلنگ کی بجائے بان کی چارپائی، کرسی کی بجائے سرکنڈوں سے بنا موڑھا، لکھائی کے لیے پین اور بال پوائنٹ کی جگہ روشنائی کی دوات اور سرکنڈے کا قلم۔ بجلی یا گیس کے چولہے کی بجائے ان کا کھانا مٹی کی ہنڈی میں لکڑیوں کے چولہے پر پکتا۔ مشین کی بجائے چکی کا آٹا استعمال ہوتا۔ گاؤں کی کوئی عورت یا بہنیں، بھاوجیں، چاچیاں، خالائیں اور والدہ بھی پردے کے بغیر سامنے آتیں تو وہ سامنے آنے اور ملاقات سے انکار کر دیتے۔ شادی سے انکاری تو نہیں تھے مگر ایسی بیوی دستیاب ہونا آسان نہ تھا جو چکی پیس کر لکڑیوں کی آگ پر روٹی پکا سکے۔ صحت اچھی اور ریش مبارک فراخ تھی کچھ ہی عرصہ میں ناف تک پہنچ گئی۔ بعض لوگ تو اس قدر گھنی اور لمبی ریش مبارک کی زیارت کرنے ہی آتے۔

شروع میں کچھ لوگ اس درویشی کو ڈھونگ، غیر سنجیدہ اور مشکوک

چڑ گئے تھے پھر آہستہ آہستہ اس کی جگہ اعتبار ہوتا رہا اور شہرت نے لے لی اور تماشے سے زیادہ زیارت کا رنگ نمایاں ہوا۔ پھر وہ خلقِ خدا کی بیماری اور حاجت روائی کے لئے دم درود تعویذ اور دعا گری بھی کرنے لگے۔ جس سے بہت سے لوگوں کو شفا بھی ہو جاتی۔ بہت سوں کی جائز ضروریات اور حاجتیں پوری ہو جاتیں، دلی مرادیں بر آتیں۔ لیکن ہر کامیابی ان کے ماننے والوں میں دگنے چوگنے اضافے کا سبب بنتی۔

مجھے ان سے ملنے کی خواہش ضرور تھی مگر ہر بار جب میں گاؤں جاتا، کوئی دوسری مصروفیت آڑے آ جاتی اور میں تہیہ کر لیتا کہ اگلی بار ایسے مجذوب شخص کو دیکھنے ضرور جاؤں گا جس نے قدامت پسندی کے سارے ریکارڈ توڑ دیئے اور زندگی کو تکلفات سے پاک کر کے آسان اور سادہ بنا دیا۔ مہنگائی اور لوڈ شیڈنگ کی فکر نہ بجلی، پانی اور گیس کے بڑھتے ہوئے خرچ کرانے کی چنتا۔ لیکن گاؤں کے بعض لوگ ہی نہیں ہمارے اپنے گاؤں کے پیش امام مولوی محمد شفیع بھی کہتے تھے کہ جاٹ آدمی تھا۔ علم کا بوجھ برداشت نہ کر سکا علم اس کے سر کو چڑھ گیا۔

یہ تین روز پہلے کی بات ہے۔

ابھی ڈری اور سہمی ہوئی رات کی سویر نہیں ہوئی تھی کہ ہم ہڑبڑا کر بیدار ہو گئے۔

کسی نے برقی گھنٹی کے بٹن پر مسلسل ہاتھ رکھا ہوا تھا اور وہ لگاتار بجے جا رہی تھی۔ ضرور کوئی گاؤں سے آیا ہوگا جو ہی ایسا کرتے ہیں۔ ایسا پہلے بھی ہو چکا تھا۔ گرمیوں میں خاص طور پر گاؤں کے مہمان موسم کی سختی سے بچنے کے لیے رات کو سفر کرتے۔ بس یا ٹرین میں نیند پوری کر لیتے۔ دن کو ملاقات یا شاپنگ کر کے اگلی رات کو واپس چلے جاتے۔ اس طرح ان کا ایک دن بچ جاتا اور ہمیں بھی زیادہ تکلیف نہ اٹھانا پڑتی۔ میں ابھی لباس ٹھیک کر کے باہر جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ بیٹے نے اطلاع دی۔

''گاؤں سے کوئی قاری صاحب آئے ہیں''

''تم انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھاؤ''

''نہیں ابو جی۔ پہلے آپ ان سے مل کر معلوم کر لیں کون ہیں۔ آج کل ایسے وضع قطع کے آدمیوں سے ملتے ہوئے احتیاط لازم ہے''

میں جلدی جلدی منہ ہاتھ دھو کر باہر آیا۔ گیٹ کے باہر ایک درمیانی عمر کا پگڑی والا باریش شخص کھڑا تھا۔ سادہ اور سفید کپڑوں میں ملبوس۔ کسی مسجد یا دینی مکتب کا آدمی معلوم ہوتا تھا۔

''السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ''

''وعلیکم السلام''

''میں مومن آباد سے آیا ہوں''

''مومن آباد؟''

''جی ہاں جسے پہلے موہن آباد کہتے تھے''

''ہاں ہاں یاد آیا۔ اسے مسلمان کر لیا گیا ہے''

''میں نے آپ کا پتہ آپ کے والدِ گرامی قدر سے لیا''

''جی ہاں انہوں نے ٹیلی فون پر ذکر کیا تھا''

''آپ یقیناً حضرت قبلہ مولانا سراج الدین صاحب مدظلہ کو جانتے ہوں گے؟''

''اگرچہ شرفِ زیارت سے ابھی تک محروم ہوں لیکن انہیں کون نہیں جانتا''

''میرا نام قاری عبدالغفار چشتی قادری سراجی ہے۔ میں مدرسہ سراج الدین فرقانیہ میں استاد ہوں لیکن آپ مجھے حضرت قبلہ مولانا سراج الدین کا خادم سمجھئے''

میں نے گیٹ کھول کر ان سے ہاتھ ملایا اور نہایت تعظیم سے انہیں ڈرائنگ روم میں لے کر آیا۔ پھر بیگم کو آواز دی کہ وہ ان کے لیے ناشتے کا انتظام کریں۔ لیکن انہوں نے منع کر دیا۔ کہنے لگے: ''روزے سے ہوں۔ سحری بس کے اڈے پر کر لی تھی''

''لیکن رمضان کا مہینہ تو رخصت ہو گیا؟''

''ہمارے لیے رمضان المبارک سارا سال رہتے ہیں''

''ماشا اللہ''

''یوں بھی ہم کسی پر خورد و نوش کا کوئی بار نہیں ڈالتے''

''جی ہاں۔ مجھے معلوم ہے'' میں نے پوچھا ''کیسے تشریف لائے ہیں؟''

''مجھے مولانا صاحب نے آپ کی خدمت میں بھیجا ہے۔ آپ کے بارے میں ان کی رائے بہت اچھی ہے''

''زہے نصیب''

تو ان کی آواز سنائی دی تو وہ اٹھ کھڑے ہوئے ''پہلے میں نماز پڑھ لوں۔ پھر اپنی آمد کی غرض و غایت عرض کروں گا۔ جائے نماز منگا دیجئے''

''وضو کے لیے ملحقہ غسل خانے میں تشریف لے جائیں''

''الحمدللہ میں وضو سے ہوں''

میں نے جائے نماز بچھا دیا تو انہوں نے کمرے میں جا بجا لگی ڈیکوریشن کی چیزوں اور تصویروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کسی دوسری جگہ نماز پڑھنے کی خواہش کی۔ مہمان خانے اور دوسرے کمروں میں بھی فوٹو لگے ہوئے تھے۔ کہیں سکول کے مہمان خصوصی کے ساتھ بچوں کے گروپ فوٹو، کہیں ڈیکوریشن کا گھوڑا، کہیں بدھ کا مجسمہ اور کہیں تاج محل کا ریپلیکا۔ سچا میں نے انہیں لان میں نماز پڑھنے کی صلاح دی مگر وہ بولے

"اگر مسجد قریب ہے تو میں وہاں چلا جاتا ہوں۔ آپ اتنی دیر میں یہ تحریر پڑھ لیجیے"

میں نے انہیں مسجد کا پتہ بتایا اور وہ ایک لفافہ مجھے تھما کر مسجد چلے گئے۔ میں نے لفافہ کھولا۔ اس میں محمد شفیق کا جسے ہم مینو کے نام سے پکارتے تھے، تعارف اور ایک سائکلوسٹائل وصیت نامہ تھا۔ میں اس کی شہادت کے بارے میں سن چکا تھا اور میرے دل پر ایک بوجھ سا تھا کہ میں اس کے والد مولوی محمد شفیع کی خواہش پوری نہ کرسکا۔ وہ چاہتے تھے میں اسے اپنے پاس رکھ لوں اور کسی کام پر لگا دوں کیوں کہ اس نے ساتھ والے گاؤں میں جو نیا دینی مدرسہ کھلا تھا وہاں جانا شروع کر دیا تھا۔ لیکن میں نے معذرت چاہی اور کہا

"مولوی صاحب اگر اس کا رجحان دینی تعلیم کی طرف ہے تو اسے پڑھنے دیں۔ آگے چل کر وہ آپ کی جگہ سنبھال سکے گا"

"اگر اتنی سی بات ہوتی تو مجھے کیا اعتراض تھا" وہ بولے "مگر وہاں جو تعلیم دی جاتی ہے اس کے بعد بچے کسی جہادی تنظیم میں شامل ہو جاتے اور جنت کی خواہش کرنے لگتے ہیں۔"

"تو کیا آپ نہیں چاہتے کہ آپ کا بچہ جنت کی خواہش کرے"

"میرا ایک ہی بیٹا ہے۔ پانچ بہنوں کا اکلوتا بھائی"

"یہ ضروری تو نہیں جہاد پر جانے والا ہر بچہ شہید ہی ہو"

"ایسے کئی لڑکوں کی میتیں آ چکی ہیں"

"پھر بھی لوگ اپنے لڑکوں کو وہاں داخل کراتے ہیں؟"

"لوگوں کا کیا پوچھتے ہو بھائی۔ یہاں تو بعض ایسے والدین بھی ہیں جنہوں نے منت مانی ہوتی ہے کہ اولاد ہوئی تو ایک بچہ اللہ کی راہ میں شہادت کے لیے پیش کریں گے۔ میں چاہتا ہوں وہ اس ماحول سے دور چلا جائے"

"کیا وہ دور جانے پر رضامند ہو جائے گا؟"

"ابھی اس پر نیا رنگ نہیں چڑھا اس لیے شاید میری بات مان جائے۔ کچھ اور دیر ہو گئی تو بہت مشکل ہو جائے گی"

"مولوی صاحب میرے گھر کا ماحول ایسا ہے کہ میں اسے اپنے پاس نہیں رکھ سکتا"

میں نے محمد شفیق کو دیکھا ہوا تھا۔ اس نے گاؤں کے مڈل سکول سے آٹھ جماعتیں پاس کی ہوئی تھیں۔ ایک عام سا اور سیدھا سادہ دیہاتی لڑکا۔ آنکھوں میں ذہانت کی چمک نہ چہرے پر کسی جذبے کا اثر۔ معمولی قدوقامت اور کمزور صحت۔ میرے خیال میں وہ کسی بھی اہم کام کے لیے مناسب نہ تھا۔ ورنہ میرے پڑوسی کو سیکورٹی گارڈ کی ضرورت تھی مگر میرے خیال میں اس بے چارے سے تو بندوق بھی نہ اٹھائی جاتی۔ پھر بھی میں نے مولوی صاحب کا دل رکھنے کی خاطر کہہ دیا کہ میں اس کے بارے میں سوچوں گا۔

لیکن افسوس میں اپنا وعدہ پورا نہ کرسکا بلکہ بھول ہی گیا۔ لیکن جب باباجان کی زبانی مجھے اس کے جہاد پر جانے کی تفصیل کا پتہ چلا تو بہت دکھ ہوا اور وہ تصور میری آنکھوں میں ہمیشہ کے لیے منجمد ہو گیا جب وہ آخری رات صبح تک ماں کے قدموں میں بیٹھا اجازت طلب کرتا رہا۔ مولوی صاحب نے تو اللہ کی رضا سمجھ کر جلدی ہار مان لی تھی مگر ماں کس دل سے اپنے جگر گوشے کو، جس کی شہادت یقینی تھی، جانے دیتی۔ اصرار اور استقامت کے درمیان رات بھر مقابلہ جاری رہا۔ ماں روتی اور بیٹا التجائیں کرتا رہا۔ آخر مجبور ہو کر ماں نے بھی ہار مان لی اور ہچکیوں کے ساتھ اسے اللہ کے سپرد کر دیا۔

میرا اس کی تعزیت کے لیے گاؤں جانے کا ارادہ بھی تھا مگر سوچتا تھا، مولوی صاحب کا سامنا کیسے کروں گا۔ ان کی بجھی ہوئی اور ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں میری نظروں میں گھوم گئیں۔ میں نے خیالات کو جھٹک کر اس کا تعارف اور وصیت نامہ پڑھنا شروع کر دیا۔ جو میں یہاں من و عن نقل کر رہا ہوں۔ میں نے البتہ مصلحتاً بعض نام اور مقام تبدیل کر دیے ہیں۔

تعارف۔ شہید ابوساویہ یا محمد شفیق شہید اٹھارہ سال پہلے ماہ صیام میں بروز جمعۃ المبارک منڈی جیم الف ضلع شیخوپورہ کے ایک نواحی گاؤں میں پیدا ہوئے۔ آٹھویں جماعت تک تعلیم گاؤں کے سکول سے حاصل کی۔ دنیاوی تعلیم اور معاملات سے دل اُچاٹ رہتا تھا۔ مذہبی گھرانے سے تعلق کی بنیاد پر دین اسلام سے بے حد لگاؤ رکھتے تھے۔ پانچ وقت نماز کے تو وہ بچپن ہی سے پابند تھے۔ اکثر جہادی رسائل کا مطالعہ نہ صرف باقاعدگی سے بلکہ بے حد شوق سے کرتے تھے۔ ایک بار رمضان کے آخری عشرے میں اعتکاف میں تھے جب حاملین کتاب و سنت کے دعوتی پروگرام سے شناسائی ہوئی اور آپ کے اندر جذبہ جہاد فی سبیل اللہ نے گھر کر لیا اور آپ جہادی راہوں پر عازم سفر ہوئے۔

چند ماہ بعد دور کے ایک چچا محمد یحیٰی کے ساتھ عسکری تربیت کے لیے ایک جہادی معسکر پہنچے۔ عسکری تربیت کے تمام مراحل بڑی کامیابی کے ساتھ طے کیے۔ دورہ خاصہ کی تکمیل کے ساتھ ہی جذبہ شہادت دل میں موجزن ہوا۔ گم صم رہنے لگے۔ اداسی کی وجہ پوچھی گئی تو کہنے لگے "ادھر کشمیر میں ہماری مسلمان مائیں بہنیں، ہندوؤں کے رحم و کرم پر ہیں اور افغانستان میں ہمارے مظلوم بھائی اسلام کے ناتے سے ہمیں مدد کے لیے پکار رہے ہیں۔ میں یہاں چین سے کیسے بیٹھ جاؤں"

ابوساویہ مظلوم بھائیوں کی مدد کے لیے وہاں پہنچنے کا مصمم ارادہ کر چکے تھے۔ والدین سے اجازت طلب کی۔ نیک اور صالح والدین نے پہلے تو روکا مگر جب اندازہ ہوا کہ رکنے والے نہیں تو اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی کے لیے اپنے شیر دل مجاہد بیٹے کے عظیم جذبے کی قدر کرتے ہوئے اجازت دے دی تاہم خواہش کی کہ بیٹے مزید چند دن رک جاؤ اور پھر چلے جانا۔ اس پر ابوساویہ

نے جواب دیا ''مجھے تو پہلے ہی دیر ہو گئی ہے، جس قافلے کے ساتھ میں نے روانہ ہونا ہے وہ قافلہ چلا جائے گا اور میں پیچھے رہ جاؤں گا''

کتاب و سنت کا یہ داعی، اسلام کا سپاہی سولہ اگست کو اپنی مطلوبہ منزل کی طرف روانہ ہو گیا اور اپنے قافلے کے ساتھ مل کر بتوں کے پجاریوں کو واصل جہنم کرنا رہا اور بالآخر اُسی سال سولہ نومبر رات قریباً دس بجے دشمن فوج کے ساتھ شروع ہونے والی اور رات بھر جاری رہنے والی جھڑپ کے دوران مجاہدین کے قافلے کو الوداع کہتے ہوئے شہیدوں کے قافلے سے جا ملے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ان کا یہ وصیت نامہ ملاحظہ کیجئے:

وصیت نامہ شہید ابو سلویٰ نائی محمد امین رحمۃ اللہ علیہ

میرے پیارے والدین، عزیز بھائیو اور علاقہ کے لوگو!

جب آپ کے پاس کاغذ کا یہ ٹکڑا پہنچے گا، انشاء اللہ میں اللہ تعالیٰ کی بلند درجات والی جنت میں پہنچ چکا ہوں گا۔ میری شہادت کی خبر سن کر پریشان نہیں ہونا بلکہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا اور شکرانے کے دو نفل ادا کرنا۔ قرآن مجید سے ثابت ہے کہ شہید زندہ ہوتا ہے اور شہید کو مردہ کہنے سے منع فرمایا ہے۔

میرے پیارے والدین اگر میں ساری زندگی آپ کے پاؤں دھو دھو کر پیتا رہتا، کندھوں پر اٹھا کر خانہ کعبہ کا طواف کرواتا رہتا پھر بھی آپ کا حق ادا نہ کر سکتا لیکن شہادت سے اُمید ہے قیامت کے دن آپ کے احسانات کا کچھ بدلہ چکانے کے قابل ہو سکوں گا اور جنت کے دروازے پر آپ کا انتظار کروں گا۔ کیوں کہ مجھے ستر (۷۰) شہزادوں کی سفارش کرنے کا اعزاز ملے گا بشرطیکہ وہ شرک نہ کرتے ہوں۔ پیارے والدین اگر میری زندگی تیرہ سو سال بھی ہو جاتی تو پھر بھی موت آنی تھی لیکن ایسی موت ہر کسی کو نصیب نہیں ہوتی۔ میری پیاری ماں مجھ کو تیری دعا چاہیے۔ اگر مجھ کو شہادت کی موت آئے تو رو کیا چاہیے

اگر میرا کوئی پوچھے تو اس کو میرا سلام کہنا۔ آپ لوگ اپنی زندگیوں کو نبی کریم ﷺ کی زندگی کی طرح ڈھال لو۔ عزیز بھائیو فرض نماز کو ہرگز نہ چھوڑنا۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے یعنی کہ جس آدمی نے نہ جہاد کیا اور نہ ہی ارادہ کیا وہ ایک منافق کے شعبہ پر مرے ''اے مسلمانو تم پر قتال یعنی لڑائی کرنا فرض کر دیا گیا ہے''

پیارے والدین قرآن مجید میں ایک دفعہ ہی نہیں بلکہ تقریباً سات سو پچاس آیات میں اللہ تعالیٰ نے مجاہدین کی شان بیان کی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے قرآن مجید میں فرمایا ہے کہ ''ہلکے ہو یا بوجھل اللہ کی راہ میں جہاد کے لیے نکلو، اپنی جانوں کو لے کر اپنے مالوں کو لے کر''۔ ایک اور مقام پر فرماتے ہیں'' اگر تم اللہ کی راہ میں جہاد کے لیے نہ نکلو تو اللہ تعالیٰ تم کو دردناک عذاب دے گا اور تمہاری جگہ اور قوم کو لے آئے گا اور تم اللہ کا کوئی نقصان نہیں کر سکتے۔''

آج دنیا کی تمام کافر طاقتیں اسلام کو مٹانے کے لیے اپنی پوری کوشش کر رہی ہیں۔ آج مسلمان مظلوم ہے۔ آج کشمیر کی طرف دیکھ لیں۔ فلسطین، عراق اور افغانستان کی طرف دیکھ لیں۔ مسلمان بہنوں اور ماؤں کی عزتوں کو پامال کیا جا رہا ہے۔ مسلمان بوڑھوں اور بچوں کو بے گناہ شہید کیا جا رہا ہے۔ وجہ کیا ہے۔ یہی کہ وہ بھی لا الہ الا اللہ پڑھتے ہیں۔ یاد رکھیں اگر آج ہم نہ نکلے تو کل وہ ہمارے گھروں پر بھی چڑھنے والے ہیں۔ لہٰذا جان اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں آنے کا مقصد بھی بیان کیا ہے کہ ''میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف اپنی بندگی کے لیے پیدا کیا ہے''

عزیز بھائیو ہر چیز سے بہتر اللہ تعالیٰ کا ذکر ہے۔ میں اپنی بہنوں سے پردے کی تاکید کرتا ہوں۔ کہ وہ اسلام کے مطابق اپنے پردے اپنائے رکھیں۔ ان کی شادی انشاء اللہ اسلام کے مطابق کرنی ہوگی۔ میں نے جس کسی کا قرض دینا ہے وہ بھی ادا کر دیں۔ ہمیں اس دنیا سے کیا لینا مشن شہادت اپنا ــــــ پہاڑوں پہ دفن ہوں گے کفن ہو گا برف اپنا

جب یہ کاغذ کا ٹکڑا آپ کے ہاتھ میں آئے گا آنسو نکلیں گے کہ یہ ایک فطری بات ہے لیکن میرے والدین صبر کے دامن کو نہ چھوڑنا۔ امی جان تجہیز کے وقت ضرور دعا کیں کرنا کہ اللہ تعالیٰ میری شہادت کو قبول فرمائے۔ آتے وقت جس عزیز سے میری ملاقات نہیں ہو سکی۔ اس سے معافی کا خواستگار ہوں۔ باقی جو گاؤں والے اور عزیز و اقارب مجھ سے محبت کرتے ہیں انشاء اللہ میری شہادت کا ضرور ان ظالموں سے بدلہ لیں گے انشاء اللہ۔

آئے تھے ہم دنیا میں سیر کرنے سیر گلشن کر چلے۔ مالی یہ باغ سنبھال اپنا ہم مسافر گھر چلے

میرے عزیز بھائیو داڑھیوں کو اللہ کے لیے معاف کر دینا۔ شلواروں کو ہمیشہ ٹخنوں سے اوپر رکھنا۔ قرآن مجید کی تلاوت کو صبح و شام کیا کرو کیوں کہ ہر چیز سے بہتر اللہ کا ذکر ہے۔ اگر کوئی غلطی ہو گئی ہے تو اللہ کے لیے معاف کر دینا میرے لیے زیادہ سے زیادہ دعا کریں۔ اللہ مجھ کو دشمن کی قید سے محفوظ کرے اور اللہ مجھ سے راضی ہو جائے اور شہادت کی موت نصیب فرمائے۔ میری یادوں کو سینے سے لگائے رکھنا۔ اگر آنسو آئیں تو آنسوؤں کو دبائے رکھنا۔ اگر شہیدوں سے جاملوں تو لبوں پہ دعا رکھنا میری شہادت پہ صف ماتم نہ بچھانا۔ واپسی کا ایڈریس جنت الفردوس انشاء اللہ۔ ابو سلویٰ محمد امین شہید رحمۃ اللہ علیہ

آپ کا پیارا بیٹا

(دستخط)

محمد امین ابو سلویٰ نائی

محمد امین کی شہادت کے بارے میں ساری تفصیل مجھے پہلے سے معلوم تھی۔ پھر بھی وصیت نامہ پڑھ کر بہت ملال ہوا اور اپنی کوتاہی پر ندامت بھی

سال کا وصیت نامہ اگرچہ اس کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا نہیں بلکہ ٹائپ شدہ تھا اس لیے یہ کیسے معلوم ہوتا کہ اس کے اپنے خیالات اور جذبات کیا تھے لیکن یقیناً ان سے ملتے جلتے ہی ہوں گے جن کا اس میں اظہار کیا گیا تھا۔

میں چونک پڑا۔ قاری صاحب مسجد سے واپس آ گئے تھے۔

ابا جان نے بھی اشارہ کیا تھا اور پہلے میرا بھی یہی خیال تھا کہ ان کے آنے کا مقصد مالی امداد اور چندے کے علاوہ کیا ہو سکتا ہے بلکہ میں نے تو انہیں دیکھ کر ہی دل میں چندے کی ایک خاص رقم مدرسے کے لیے مختص بھی کر لی تھی۔ لیکن اب مجھے تشویش ہونے لگی۔ مجھے وصیت نامہ پڑھانے کا کیا مقصد؟ میں ڈر رہا تھا کہ اگر انہوں نے کوئی ایسا کام بتایا جو میری اوقات یا بس سے باہر ہوا تو کیا کروں گا۔ لیکن انہوں نے بغیر کسی تاخیر اور توقف کے کہا:

''جیسا کہ آپ جانتے ہوں گے اور اب پڑھ بھی چکے ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ جل شانہٗ نے حضرت مولانا سراج الدین صاحب کے ایک شاگرد رشید حضرت ابو معاویہ ثانی شہید کے درجات بلند کیے اور شہادت قبول کی ہے۔ وہ جنت کے باغ میں مولانا کے دوسرے کچھ شہید شاگردوں کے ساتھ قصر نور میں قیام فرما ہیں۔ مولانا صاحب جمعرات کو مراقبہ فرماتے ہیں اور اللہ رب العزت کے حکم سے ان کا رات بھر آسمان سے رابطہ رہتا ہے۔ اس بار امام الشہداء نے خاص طور پر انہیں حضرت ابو معاویہ ثانی شہید کے مزار مبارک کی تعمیر کا ارشاد فرمایا۔ علاقے کے ایک بڑے زمیندار چوہدری غلام حسین نے مزار اور عرس مبارک کے لیے مطلوبہ زمین مہیا کر دی ہے۔ اس کی بابرکت تعمیر کا شرف آپ کے حصے میں آیا ہے۔ یہ اس کا نقشہ ہے۔''

انہوں نے جیب سے ایک کاغذ نکال کر مجھے دیا اور بولے

''اب آپ جانیں اور مولانا صاحب جانیں۔ میرا فرض ادا ہوا۔ مجھے اجازت۔ اللہ آپ کو خوش رکھے''

میں نے نقشے پر ایک نظر ڈالی اور میرا سر گھوم گیا ''اس پر تو بہت خرچ آئے گا۔ میری یہ بساط کہاں!''

وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ بولے ''مولانا صاحب کو ہر بات کی خبر ہوتی ہے۔ وہ کسی پر غیر ضروری بار نہیں ڈالتے''

''لیکن میں ہوں۔ آمدنی والا سرکاری ملازم!''

''آپ کو امریکی امداد ملتی ہے۔ مولانا سے کوئی بات پوشیدہ نہیں ہے'' وہ معنی خیز انداز میں مسکرائے ''حلال ہو جائے گی''

''شاید آپ کا اشارہ میرے بھائی کی اس مالی امداد سے ہے جو وہ امریکہ سے کبھی کبھار بھجوا دیتا تھا۔ مگر شاید مولانا صاحب کو علم نہیں کہ وہ کچھ عرصے سے خود امریکیوں کی حراست میں ہے''

''دیکھیے میرا کام تو مولانا صاحب کے ارشاد کی تعمیل تھی۔ وہ میں نے کر دی۔ آپ میں ہمت ہے تو نافرمانی کر کے دیکھ لیجیے۔ السلام علیکم۔ اللہ حافظ''

یہ کہہ کر وہ باہر نکل گئے۔ میں بہت سا تھا نہیں جاتا ہوا بیٹھا رہ گیا۔

اس بات کو تین روز ہو گئے ہیں لیکن اب بھی یوں لگتا ہے جیسے انہوں نے میرے لاشعور کی گھنٹی کے بٹن پر مسلسل ہاتھ رکھا ہوا ہو اور وہ بجے جا رہی ہو۔ اور جس طرح برسوں سے پتھر کے زمانے میں بھیج دینے کی امریکی دھمکی پاکستانی قوم کے اجتماعی حافظے میں گونج رہی ہے اسی طرح گزشتہ تین روز سے قاری صاحب کا آخری جملہ میرے کانوں میں گونج رہا ہے ''آپ میں ہمت ہے تو نافرمانی کر کے دیکھ لیجیے''۔

☆

بقیہ: فاتح اور مفتوح

حسرات کیا پسند نہیں کرتے تھے اب بربری کی سطح پر آ کر ساحلات کر رہے ہیں۔ زرمبادلہ کے ذخائر بہت جلد بڑھنے والے ہیں۔ ترقی کی تیز رفتاری بہت جلد ہمیں وہ مقام دلا دے گی جو خطے میں کسی اور کو حاصل نہ ہو گا۔ خوشحالی بہت جلد ہمارے قدم چومنے کو بے تاب ہو جائے گی۔ مطمئن رہیے! ہم ہیں نا! آپ کی خدمت کے لیے!

تالیوں کی تیز آواز میں 'زندہ باد' 'مبارک باد' 'بہت عمدہ' اور 'لاجواب' کی لے میں لے ملاتے ہوئے میزبان کھانا تناول فرمانے کی زحمت کے لیے مہمانوں کو پکار رہے ہیں۔ تمام مہمان سدھائے ہوئے پالتوؤں کی طرح کھانے پر اس طرح ٹوٹ پڑے ہیں جیسے دشمن کی فوج پر ٹوٹا جاتا ہے۔ چند لمحے قبل نظر آنے والے سیخ کباب، کڑاہی گوشت، روسٹ چکن، فرائی مچھلی، مٹن بریانی، زعفرانی قورمہ اور شاہی نان کے پہاڑ پسپائی اختیار کر چکے ہیں۔ اب ان کا نشان ڈھونڈنا اسی طرح محال ہے جس طرح گم گشتہ قوموں کی تہذیب، تاریخ اور آثار قدیمہ ہوا کرتے ہیں! کیوں نہ ہو ایک وقت میں ایک فاتح اور ایک مفتوح ضرور ہوا کرتے ہیں۔ ہماری نظروں کے سامنے ایک سے ایک بڑا فاتح مسرور و مطمئن ہو کر جا رہا ہے جبکہ ہم آج کے حادثے کے رد عمل میں رونما ہونے والے اندیشوں اور امکانات پر نوحہ کناں ہونے کے لیے کسی ہمدرد و غم گسار کی تلاش میں ہیں جس کے بطن سے مستقبل قریب و بعید میں 'خدا معلوم' کیا افسانے تراشے جائیں گے، کس رنگ میں تراشے جائیں گے....؟ اور کس کس کے نامہ اعمال میں ڈالے جائیں گے....؟

☆

مراجعت

عذرا اصغر (کراچی)

آج عدیم کو لینے ہم میں سے کوئی بھی ایئر پورٹ نہیں گیا۔ حالانکہ پورا خاندان بے چینی سے اس کا منتظر تھا۔ دس سال پہلے جب وہ بیرون ملک روانہ ہو رہا تھا تو ایئر پورٹ پر خاندان کے علاوہ احباب کا بھی ہجوم غفیر تھا۔ اصل میں عدیم بچپن سے ہی سب کا فیورٹ بچہ ہوا تھا۔ لاڈلا گھر میں۔ جب عدیم کے بارے میں سوچتی ہوں تو میری آنکھوں میں اس کے باپ کا بچپن گھومنے لگتا ہے۔

جمیل نام کا ہی جمیل نہیں تھا شکل و صورت اور عادات و اطوار میں بھی جمیل تھا۔ بالکل جیسے چینی کا گڈا ہوتا ہے معصوم بھولا بھالا۔ اس کے چہرے پر ہمیشہ مسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی اور آنکھوں میں شرارت اور تجسس۔ یوں وہ کم بولتا تھا۔ گرمیوں کی چاندنی راتوں میں گھر کے بڑے سے آنگن کے ایک کونے میں باقی گھر کے لوگوں سے ہٹ کر ہم لڑکیاں تخت پر بیٹھ کر گھنٹوں گپ بازی کرتے۔ باری باری گانے گاتے اور خوب ایک دوسرے کو داد دیتے۔ ہم چار لڑکیاں تھیں اور ہم سب ایک دوسرے کے حسن کی تعریفیں کرتے مگر قمر ہم سب میں منفرد طور پر حسین قرار پائی تھی عمر کے لحاظ سے بھی وہ تھوڑی ہم میں بڑی تھی اور عقلمند بھی۔ لیکن ہم سب کے ذہن یکساں طور پر رومانٹک تھے۔ بارش میں بھیگنا۔ چاندنی میں پہروں بیٹھے رہنا۔ پھولوں کو دو انگلی سے تکنا۔ ہم سب کا مشغلہ تھا۔ قمر ان دنوں سیکنڈ ایئر کی طالبہ تھی اور ہم باقی ترتیب وار نویں جماعت تک طالبات تھیں۔ زندگی ہمارے لئے بےحد رومان پرور تھی۔ قمر اور شمسہ گجرات میں رہتی تھیں اور کبھی چھٹیوں میں یا کبھی ویسے بھی ہمارے شہر میں آ جایا کرتی تھیں۔ قمر اپنی خالہ کے بیٹے سے مانگی ہوئی تھی اور شمسہ بھی اسی کے چھوٹے بھائی سے۔ اگرچہ دونوں کو اپنے منگیتر ناپسند تھے مگر جائیداد کے سبب شادی لازمی تھی۔ ہم بڑے اشتیاق اور تجسس سے قمر سے دریائے چناب کا پوچھتے جس میں سوہنی کا کچا گھڑا بہہ گیا تھا وہ کہتی۔ "جب پورن ماشی کی رات ہوتی ہے تو دریا پر سے گزرتی ہوا کی لہریں آوازوں میں ڈھل جاتی ہیں اور سوہنی۔ سوہنی کی صدائیں سنائی دیتی ہیں۔"

"اللہ! ہم کتنے متاثر ہوتے۔ سوہنی کی بے بسی پر آنکھیں چھلک پڑتیں۔"

لیکن تمام وارداتوں میں جمیل ہمارے پاس بیٹھا رہتا اور ہمیں کبھی اس کی موجودگی کا احساس نہ ہوتا۔ جب رات بھیگ جاتی اور پُروائی سسکیاں بھرنے لگتی تو ہماری محفل اختتام پر پہنچتی۔ ایسے ہی ایک دفعہ سب اٹھنے لگے تو جمیل نے بے اختیار اپنے چھوٹے سے ہاتھ سے قمر کی کلائی پکڑ لی۔ بولا "قمر باجی! آپ جانے لگتی ہیں تو میرے دل کو کچھ کچھ ہونے لگتا ہے۔ نہ جایا کریں آپ۔" جمیل کی بات پر ہم سب اتنا ہنسے کہ ہمارے آنکھوں سے پانی بہہ نکلا۔ اور قمر نے جھک کر جمیل کا گال چوم لیا۔

وقت جانے کیسے بے دھیانی میں ہمارے پیروں تلے سے کھسکتا گیا۔ پتہ نہیں ہم کب بڑے ہو گئے جانے کیسے چپکے چپکے زندگی کی تلخ اور بے رحم حقیقتیں ہمارے سامنے آن کھڑی ہوئیں۔ سارا کا سارا رومانٹک ازم اڑنچھو ہو گیا اور ہم سب زندگی کے گھمبیر مسائل میں الجھتے چلے گئے۔ کبھی اطمینان سے بیٹھ کر بچپن اور جوانی کے ابتدائی ایام کو یاد کرنے کی بھی فرصت میسر نہ آ سکی۔

عدیم، جمیل کی طرح معصوم بھولا اور سب کا دل جیت لینے والی شخصیت کا لڑکا تھا۔ وہ سب کا کام بھاگ بھاگ کر کرتا۔ پکارا کسی دوسرے بچے کو جاتا اور حاضر عدیم ہو جاتا۔ اس کا اسکول زاہد کے دفتر کے راستے میں آتا تھا اس لئے زاہد اسے اسکول چھوڑتے ہوئے اپنے دفتر جاتے۔ راستہ بھر عدیم ان سے باتیں کرتا جاتا۔ وہ اپنے باپ کے برعکس باتونی تھا۔ کسی دن پاس سے گزرتی گاڑی کو دیکھ کر عدیم نے پوچھا۔

"یہ کونسی گاڑی ہے خالو جان۔"

"مرسیڈیز ہے" زاہد نے کہا "ابھی چند روز پہلے ہی تو میں نے خریدی تھی پھر اس بندے کو دیدی کہ جا بھائی عیش کر"

"ایں؟ آپ نے دیدی۔ مفت؟" عدیم نے حیرت سے پوچھا

"ہاں۔ دیدی۔ بیچارا غریب آدمی تھا" زاہد نے کہا۔ پھر گزرتی کرولا کو دیکھ کر بولے

"یہ بھی میں نے ہی لے کر اسے دی ہے"

عدیم تھوڑی دیر چپ بیٹھا رہا۔ پھر بولا۔

"آپ گاڑیاں یونہی بانٹ دیتے ہیں؟"

"ہاں تو کیا کروں؟ اتنی بہت سی گاڑیاں رکھ کر کیا کروں گا؟"

اس روز عدیم اسکول سے آتے ہی اپنے باپ سے گڑگڑا رہا اور روتے ہوئے شکایتاً کہا "خالو جان نے اتنے لوگوں کو گاڑیاں بانٹیں کیا وہ ہمیں بھی ایک مرسیڈیز نہیں دے سکتے تھے" عدیم کا یہ واقعہ خاندان میں خوب دلچسپی کا باعث بنا۔

پھر بھاگتے دوڑتے وقت میں عدیم بھی بڑا ہو گیا اور مزید تعلیم کے حصول کے لیے بیرون ملک جانے لگا۔ جمیل نے بیٹے کے اخراجات پورے کرنے کے لیے اپنا گھر کرائے پر اٹھایا اور خود سرکاری گھر میں منتقل ہو گیا۔ عدیم اس کی پہلی پہلی اولاد تھا۔ لاڈلا تھا۔ ضرورت تھی اور دلوں میں بھی شاید کچھ امیدیں بھی تھیں۔ یہ امیدیں شاید ہر انسان کو اپنی اولاد سے ہوتی ہیں۔ ہم مشرق کے لوگ امید کے سہارے ہی زندگی کی ناؤ کھیتے چلے جاتے ہیں۔ جانے یہ ہماری فطرت ہے یا ضرورت۔ اور جب امیدوں کا یہ دیئے کچے دھاگے کی طرح

ٹوٹتا ہے تو زندگی کی ساری عمارت ہی ڈھے جاتی ہے۔ ملبے کا ڈھیر بن جاتی ہے
"کیا یہ جبرِ مسلسل صرف مشرقی انسان کی قسمت میں لکھی گئی ہے؟ یا
اس خطے کے باسیوں نے از خود اسے اپنا مقسوم بنا لیا ہے؟"

عدیم نے غیر ملکی یونیورسٹیوں سے تعلیم مکمل کی اور وہیں ملازمت شروع کر دی۔ ماں بولتی رہتی۔

"جانے کیا کرتا ہوگا اکیلا۔ آس پاس نہ کوئی ہولی نہ ہمدم۔ اجنبی ملک، اجنبی لوگ"

پھر اسے ایک امریکن لڑکی سے دل لگا لیا۔ ماں باپ سے اجازت چاہی۔ شادی کر لی۔ ماں کو ایک گونہ اطمینان ہوا 'چلو کوئی تو ہے اکیلا تو نہیں رہا' مگر تھوڑا عرصہ بعد ہی یہ بندھن ٹوٹ گیا اور پھر وہ اکیلا رہ گیا۔ ماں کو فکروں نے آن گھیرا۔ کمپنی نے اسے چین بھیجا۔ اسے چین ہی پسند نہیں آیا چین کی چینوف بھی دل میں اتر گئی۔ ماں باپ تو اس کی دوسری شادی چاہتے تھے۔ لڑکی امریکن ہو یا چینی۔ گھر تو بسا؟ اور گھر بسا تو کمپنی نے اسے واپس بلا لیا۔ چینوف کو امریکہ جانے کی اجازت نہ مل سکی۔ دو دل دور ہو گئے اور ایک گھر دو گھروں میں بٹ گیا۔ وقت کو اس سے سروکار نہیں، کیا ہوا، کیا ہو رہا ہے۔ اس کا کام ہے چلتے چلے جانا سو وہ چپ چاپ آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ خاموش ہمسفر۔ غیر محسوس طریقے سے پٹریاں بدلتا بھاگتا جاتا ہے۔ عدیم نے چینوف سے کہا

"میں واپس جانا چاہتا ہوں تھک گیا ہوں۔ تمہیں بھی پاکستان کا ویزہ آسانی سے مل جائے گا"

"مگر میں وہاں نہیں جا سکتی۔" چینوف نے کہا

"کیوں۔؟"

"کیونکہ پاکستان میں بم پھٹتے ہیں۔ وہاں دہشت گردی ہے" چینوف نے جواز پیش کیا۔

"دہشت گردی کہاں نہیں ہے؟" عدیم نے پوچھا

"چائنا۔ چائنا میں۔ یہاں چلے آؤ تم"

"مگر میں اپنے وطن واپس جانا چاہتا ہوں۔ وہاں میری ماں ہے جو میری راہ دیکھ رہی ہے۔ میرا باپ ہے جو اب بوڑھا ہونے جا رہا ہے۔ وہاں میرا بچپن ہے۔ میں واپس جاؤں گا" اس نے ماں کو بھی کہہ دیا۔

"میں واپس آ رہا ہوں۔ بیٹا تیرے پاس رہنے کے لیے ماں۔"

"وہ خوش ہوئی۔ میرا بچہ واپس آنے والا ہے۔ دس برس کا بن باس کاٹ کے" جمیل نے بتایا وہ اتنی جلدی نہیں آ سکتا۔ آتے آتے بھی اسے سال تو لگے گا ہی۔"

"نہیں۔ وہ جلدی آ جائے گا۔ اسے خود مجھے کہا ہے" ماں وثوق سے کہتی رہی۔ اور اب جمیل متردد ہے۔ فکر مند تھا۔ پریشان تھا۔

عدیم کئی دن سے فون نہیں اٹھا رہا تھا۔ آنسرنگ مشین پر وہ متعدد بار میسج ریکارڈ کرا چکا تھا۔

"بیٹا تم کہاں ہو؟ خیریت کی اطلاع دو۔ ہم پریشان ہیں۔"

آنسرنگ مشین اسکے پیغامات وصول کرتی رہی۔ وہ مشین تھی جواب دینے کی قدرت نہیں رکھتی تھی۔ صرف پیغام وصول کرنے کی صلاحیت اس میں فیڈ کی گئی تھی۔ نیٹ پہ کال چیک کرتے ہوئے جمیل کو اسلامک سینٹر سے پیغام ملا۔

"مسٹر جمیل! ہمیں افسوس ہے بیشک یہاں مسلم مرد تھا لیکن گمنام تھا۔ اور مسٹر عدیم شاید دو دن یہاں پڑے رہے۔ جانے روڈ ایکسیڈنٹ کے بعد وہ گھر تک کیسے پہنچے تھے۔ آپ اجازت دیں تو ہم یہیں ۔۔۔۔ حالت صحیح نہیں ہے ۔۔۔۔ ڈیڈ باڈی کی"

جمیل کے کانوں میں سائیں سائیں کی آوازیں آ رہی تھیں اور آنکھوں میں دھواں تھا۔

"ابھی تو دن نکلا تھا یہ رات کیسے ہو گئی؟ عدیم تم آؤ نا واپس آؤ"

آج گیارہ بجے عدیم واپس آ رہا تھا۔ اسے صرف چار آدمی ایئر پورٹ لینے گئے تھے۔ وہ دس برس کا بن باس کاٹ کے لوٹا تھا۔

بڑے کمرے میں سفید بچھی چاندنیوں پر وہ آہنی صندوق دھرا تھا جس میں ایک فٹ بہ مربع شیشہ جڑا تھا۔ کوئی دراز تھی۔ وہ مربعی لوہے کا صندوق تھا۔ کہتے ہیں اس میں عدیم سویا پڑا ہے۔ پتہ نہیں ۔۔۔۔!

☆

"میری دادی جرمن فوج کے ہاتھوں اس لئے مری تھی کہ اس کی نسلوں کے وارث ایک دن ہٹلر کے فوجیوں کی طرح فلسطینیوں کے نہتے اور بے بس مردوں، عورتوں اور بچوں کو پوری دنیا کے سامنے قتل کرتے رہیں! جو کچھ ہٹلر نے یہودیوں کے ساتھ کیا تھا آج وہی کچھ یہودی فلسطینیوں کے ساتھ کر رہے ہیں۔ نہتے اور بے گناہ فلسطینی اگر دہشت گرد ہیں تو پھر ہٹلر کے ہاتھوں مارے جانے والے یہودی بھی بڑی آسانی سے دہشت گرد قرار دیے جا سکتے ہیں!!"

یہودی نژاد برطانوی رکن پارلیمنٹ
(جیرالڈ کوفمین)

خوابوں کا آسمان

مراق مرزا (ممبئی، بھارت)

والدین نے اس کا نام شاہین رکھا تھا۔ شاید یہ اس کے نام کا اثر تھا کہ زمین اسے پسند نہ تھی۔ اسکے ذہن میں ہر وقت آسمان بسا رہتا تھا۔ وہ خود کو آسمان کی بلندیوں پر اڑتا ہوا دیکھنا چاہتی تھی۔ اور یہ کوئی غیر فطری بات بھی نہ تھی۔ بلند پروازی کی چاہ تو ہر پرندہ کی فطرت ہوتی ہے۔ اور وہ تو شاہین تھی جو اوروں سے بہت مختلف تھی۔ پھر اچانک ایک دن اس کی چاہت رنگ لائی اور قدرت نے اسے پر عطا کر دیے۔ وہ پرواز کرنے لگی۔ زمین سے ناطہ توڑ کر آسمان سے رشتہ جوڑنے لگی۔

پچھلے کئی دنوں سے وہ خوابوں کے آسمان میں محو پرواز تھی۔ وہ اس کے خوابوں کا ایک دلکش آسمان تھا جس کے سائے میں اس نے اپنے لئے ایک بے حد خوبصورت کائنات کا تصور کیا تھا۔ ایک ایسی کائنات جو اس وقت اس کے لئے جنت کے تصور سے بھی زیادہ حسین اور رنگین تھی۔ جب کسی دوشیزہ کے دل کے آنگن میں محبت کا چاند اتر آتا ہے تو اس کی کائنات خود بخود خوشنما اور دلفریب حسن کے بے شمار رنگوں سے بھر جاتی ہے اور یہ دنیا اسے جنت سے بھی زیادہ خوشنما دکھائی دینے لگتی ہے۔

شاہین بھی اپنے اندر ایک خوشبو محسوس کر رہی تھی۔ محبت کی پرکیف خوشبو جس کے احساس کے ساتھ ہی اسے لگا جیسے اس کی پشت پر دو بڑے سے پنکھ لگ گئے اور وہ دھرتی سے اڑ کر آکاش میں پہنچ گئی۔ گزرتے ہوئے لمحوں کے ساتھ اس کے احساس کی زمین پر ایک عجیب سا سرور پھیلتا جا رہا تھا اور سانسوں کی وادیوں میں دھیرے دھیرے کوئی اترتا جا رہا تھا۔ اور وہ بے بس تھی۔ جو کچھ بھی ہو رہا تھا اسے روکنے سے قاصر تھی۔

قریب دس دن قبل کسی پرائیویٹ پارٹی میں ایک دوست کے ذریعے اس کا تعارف اقبال دانش سے ہوا تھا اور دانش پہلی ہی نظر میں آنکھوں کے راستے اس کے دل میں سما گیا تھا۔ یہ اکثر کہا جاتا ہے کہ محبت بے زبان ہوتی ہے اور اظہار محبت کے لیے آنکھیں زبان بن جاتی ہیں۔ شاہین کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ بغیر زبان کے سہارے پل بھر میں دل سے دل تک کا سفر طے ہو گیا۔ پہلی ملاقات میں ہی وہ اقبال پر اپنا دل ہار بیٹھی۔ اقبال چیز ہی کچھ ایسی تھی۔ لمبا قد، کسرتی جسم اور شکل و شباہت ایسی کہ اس کے سامنے کوئی فلمی ہیرو بھی ہیچ اور کمتر نظر آتا۔ سیاہ سوٹ میں ملبوس وہ پارٹی میں موجود تمام لوگوں سے الگ دکھائی دے رہا تھا اور نو خیز حسیناؤں کے ساتھ ساتھ شادی شدہ عورتوں کی نگاہوں کا مرکز بھی بنا ہوا تھا۔ اس کی شخصیت اور طرز تکلم میں کچھ ایسا طلسم تھا کہ دو چار باتیں کر کے کوئی بھی شخص اس سے متاثر ہو سکتا تھا۔ لہذا شاہین بھی خود کو روک نہیں پائی۔ اسے لگا کہ اقبال ہی اس کا Prince Charming ہے۔ اس کے خوابوں کا شہزادہ ہے جسے خالق کائنات نے بطور خاص اس کے لیے خلق کر کے اس کی کائنات میں بھیجا ہے۔ مستقبل کے سارے سپنے وہ اقبال کے ساتھ سجانے لگی۔

"زندگی میں آج تک میں پہلی ملاقات میں کسی لڑکی کے اتنے قریب نہیں آیا!"

"اب تک کتنی لڑکیاں آ چکی ہیں تمہاری زندگی میں؟!"

"ٹھیک سے یاد نہیں ـــــ پھر بھی دس بارہ لڑکیاں تو ہوں گی ہی ـــــ کچھ یہاں ـــــ کچھ لندن میں۔"

"پھر تو بہت بڑے Womenaizer ہو تم!!"

"غلط سمجھا تم نے ـــــ حالانکہ میری تعلیم و تربیت انگلینڈ میں ہوئی ہے۔ کئی سال میں نے امریکہ میں بھی گزارے ہیں اس کے باوجود وہاں کی تہذیب اور واہیات اسٹائل سے خود کو بچائے رکھا ـــــ چاہتا تو بے شمار لڑکیوں کے ساتھ جسمانی رشتہ قائم کر سکتا تھا مگر میں نے ایسا کچھ کیا نہیں۔ دراصل مجھ میں ایک بہت بڑی کمی ہے"

"کمی ہے؟! ـــــ کیا تم ـــــ؟!!"

"نہیں! ـــــ تم جو سوچ کر چونک گئی ایسا کچھ بھی نہیں ہے بات یہ ہے کہ میں کسی ایسی لڑکی کے ساتھ ہم بستر ہو ہی نہیں سکتا جس سے مجھے محبت نہ ہو!! ـــــ میری نظر میں جسموں کے ملن کے لیے محبت شرط ہے ـــــ محبت ہی عورت اور مرد کے رشتے کو تقدیس و تکریم عطا کرتی ہے ورنہ بقول جارج برنارڈ شا Marriage is a legal prostitution! شادی قانونی طور پر جائز جسم فروشی ہے۔ میرا خیال ہے محبت کے بغیر کسی لڑکی کے ساتھ بستر پر جانا کسی لاش کے ساتھ رات گزارنے کے مترادف ہے"

اقبال دانش کے ساتھ شاہین کی یہ پانچویں یا چھٹی ملاقات تھی۔ اس وقت وہ دونوں ممبئی کے جوہو بیچ پر واقع پانچ ستارہ ہوٹل Holyday Inn کے کافی شاپ میں بیٹھے کافی کی چسکیوں کے ساتھ نہایت بے تکلفانہ انداز میں باتیں کر رہے تھے۔ محبت اور جسمانی رشتے سے متعلق اقبال کے خیالات و نظریات نے اسے بے حد متاثر کیا تھا۔

اس کے پاپا ایک ملٹی نیشنل بینک میں چیف اکاؤنٹنٹ تھے اور ممی ایک چھوٹا سا بوتیک چلاتی تھیں۔ اس کی ایک بڑی بہن بھی تھی۔ شازیہ جو انگریزی میں پوسٹ گریجویٹ کرنے کے بعد شہر کے ڈی این کالج میں لیکچرر ہو گئی تھی۔ علاوہ ازیں اس نے جے جے اسکول آف آرٹس سے پینٹنگ میں ڈپلوما بھی کیا تھا۔ اور اکثر اوقات فرصت کے لمحات میں وہ اپنے احساسات و

خیالات کو مختلف رنگوں کے ذریعے کینوس پر اتارا کرتی تھی۔ اس نے اپنی خواب گاہ کو ایک چھوٹے سے اسٹوڈیو میں تبدیل کر دیا تھا۔

بلاشبہ میری بستی کے چند گنے چنے پاش رہائشی علاقوں میں سے ایک ہے۔ اسی علاقہ کی ایک آسمان چھوتی ہوئی بلڈنگ کی بارہویں منزل پر تین بیڈ روم اور ایک بڑے سے ہال پر مشتمل عالیشان فلیٹ میں وہ اپنے ممی پاپا اور بڑی بہن کے ہمراہ رہتی تھی۔ فلیٹ کی بالکنی سے بالکل سامنے موجیں مارتا ہوا سمندر دکھائی دیتا تھا۔ اور شام کے وقت جب سورج اپنے پورے دن کی مسافت طے کر کے افق کی آغوش میں اترنے لگتا تو یوں لگتا جیسے وہ بحر العرب میں غرق ہو رہا ہو۔ اس فلک بوس عمارت میں رہائش ہونے کے سبب بھی اس کے خیالات و افکار اور نفسیات پر کچھ اثر پڑا تھا۔ وہ خود کو زمین سے بہت اوپر اور آسمان سے بالکل قریب محسوس کرتی تھی۔ جب بھی وہ اپنی بالکنی سے غروب آفتاب کا منظر دیکھتی تو اسے لگتا وہ آسمان کی بلندی پر ہے اور سورج اسے بہت پستی میں دکھائی دیتا۔

وہ اپنے پاپا ممی اور بہن شازیہ کی بڑی لاڈلی تھی۔ سبھی اسے دل کی گہرائیوں سے پیار کرتے تھے۔ زندگی میں کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ عیش و آرام کی ہر شئے موجود تھی۔ اس نے ایلفنسٹن کالج سے graduation کرنے کے بعد سلسلہ تعلیم ترک کر دیا۔ حالانکہ ممی پاپا اسے اعلیٰ تعلیم کے لیے لندن یا امریکہ بھیجنے کو تیار تھے مگر وہ آگے پڑھائی کے موڈ میں نہ تھی۔ وہ فیشن کی دنیا میں اپنی تقدیر آزمانا چاہتی تھی اور بحیثیت ماڈل اپنا کیریئر بنانا چاہتی تھی۔

وہ Class conscious تھی۔ معاشرتی رتبوں اور درجات کا بڑی حد تک خیال رکھتی تھی۔ اور خود کو ہمیشہ ہائی کلاس سوسائٹی میں شمار کرتی تھی۔ اس کی نگاہ میں دولت کے اعتبار سے انسانوں کی درجہ بندی کوئی غیر فطری بات نہ تھی۔ اس لئے وہ اپنے ملنے جلنے والوں کو ان کے مالی رتبے اور درجے کے مطابق ہی عزت دیا کرتی تھی۔ اس کی شخصیت پر مغرب کا گہرا اثر تھا۔ وہ الٹرا ماڈرن کپڑے پہنتی تھی۔ اس کا رہن سہن کسی بھی طرح ہندوستانی نہ تھا۔ وہ نائٹ لائف کی عادی تھی۔ اکثر دوستوں کے ساتھ اس کی راتیں شہر کے مختلف ڈسکو تھیک اور کلبوں میں گزرتی تھیں۔ اور کبھی کبھار وہ شراب بھی پی لیا کرتی تھی۔ اس کی ممی اور پاپا اس حقیقت سے اچھی طرح واقف تھے۔ اور کبھی کبھی اس کی اس طرز زندگی کے بارے میں سوچ کر فکر مند بھی ہو جاتے تھے مگر اسے کچھ بولنے سے جھجکتے تھے۔ اور پھر وہ اسے رات کی رنگین زندگی سے روکتے بھی کیسے۔ آج شاہین جس ڈگر پر چل رہی تھی وہ تو خود انہوں نے ہی اسے دکھلایا تھا۔ Class-conscious صرف وہ نہ تھی بلکہ اس کے پاپا ممی بھی تھے۔ دراصل مسٹر اور مسز عادل حیات خان بھی خود کو ہائی کلاس سوسائٹی میں شمار کرتے تھے۔

اس کے گھر میں شروع سے ہی روزہ نماز کا کوئی چلن نہ تھا۔ انکا خیال تھا کہ عبادت کا تعلق دل سے ہے اس لئے مذہب کو بھی دل کی دیواروں کے اندر ہی قید رہنا چاہیے۔ مذہب کی نمائش انکی نظر میں ایک جاہلانہ عمل تھا جس کے وہ بالکل قائل نہ تھے۔ ہال کی دیوار پر فریم کی ہوئی قرآنی آیات لگانا بھی وہ معیوب سمجھتے تھے۔ اس کے برعکس انکا ڈرائنگ روم عورت کی متعدد نیم عریاں پینٹنگس جو انہوں نے آرٹ کے نام پر لگا رکھی تھیں، سے آراستہ و پیراستہ تھا۔ عید اور بقر عید کے دن بریانی اور سویاں ضرور بنتی تھیں مگر نماز گھر کا کوئی بھی فرد نہیں پڑھتا تھا۔ اور محرم تو اسکے گھر میں کبھی آتا ہی نہیں تھا۔ سماج میں وہ اپنے آپکو پروگریسو مسلم بتاتے تھے۔

زندگی اور سماج سے متعلق آج شاہین کا جو نظریہ تھا وہ اس کے والدین کی سوچوں کا نتیجہ تھا۔ اور جہاں تک ان کے مالی رتبہ اور درجہ کا سوال ہے تو وہ کسی بھی طرح بستی کی ہائی سوسائٹی کا حصہ نہ تھے۔ حقیقت میں انکی فیملی مڈل کلاس تھی مگر وہ خود کو ہائی کلاس سمجھتے تھے۔ اور اس کے پیچھے ایک خاص وجہ بھی تھی۔ مسٹر اور مسز حیات خان کی دو بیٹیاں تھیں۔ انکا سوچنا تھا کہ اگر وہ خود کو سماج کے سب سے بڑے طبقے میں شمار کریں گے اور انکی تہذیب اور کلچر اپنالیں گے تو انکی بیٹیوں کی شادی بڑی آسانی سے اس سوسائٹی میں ہو جائیگی۔ اور یہی سبب تھا کہ مڈل کلاس ہوتے ہوئے انہوں نے اپنے گلے میں ہائی کلاس سوسائٹی کی تختی ڈال رکھی تھی۔ وہ اپنی بیٹیوں کو کسی مڈل کلاس فیملی میں بیاہنا نہیں چاہتے تھے۔ مگر شازیہ کا ذہن اس طرح کے خیالات سے پاک تھا۔

وہ Class Conscious بالکل نہ تھی۔ وہ ایک حقیقت پسند لڑکی تھی جو انسانوں کو الگ الگ خانوں میں بانٹ کر نہیں دیکھتی تھی۔ اسکی نظر میں دنیا کے سارے انسان برابر تھے۔ دراصل اس کے اندر ایک پینٹر کے روپ میں ایک آرٹسٹ ایک Intellectual بھی چھپا تھا جس کے باعث اس کے خیالات و نظریات اپنے پاپا ممی اور شاہین سے بہت مختلف تھے۔ حالانکہ اسے رنگوں سے بے حد پیار تھا کیونکہ رنگ اس کے بہترین ساتھی تھے۔ رنگوں کی مدد سے ہی تو وہ اپنے جذبات و احساسات کا اظہار کر پاتی تھی۔ مگر اس کی ذاتی زندگی میں لندن یا امریکہ کی تہذیب اور لائف اسٹائل کا ذرہ برابر بھی رنگ نہیں تھا۔ اسے سادہ زندگی پسند تھی۔ وہ جھوٹی چمک دمک اور شان و شوکت کی قائل نہ تھی۔ اس کا لباس ہمیشہ سادہ اور sober ہوا کرتا تھا۔ پچھلے دو تین مہینے سے وہ اپنے کمرے میں نماز بھی پڑھنے لگی تھی۔ حالانکہ پابندی کے ساتھ پانچوں وقت کی نماز نہیں پڑھ پاتی تھی تاہم جب بھی موقع مل جاتا وہ بارگاہ معبود میں سربسجود ہو جاتی۔ یہ ای ٹی وی اردو پر ٹیلیکاسٹ ہونے والے خواتین کے ایک پروگرام کا کرشمہ تھا جو اس کے اندر اچانک ایک غیر معمولی تبدیلی واقع ہوئی تھی۔ ''محفل نسواں'' کے دو تین ایپیسوڈس دیکھنے کے بعد اس کے دل میں مذہب کے تئیں

دلچسپی پیدا ہوئی اور نماز کی ترغیب اسے "تھیوچینل" کے پروگراموں سے ملی تھی۔ وہ اپنی زندگی سے بہت مطمئن اور خوش تھی۔ اس کی ایسی کوئی تمنا یا خواہش نہ تھی کہ اس کی شادی کسی کروڑپتی گھرانے میں ہو۔

مگر شاہین کو زمین سے پیار نہ تھا۔ وہ چاند پر بنگلے بنانے کی خواہشمند تھی۔ اس نے کبھی کسی مڈل کلاس فیملی کی بہو بننے کا تصور نہیں کیا۔ بلکہ مڈل کلاس کے خیال سے ہی اسے نفرت تھی۔ وہ شہر کی امیر ترین فیملی کی بہو بننا چاہتی تھی اور اس کی چاہت اب عنقریب پوری ہونے والی تھی۔ اقبال کی صورت میں اسے اپنے سپنوں کا راجکمار مل گیا تھا اور اب اس کے خواب کے شرمندہ تعبیر ہونے کا وقت آ گیا تھا۔

اس کے ممی ڈیڈی اور بہن شازیہ یہ سبھی لوگ اقبال سے مل چکے تھے۔ اور اقبال سب ہی کو پسند آ گیا تھا۔ اس کے والد شہر کے چند جانے مانے رئیسوں میں سے ایک تھے۔ تقریباً پانچ سو کروڑ کے آدمی تھے۔ اور اقبال اکلا بیٹا تھا۔ پانچ سو کروڑ کے بزنس ایمپائر کا اکیلا وارث۔ مگر اقبال کے طرز کلام اور لوگوں سے ملنے جلنے کے انداز میں باپ کی دولت کا ذرا بھی غرور نظر نہیں آتا تھا۔ وہ زمین سے جڑا ہوا نوجوان تھا جس کے لیے زندگی میں دولت بہت زیادہ اہمیت نہیں رکھتی تھی۔ وہ انسان کو انسانیت کے آئینے میں دیکھتا تھا۔ اس کی نظر میں غریب ہونا کوئی جرم یا گناہ نہ تھا۔ وہ کسی بھی شخص کو دولت کے ترازو میں نہیں تولتا تھا۔ اور یہ دیکھتا تھا کہ وہ اخلاق کی دولت سے کتنا مالا مال ہے۔ اور یہی وجہ تھی کہ شاہین کے ممی ڈیڈی اور شازیہ کے دل میں اس نے چند ہی ملاقاتوں میں ایک خاص جگہ بنالی تھی۔ سبھی لوگ اسے بے حد عزت و احترام کی نظر سے دیکھتے تھے اور شاہین کی قسمت پہ ناز کرتے تھے۔

شاہین اکثر شازیہ کو سمجھاتی کہ وہ اپنے رہن سہن کا ڈھنگ بدلے ورنہ وہ مولوی بن جائے گی اور نہ اسے ہائی کلاس سوسائٹی کا کوئی بھی لڑکا پسند نہیں کرے گا۔ اور جب اسے پتہ چلا کہ وہ نماز پڑھنے لگی ہے تو وہ اس پر خوب ہنسی اور اس کا مذاق بھی اڑایا۔ "اب تو تیرے لئے کسی مولوی کے گھر میں رشتہ تلاش کرنا پڑے گا۔ What is wrong with you Shaziya?! آخر تجھے ہوا کیا ہے یار؟!۔ مجھے دیکھ اگر میں آج کی دنیا کی لڑکی نہ ہوتی تو مجھے اقبال جیسا بوائے فرینڈ نہ ملتا!"۔ حالانکہ کبھی کبھی اس کی بات شازیہ کے دل کو چبھ جاتی مگر وہ مسکرا کر اس چبھن کو چھپا لیتی۔ وہ اکثر اس بارے میں بحث و مباحثے سے گریز کرتی اور خاموشی سے شاہین کی باتیں سن لیتی۔

شام کے قریب چھ بجنے والے تھے۔ سورج آہستہ آہستہ اپنی منزل کی جانب بڑھ رہا تھا۔ دور بیچ پر کچھ لوگ ایوننگ واک کرنے میں مصروف تھے۔ شاہین اقبال سے ملنے مڈھ آئلینڈ کے ساحل پر آئی تھی۔ اور اس وقت دونوں سمندر سے تھوڑے فاصلے پر سڑک کے کنارے کھڑے سورج کی طرف دیکھ رہے تھے جو کچھ ہی دیر میں سمندر کی گود میں سمانے والا تھا۔ قریب ہی اقبال کی ہمر کار کھڑی تھی۔ ہر طرف سکون کا ماحول تھا۔ دونوں خاموش تھے۔ شاید شام کے سہانے منظر کو اپنے روحوں میں اتار رہے تھے۔ شاہین اندر سے بہت خوش تھی۔ اسے یقین تھا کہ اقبال نے آج اسے کچھ خاص بات کہنے کے لیے یہاں بلایا ہے۔ "شاید وہ اپنی زبان سے آج اظہار محبت کرنا چاہتا ہے"۔ اس نے سوچا اور اس خیال کے آتے ہی ایک کیف آور لہر اس کے احساسات میں گردش کرنے لگی۔

"دراصل آج میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں شاہین"۔ اقبال نے شاہین کی طرف مڑ کر کہا۔ شاہین کا دل بڑی تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ وہ اقبال کی زبان سے I love You سننے کے لیے بے چین تھی۔ "تم میری بہترین دوست ہو شاہین۔ اور مجھے تم سے ـــــ"، "محبت ہوگئی ہے"۔ اقبال کی بات کاٹتے ہوئے شاہین نے کہا۔ "نہیں" "مجھے تم سے نہیں بلکہ تمہاری بہن شازیہ سے محبت ہوگئی ہے"۔ یہ سنتے ہی شاہین کے دل و دماغ پر اک بجلی سی گر گئی ایک پل کے لیے اسے لگا جیسے اس کے جسم کے اندر سے روح پرواز کر گئی اور اس کا وجود ساکت و جامد ہو گیا۔ اقبال نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"میں نے ہمیشہ تمہیں اپنا دوست سمجھا شاہین۔ اور تم زندگی کے آخری لمحہ تک میری اچھی دوست رہو گی۔ تم اک آزاد خیال لڑکی ہو۔ تمہارے جیسے خیالات و نظریات کی لڑکیاں میں نے لندن اور امریکہ میں بہت دیکھی ہیں۔ ایسی کئی لڑکیاں میری بہت قریبی دوست بھی رہی ہیں۔ مگر میں اندر سے پورا ہندوستانی ہوں۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ شازیہ میرے دل میں اتر گئی۔ شازیہ جیسی لڑکی آج کے دور میں مشکل سے ملتی ہے۔ میں جب سے اس سے ملا ہوں بس دن رات اسی کے بارے میں سوچتا ہوں۔"

اقبال اپنے دل کی بات کہتا جا رہا تھا اور شاہین پتھر کی مورت بنی اس کی باتیں سن رہی تھی۔

"میں شازیہ کے بارے میں جتنا زیادہ سوچتا ہوں اتنا ہی اسے اپنے دل کے قریب محسوس کرتا ہوں۔ میں اسے اپنی شریک زندگی بنانا چاہتا ہوں مگر دل کی بات اس سے کہتے ہوئے ڈرتا ہوں کہ کہیں وہ مجھے ریجیکٹ نہ کردے۔ I need your favour Shaheen. تم پلیز میرے دل کی بات شازیہ تک پہنچاؤ اور اسے شادی کے لیے راضی کرو۔ میں زندگی بھر تمہارا احسان مند رہوں گا"!!۔

اقبال کی بات سن کر اسے احساس ہوگیا کہ وہ کتنی غلط تھی۔ مغرب کی سوچ و فکر کا شیش محل جس کے اندر اس کا دل و دماغ قید تھا، ایک جھٹکے میں ٹوٹ کر چکنا چور ہوگیا۔ اس کے پر ٹوٹ گئے اور وہ خوابوں کے آسمان سے گر کر حقیقت کی زمین پر آ گئی۔

آدھے گھنٹے کے لیے۔۔۔!

فرخندہ شمیم (راولپنڈی)

انٹرنیٹ پر چیٹ کرتے کرتے دونوں ایک ساتھ ہی اچھل پڑے تھے۔ واؤ۔۔۔ یار یہ کیا چیز ہے؟ شی از گورجیس! نیلی آنکھوں اور سنہری بالوں والی ایک دلآویز حسینہ اپنی تصویر کے ساتھ آن لائن تھی۔ پھر دونوں ہی ماؤس پر جھپٹ پڑے۔ ساتھ ہی دونوں کا قہقہہ کمرے میں بلند ہو گیا۔

''یار۔۔۔ چل تو کر لے۔۔۔ کر لے اس سے باتیں! میری خیر ہے۔ ناظم نے جلدی سے ہتھیار پھینک دیے اور سرمد دیوانہ وار لڑکی سے اپنا تعارف کرانے لگا۔

لڑکی بھی ترنگ میں تھی۔ اس نے اپنے بارے میں کافی کچھ بتا دیا۔ اس نے بتایا کہ وہ کینیڈا میں رہتی ہے لیکن آبا و اجداد کا وطن پاکستان ہے۔ اس کی ماں انگریز تھی اور اس نے ایک پاکستانی انجینئر سے کینیڈا میں شادی کی تھی۔ شارقہ نے یہ بھی بتایا کہ اس نے اپنے والد سے ان کے آبائی گاؤں کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا ہے۔ اس کی والدہ پچھلے سال انتقال کر گئیں اور اب وہ اپنے والد کے ساتھ کینیڈا میں تنہا رہتی ہے۔

''تنہا؟ سرمد کے دماغ میں گھنٹیاں بجنے لگیں۔ ایک خوبصورت لڑکی جب تنہا رہتی ہے تو۔۔۔ ؟اور آپ؟ لڑکی نے اس کا تعارف چاہا۔

میں؟ ''میں تو ازل سے تنہا ہوں۔۔۔!''

سرمد نے کچھ اس طرح اداسی کی ایکٹنگ کی کہ ناظم بڑی مشکل سے ہنسی روک سکا۔

آپ کے والدین۔۔۔ بھائی بہن۔۔۔ بیگم۔۔۔ بچے۔۔۔؟ لڑکی نے چیٹ پر پوچھا۔

''یوں تو سب ہیں۔۔۔ آہ۔۔۔ لیکن نہ ہونے کے برابر، سرمد نے عیاری سے لکھا۔۔۔ اور رہی بیگم۔۔۔ اپنے نصیب میں تو کوئی حسینہ ہے ہی نہیں۔۔۔ افسوس۔

اوہ۔۔۔ سو سیڈ۔۔۔ لیکن کوئی بات نہیں۔ پاکستان میں لوگ ویسے بھی تیس سال کے بعد شادی کرتے ہیں۔ ابھی تو آپ کی عمر۔۔۔ شاید۔۔۔؟ وہ رک گئی۔

''پچیس سال'' سرمد نے جلدی سے لکھا۔

اچھا تو آپ مجھ سے دو سال جونیئر ہوئے؟ شوخی سے لکھا گیا۔

سرمد گڑبڑا گیا۔

ناظم نے اس کی بوکھلاہٹ کو خوب انجوائے کیا۔

خبیث۔۔۔ تو پچیس سال کا ہے؟ چالیس کے پیٹے میں ہے تو۔۔۔! اس نے سرمد کا مذاق اڑایا۔

چپ کر تو۔۔۔ مرد تو ساٹھ سال کا بھی گھوڑے جیسا ہوتا ہے۔ اس نے سینہ پھلایا۔

ارے۔۔۔ آپ چپ کیوں ہو گئے؟ لڑکی دوبارہ لائن پر آ گئی۔ وہ جلدی سے سنبھل گیا۔ نہیں تو۔۔۔ ایسی تو کوئی بات نہیں۔۔۔ وہ میں ذرا پانی پینے چلا گیا تھا۔

آپ بہت دلچسپ آدمی ہیں۔۔۔ کیا آپ مجھے اپنی کوئی تصویر send کریں گے؟

کیوں نہیں۔۔۔ ضرور مگر وہ سوچ رہا تھا اس کی تو کوئی تصویر پچیس سال کی عمر والی نہیں ہے؟

جی۔۔۔ جی۔۔۔ ضرور، اس نے گڑبڑاہٹ میں پھر لکھ دیا۔

میں پاکستان آ کر آپ سے ملنا چاہوں گی۔ تحریر کیا تھی ایک گنگناہٹ تھی

کیا واقعی؟

ہاں ہاں۔ میں آئندہ ماہ پاکستان آ رہی ہوں میرے پاپا چاہتے ہیں کہ میں پاکستانی لڑکے سے شادی کروں کیونکہ پاکستانی لڑکے باوفا اور بے لوث ہوتے ہیں۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

آزمائش شرط ہے۔ سرمد نے پوری طرح وثوق سے لکھا۔

اچھا؟ اس کے انداز سے لگتا تھا وہ بے اختیار ہنس بھی پڑی ہے

اور

پھر گفتگو کا سلسلہ شب و روز پر محیط ہو گیا۔ راتوں کے بے شمار پہر ایک دوسرے کی نذر ہو گئے۔ شارقہ نے اپنی خوبصورت تصاویر send کی تھیں۔ ہر لباس میں وہ منفرد اینجل نظر آتی تھی۔

سرمد کی بے باک سوچیں اور للچائی نظریں ہر تصویر میں شارقہ کے بولتے زاویوں سے کھیلتیں اور جینز شرٹ میں لپٹے اس کے قاتل جسم کو اپنے ہونٹوں سے سیراب کرتی رہتیں۔

ناظم کہہ چکا تھا۔ سرمد عیاشی کے کسی آخری سرے تک پہنچنے کو بے تاب ہے اور اب صرف شارقہ کے آنے کا انتظار ہے۔

واقعی یورپ کے لوگ جھوٹ نہیں بولتے۔ شارقہ سچ مچ پاکستان آ گئی۔۔۔ اکیلی۔۔۔ مختصر سا سامان لیے۔۔۔ جینز کی پینٹ اور سکارف میں وہ اپسرا نظر آ رہی تھی۔۔۔ اپنے آنے کی اطلاع اس نے صرف سرمد کو دی تھی۔۔۔ گاؤں کے رشتہ داروں سے وہ بعد میں ملنا چاہتی تھی۔ ایئرپورٹ لاؤنج میں اس نے سرمد کو اور سرمد نے اُسے دیکھا۔ سرمد ٹکٹکی باندھے اسے دیکھتا رہ گیا۔ شارقہ کو ایک دوسری وجہ سے خوشی ہوئی تھی کہ سرمد ایک نوخیز نوجوان کی بجائے ایک مضبوط عمر کا ہینڈسم آدمی تھا۔ چھوٹی چھوٹی عمر کے چھچھورے لڑکے تو اُسے یورپ میں بھی کبھی اچھے نہیں لگے تھے۔

چلیں؟ صاف ستھری اردو میں شارقہ نے پوچھا۔ سرمد کچھ حیران

ہوا۔

کہاں؟ وہ نہ جانے کون سی باریکیوں میں کھویا تھا۔

بھئی ۔۔۔ آپ کے گھر اور کہاں؟

گھر؟ سرمد پھر چونکا۔ میڈم اپنا تو گھر ہوٹل ہے اس نے شانے اچکاتے ہوئے کہا۔ اچھا؟ کیا پاکستان میں بھی گھر کا تصور ختم ہوتا جا رہا ہے؟ شارقہ نے کچھ ایسی بے ساختگی سے کہا کہ سرمد گڑبڑا گیا۔

ایسا نہ ہو میڈم صاحبہ کہ آپ سچ مچ میرے ساتھ گھر بسانے کے سپنے دیکھ رہی ہوں ۔۔۔ وہ گاؤں ۔۔۔ میرے ساتھ ایسا نہ ہو ۔۔۔ میں تو پہلے ہی گھر بسا چکا ہوں۔ آپ کو تو پتہ ہے گاؤں اس کی پیشانی پر عرق آ گیا۔

کچھ گھبرائے گھبرائے لگتے ہیں آپ؟ لیک تو سرمد کو شارقہ کے مصنوعی انداز سے بھی الجھن ہو رہی تھی۔ خالصتاً مغربی ماحول میں پڑھ لکھ کر بھی وہ صرف اور صرف اردو زبان بول رہی تھی اور وہ بھی پورے لکھنوی انداز میں۔

بھئی شارقہ ۔۔۔ مجھے اتنی اردو نہیں آتی۔ کار کا دروازہ کھولتے ہوئے سرمد نے ہار مان لی۔

"تو پھر انگلش بولیں۔ مجھے تو کوئی پرابلم نہیں ہے" وہ ہنس کے بولی۔

سرمد لاچار ہو گیا۔ انگریزی بھی اُسے کہاں آتی تھی۔ شارقہ کو ہنسی آ گئی ۔۔۔ پھر انتہائی سنجیدگی سے وہ بولی۔ دراصل سرمد میں نے بھی اپنے گاؤں والوں کو اپنی آمد کے بارے میں نہیں بتایا ہے۔ سیٹ پر تمہارے ساتھ اتنی دلچسپ گفتگو رہی تھی کہ سوچا تمہیں پہلے مل لوں ۔۔۔ گاؤں بعد میں چلی جاؤں گی ۔۔۔ پاپا نے اردو زبان سکھانے کے لیے مجھ پر بہت محنت کی ہے تا کہ میں اپنے اور پاپا کے لوگوں سے پوری سہولت کے ساتھ بات کر سکوں۔

سرمد کار چلاتے ہوئے اس کی باتیں سنتا رہا۔

اس کے تصور میں نیلی آنکھوں اور ہوشربا بدن والی خوبصورت حسینہ بار بار تیرنے لگی۔ وہ ۔۔۔ جو ۔۔۔ اب ۔۔۔ اس وقت کار میں بالکل اس کے پہلو سے لگی میٹھی میٹھی باتیں کر رہی تھی۔ اور جیسے وہ تھوڑی ہی دیر کے بعد ۔۔۔ ہوٹل کے خواب آور ماحول میں اپنے ساتھ یک جان کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ زندگی کی رنگینی اور ترنگ رہ گذر پر مشرق اور مغرب کے ملاپ کا دلکش منظر ہونے کی وحشت اس کے لاشعور میں ناچ رہی تھی۔ وہ شارقہ کے قرب سے نڈھال تھا اور اس کے شربتی ہونٹوں کا طلسم توڑ کرنے پر تلا ہوا تھا۔

شارقہ ہوٹل کے کمرے میں داخل ہوئی تو اس نے شانوں سے اسے تھام لیا۔

تم تو یوں حیران ہو رہی ہو جیسے ایسا پہلی بار ہو رہا ہو۔ آخر تم یورپ کی لڑکی ہو۔ وہاں تو یہ سب بہت عام سی بات ہے؟ دوستوں سے ہاتھ ملانا، گلے ملنا، انہیں چھو لینا؟ ہاں؟

لیکن مجھے آج تک کسی نے نہیں چھوا! وہ بڑی متانت سے بولی

کیا؟

ہاں۔ اور اس لیے کہ میں نے کسی کو چھونے نہیں دیا!! وہ صوفے پر بیٹھ کر موزے اتارنے لگی۔

اچھا؟ لیکن میں تمہیں چھوئے بغیر نہیں چھوڑ سکتا۔ ایک چھچھورے سے انداز میں سرمد شارقہ کے اوپر جھک گیا تھا ۔۔۔ میں کئی گھنٹوں سے تمہارے قربت کی تصوراتی لذت کے سہارے جی رہا ہوں ۔۔۔ اب تم سامنے ہو تو میں کیسے اس خمار کی گھڑیوں کو بے نشان چھوڑ دوں ۔۔۔ اس کے انگ انگ سے ہوس ٹپک رہا تھا۔ شارقہ دم بخود تھی۔

میں تمہیں ذائقے کی ایک ایسی جنت میں لے جاؤں گا شارقہ کہ جہاں پہاڑ تمہارے بدن پر اگی شباب چوٹیوں کو سجدہ کر کے زمین بوس ہوں گے اور تمہارا اپنا خالی بدن بھرنے کے لیے تمہارے پنڈلیوں سے شراب چھائیں گے ۔۔۔ اور میں خود گواہی دوں گا ۔۔۔ ہاں خود ۔۔۔ کہ شارقہ بے مثال ہے۔ ایسا حسن جسے سب میں تقسیم ہونا چاہیے۔ تھوڑا تھوڑا ۔۔۔ سب کو ملنا چاہیے۔ یو فول۔ وہ سرشار لہجے میں بولے جا رہا تھا۔

شارقہ کے چہرے پر سرمد کے ہونٹوں کی سرسراہٹ دوڑی تو وہ ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹ گئی۔

ڈر کیوں رہی ہو؟ تم تو یورپ کی لڑکی ہو؟ سرمد آگے کی طرف اُچھلا۔

ہاں۔ مگر یورپ کی لڑکی بھی تو شادی کرتی ہے۔ قانونی اور شرعی شادی۔ شارقہ نے سرمد کا ہاتھ جھٹک دیا۔ وہ ۔۔۔ Realy? سرمد کی واضح نخوت اس کی آنکھوں میں رینگ رہی تھی۔

تم لوگوں کی شادیاں تو دن اور رات میں کئی کئی بار ہوتی ہیں۔ تمہاری کتنی بار ہوئی شارقہ؟

شارقہ نے بڑے ضبط سے یہ چھچھورپن برداشت کیا تھا۔ کم آن شارقہ ۔۔۔ سب کچھ ملا کر صرف آدھے گھنٹے کی تو بات ہے ۔۔۔ فقط 30 منٹ ۔۔۔ اس کے بعد میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا۔ تم آرام سے پاکستان گھومنا پھرنا ۔۔۔ ٹھیک؟

لیکن میں یہ آدھا گھنٹہ ناقابل فراموش بنانا چاہوں گی۔ کچھ اس انداز سے یورپ میں پلی لڑکی نے کہا کہ سرمد ڈر گیا۔

کیا مطلب؟ کیا تم مجھے مار ڈالو گی؟ زخمی کرو گی یا خودکش بم ۔۔۔؟ بہت ہی بوگنے پن سے وہ بولا تھا۔

اس سے بھی اوپر ۔۔۔ شارقہ کی نیلی آنکھیں تیز کی طرح چمکیں۔ میں آدھے گھنٹے کے لیے تم سے شادی کروں گی ۔۔۔ صرف آدھے گھنٹے کے لیے ۔۔۔ تا کہ تمہارا وحشی لال مجھ پر جھپٹنے سے پہلے قانونی ہو جائے۔

"کیا؟" سرمد کو اس بات کا گمان تک نہیں تھا۔

یہ کیا بے وقوفانہ بات ہے؟ اس نے مٹھیاں بھینچیں۔
یہی تو سب سے بڑی دانائی ہے ایک مسلمان لڑکی کا من چھوا جسم ہے یا شادی کے بغیر خود سپردگی؟ نوے اشارہ کا وقار حیران کن لگ رہا تھا۔
"اور اگر میں اس کے بغیر ——" مرد ازدھا دارلکس بتانے لگا۔
"تو میں مار مار کر تمہارا بھرکس نکال دوں گی۔ وائٹ بیلٹ ہوں میں —— سمجھے؟"
شارقہ شیرنی کی طرح اُسے دبوچنے والی تھی کہ آٹومیٹک چابی سے ہوٹل کے کمرے کا دروازہ کھل گیا —— سامنے ناظم کھڑا تھا سرمد کا لنگوٹیا یار —— اور ساتھ میں قاضی صاحب —— نکاح کا رجسٹر اٹھائے ہوئے —— اور کون —— سرمد کو جھٹکا لگا اور شاید شارقہ کو بھی
گاؤں والے ماموں —— ماموں صدیقی ——!
ایک دوسرا جھٹکا دوبارہ سرمد کو لگا۔
حاجی صدیقی —— اس کے سسر؟؟
جلد ہی صدیقی صاحب نے اس چھوٹی سی بھیڑ کو سب کچھ سمجھا دیا۔ انہوں نے ناظم کا شکریہ ادا کیا جس نے کئی زندگیوں کو تباہ ہونے سے بچا لیا تھا۔ سرمد نیٹ پر جتنی باتیں شارقہ سے کرتا وہ ٹنگ میں ناظم کو بتا دیتا تھا۔ انہی کی روشنی میں ناظم نے ساری منصوبہ بندی کی اور شارقہ کو اپنے اعتماد میں لے لیا۔ وہ شارقہ سے گہری ہمدردی رکھتا تھا اور اُسے سرمد کی سازش سے بچانا چاہتا تھا پچھلے آدھے گھنٹے سے ذرا کم یہ منظر چل رہا تھا کہ حاجی صدیقی نے چونکا دینے والا عکس دے دیا —— وہ پوری طرح اس سرمد کی طرف متوجہ ہوئے۔
کیا تم مردانگی دکھانے آئے تھے اس لڑکی کے اوپر پچھلے دس سال سے تم شادی شدہ ہو میری بیٹی کے ساتھ —— ایک بار بھی مردانگی نہیں دکھا سکے۔ ایک بار بھی اُسے ماں نہیں بنا سکے —— تم بانجھ مرد —— کیا ہے تمہارے پلے؟
صرف مردوں جیسا جسم —— ہاں؟؟
ایک سکتہ چھا گیا تھا منظر پر —— ناظم قاضی شارقہ سب ہی گم سم کھڑے —— سرمد کے زرد چہرے کو دیکھ رہے تھے ——
اور یہ قاضی صاحب —— یہ نکاح پڑھائیں گے کس کا ——
شارقہ اور ناظم کا —— ان کی آواز جیسے ستاروں سے آ رہی تھی کیا؟
سب کی پھٹی پھٹی آنکھیں ایک دوسرے پر گڑ گئیں —— یہ بات تو شارقہ کو بھی معلوم نہیں تھی کہ شارقہ میری بھانجی ہے میں نے اس کے والد سے اس نکاح کی اجازت لے لی ہے اور وہ بھی اس بات سے متفق ہیں کہ شریف عورت کی شادی صرف شریف مرد سے ہونی چاہیے —— قاضی صاحب آپ بسم اللہ کیجیے —— ماموں نے قاضی صاحب سے کہا شارقہ اور ناظم نے ایک لمحے کے لیے ایک دوسرے کو دیکھا۔ ایسا لگا جیسے ہم رقص ہو اٹھا اور حیرانی کے کومل ہونٹوں پر اب شرماہٹ کی تتلی بوسہ کناں تھی!!

○

دل دل کھوڑا پھیر

دل دل کھوڑا پھیر   قصہ خوانی دے چوہیر
ٹکڑے چھٹی وڈے بھرایا تیر
وے توخیری آ
تیری ماں مناوے بیر
جے تو چڑیاں کھارے   تیری خالہ پپیوارے
ٹکڑے چھٹی وڈے بھرایا تیر
وے توخیری آ
تیری ماں مناوے بیر
جے تو چڑھسیں کھوڑی   تیرے نال پہراواں دی جوڑی
ٹکڑے چھٹی وڈے بھرایا تیر
وے توخیری آ
تیری ماں مناوے بیر
جے تو چڑیوں نچی   تیری باجی شکروڑی
ٹکڑے چھٹی وڈے بھرایا تیر
وے توخیری آ
تیری ماں مناوے بیر

○○

جناب فارغ بخاری کے گھودار ہندکو پوروڑیا ہو کے زیر اہتمام تحریر ۲۰۰۰ء میں شائع شدہ شعری مجموعے "کالا آپ" سے نکلیں ہو مانت۔

○○○

ہجرِ مسافت

شہریار
(علی گڑھ مضافات)

بھیڑ کا حصہ بن جانا یوں تنہا نہیں ہوتا
سچ مچ ایسا ہو جاتا تو اچھا نہیں ہوتا

دل بستی کی آباد کم ہوتی جاتی ہے
حیرت بات ہے ذکر کہیں بھی اس کا نہیں ہوتا

خود سے بھی اب ملنا گاہے گاہے ہوتا ہے
وقت نے مجھ کو اتنا اب بدلا نہیں ہوتا

کچھ بے معنی کام ہیں جن کو پورا کرنا ہے
ماضی سمت اسی باعث تو جانا نہیں ہوتا

ہجرِ مسافت کے آداب سے واقف جو ہوتا
منزل خوف سے یوں رستے میں ٹھہرا نہیں ہوتا

○

محمود الحسن (راولپنڈی)

ہے اور بات کہ ممتاز و سرکشیدہ نہیں
ہمارا نام مگر حرفِ ناشنیدہ نہیں

مری نگاہ میں ہے پختہ تر چٹانوں سے
کہ غم میں ڈوب کے جو شخص آبدیدہ نہیں

مزا تو تب ہے کہ ہو ایک شیرِ نر کی طرح
کہ دل تو دل ہے کوئی آہوئے رمیدہ نہیں

نگاہ جس سے نہ ہو چاک پردۂ افلاک
نہ جانے کیا ہے مگر آبروئے دیدہ نہیں

وہ کیا بیان کہ شیریں بیاں نہ ہوں جس میں
وہ کیا زبان کہ جو انگبیں چشیدہ نہیں

تضادِ قول و عمل دیکھ کر ہوا محسوس
جنابِ شیخ بھی کچھ ایسے برگزیدہ نہیں

ہے رزمگاہِ محبت میں کیا دماغ کا کام
نہ کام آئے گا وہ تن جو سربریدہ نہیں

سنبھالتا میں عنایاتِ خسروانہ کیسے
تمہیں کہو کہ یہ دامن مرا دریدہ نہیں؟

ہے ڈر طبیب کا آبِ حیات کا تو نہیں
کہ میں گزیدۂ آدم ہوں سگ گزیدہ نہیں

مرے لبوں پہ ہے ہر دم مرے رسولؐ کا نام
مری زباں پہ کسی اور کا قصیدہ نہیں

دل و جگر کے بھی ٹکڑوں کی بات ہے محمودؔ
بکوں کی شرط فقط داستی دریدہ نہیں

○

سید مشکور حسین یاد
(لاہور)

اگر کہیں جانا ہے پیارے اُٹھیے چلیے صفر کے ساتھ
ہم نے جب بھی دیکھے انوکھے رستے دیکھے صفر کے ساتھ

جتنے عدد تھے گرچہ مدد تھے لیکن سب مرہونِ اَحد تھے
ہم نے بے حد دُھومیں مچائیں آگے پیچھے صفر کے ساتھ

قدم اُٹھانے سے پہلے تو واقعی ہم پیچھے ہی رہے
لیکن پھر ہم ہر اک دوڑ میں اوّل آئے صفر کے ساتھ

اتنا ہمیں کب ہوش میں لائی کوئی قطار شمار بتاؤ
جتنا بھی ہم چہکے بہکے لہکے مہکے صفر کے ساتھ

جانے کیا کیا عروج پہ لے جاتی ہے صفر انسانوں کو
اک اک کرتے بڑھتے چلے جاتے ہیں زینے صفر کے ساتھ

نئی نئی شکلیں بنتی ہیں نئے نئے آفاق لئے
توس و قزح میں جب آتے ہیں ٹوٹ کے دائرے صفر کے ساتھ

عجب طرح کی طاقت جسم و جاں میں آجاتی تھی یادؔ
جیسے ہی ہم گنتی گنتے گنتے تھکتے صفر کے ساتھ

○

امین راحت چغتائی
(راولپنڈی)

احوالِ دل پہ آج یہ طرفہ ستم رہا
غم کو چھپا لیا بھی تو آنکھوں میں نم رہا

ہر چند سر پہ رات رہی، دم گھٹا نہیں
لیتے رہے ہیں سانس، یہ اُن کا کرم رہا

جنگل اُگے ہوئے ہیں مکانوں کے درمیاں
اب ربطِ باہمی کا بھلا کس کو غم رہا

دل میں کسی کے کیا ہے، اُسے کچھ خبر نہ تھی
ہم تھے تو اُس کی بزم میں اُس کا بھرم رہا

یہ بات الگ کہ اُن کو نظر کچھ نہ آسکا
ہاتھوں میں یوں تو دیر تلک جامِ جم رہا

دے گا کوئی شہادت و تقریب دار بھی
لوحِ جبیں پہ اپنے انا الحق رقم رہا

راحتؔ پھر اُن کا نام کسی نے سنا نہیں
جن کا ہر ایک در پہ سرِ عجز خم رہا

○

امجد اسلام امجد
(لاہور)

نہ ہو خوفِ نارسائی تو ہَوس میں کیا نہیں ہے
غمِ آشیاں جو بھولے تو قفس میں کیا نہیں ہے

وہی مشکبار لمحہ جو گزر چکا ہے کب کا
تُو کہے تو لوٹ آئے یہ ترے بس میں کیا نہیں ہے

کبھی کارواں کے پیچھے، کبھی کارواں کے آگے
کبھی کان دھر کے سنیئے تو جرس میں کیا نہیں ہے

غمِ زندگی میں ڈھل کے، کئی صورتیں بدل کے
جو ملا ہے قطرہ قطرہ، اُسی رَس میں، کیا نہیں ہے

نہیں فکر پیش و پس کا، کسی باغ کا، قفس کا
ہے جو عشق میں فراغت تو ہَوس میں کیا، نہیں ہے؟

نہ تلاشِ آب و دانہ، نہ ہی شورشِ زمانہ
نہ ہو شوقِ پَرکشائی تو قفس میں کیا نہیں ہے

یہ حدیثِ زندگانی، یہی مختصر کہانی
نہیں اک قفس سے آگے، پہ قفس میں کیا نہیں ہے!

نئی منزلیں بنا دوں، سبھی مشکلیں ہٹا دوں
تُو جو ہم سفر ہو میرا، مرے بس میں کیا نہیں ہے

وہی خلوتوں کے قصے، وہی وصل کی تمنا
یہی عشق کی ہے دنیا تو ہَوس میں کیا نہیں ہے

کہیں غم کا یا خوشی کا یہ جو شور سا ہے برپا
یہی زندگی ہے امجد تو جرس میں کیا نہیں ہے

○

مظفر حنفی
(دلی بھارت)

ایسے میں کیا پیار پنپتا پانی میں کیا گھلتی ریت
وہ گہرے ساگر کا موتی میں ساحل کی جلتی ریت

دھیرے دھیرے پیار کی لوری ڈھل گئی دکھ کے بَینوں میں
ہولے ہولے کا بکھتاں میں جاگی آنکھیں تکتی ریت

لمحوں کے اس ریگستاں میں جیون ہے ایک نخلستان
پگ پگ دھوکا دیتے سائے پل پل روپ بدلتی ریت

جلتے آنسو مفت گنوائے مجھ سے تو پوچھا ہوتا
ٹھنڈے خون کے اک چھینٹے پر دو دو ہاتھ اچھلتی ریت

مجھ سے پوچھو انسانوں کی حیوانی فطرت کا حال
میں نے دیکھی ہے دوآبے کے کھیتوں میں پلتی ریت

منزل وزل ہم کیا جانیں چلنا ہے سو چلتے جائیں
ہمت چھوڑ ڈگر انجانی، ڈگمگ پاؤں پھسلتی ریت

لاکھ بگولے سر ٹکرائیں خالی دامن پھیلائیں
تھک کر لیٹ گئی ٹیلے پر ساتھ کہاں تک چلتی ریت

کم کوئی نے عزت رکھ لی بند ہے مٹھی لاکھوں کی
ورنہ مظفر لطف آ جاتا کھلتی سیپ نکلتی ریت

○

مامون ایمن
(نیو یارک)

ماحول میں سکوت کی تقریر تھی عجب
آنکھوں میں انتظار کی تحریر تھی عجب

الفت نواز خواب کی تعبیر تھی عجب
موجِ صبا کے پاؤں میں زنجیر تھی عجب

دل عشق کے شعار سے مٹی میں مل گیا
وحشتِ خرام جذب کی تعمیر تھی عجب

پھر بھی نفس رہے شجرِ قرابت کی چاپ پر
آوازِ گل عذار کی تصویر تھی عجب

سادہ نیازِ عشق سے یک سرحدیثِ جاں
تحسینِ نازِ حُسن کی تفسیر تھی عجب

دیوار پر حباب کی ہر اک صدا، کرن
در پر مگر سوال کی تحریر تھی عجب

پردیس میں حیات کا ہر رُخ عجیب تھا
رانجھا عجیب، پیار عجب، ہیر تھی عجب

اِک منزلِ اُمید اچانک چمک اُٹھی
یادِ دیارِ حُسن کی تنویر تھی عجب

اِک بے ادا، ادا نے ہمیں دربدر کیا
معصوم سے خیال کی تقریر تھی عجب

ایمنؔ اگر اب وقت میں منزل نہ راستہ
وسعت جوازِ عزم کی تقدیر تھی عجب

کرشن کمار طور
(دھرم شالہ بھارت)

سامنے میرا عدو ہے اور میں ہوں
ہاں وہی پھر ہاؤ ہو ہے اور میں ہوں

بھر رہا ہے آنکھ میں تیزاب سا کچھ
جوش پر فصلِ نمو ہے اور میں ہوں

دیر تک چکھنا پڑے گا زہرِ عشرت
دور تک اک آبجو ہے اور میں ہوں

دل سے طائر کب کے رخصت ہو چکے ہیں
آسماں سے گفتگو ہے اور میں ہوں

خواب سی معلوم ہوتی ہے یہ دنیا
ایک آوازۂ ہُو ہے اور میں ہوں

عمرِ رفتہ لوٹ کر آتی کہاں ہے
اب تو آنکھوں میں لہو ہے اور میں ہوں

کون کس کو زیر کرتا ہے جہاں میں
طورؔ بس اب ایک تُو ہے اور میں ہوں

○

خالد حمید شیدا
(یو۔ایس۔اے)

دل کو وہ توڑ کر جو ہمارے چلے گئے
سارے وہ لے کے ساتھ سہارے چلے گئے

کالی گھٹا ہے شب ہے اندھیرا ہے ہر طرف
لے کر وہ ساتھ چاند ستارے چلے گئے

آنکھوں کی نیند اُڑ گئی اور ساتھ ساتھ اب
تھے جس قدر بھی خواب پیارے چلے گئے

دل جل کے خاک ہو گیا آتش کے ساتھ سب
شعلے ہوئے تمام ' شرارے چلے گئے

باقی رہیں ادائیں وہ غمزے نہیں رہے
عشوے چلے گئے وہ اشارے چلے گئے

شیدا کو دیکھئے کہ محبت میں عمر بھر
تارے وہ آسماں سے اُتارے چلے گئے

○

پی۔ایس۔جین جوہر
(میرٹھ بھارت)

ساہوکاروں اور زمینداروں کو راس آتا ہے گاؤں
دانے دانے کو جفاکاروں کو ترساتا ہے گاؤں

جب کوئی مزدوری کرنے چھوڑ کر جاتا ہے گاؤں
اس کے کنبے کو سڑک تک چھوڑنے آتا ہے گاؤں

اور کچھ زادِ سفر ہمراہ اس کے ہو نہ ہو!!
چپکے چپکے آنسوؤں کی بھینٹ تو رہتا ہے گاؤں

ہُوک سی اٹھتی ہے دل میں اور کلیجہ منہ کو آئے
شہر میں رکشا چلاتے یاد جب آتا ہے گاؤں

بہن کی شادی ہے سر پہ اور پیسے کی کمی!
قرض کی امید لے کر لوٹ کر آتا ہے گاؤں

سوندھی سوندھی گاؤں کی مٹی کی خوشبو آتی ہے
ریل کے ڈبے میں بیٹھے جب نظر آتا ہے گاؤں

شہر کی اندھی کمائی گر اسے راس آ گئی
لوٹنا تو لوٹنا وہ بھول ہی جاتا ہے گاؤں

○

غالب عرفان
(کراچی)

جہاں سر بسجدہ تھی اک جبیں ترا در نہیں تھا کچھ اور تھا
مرے جسم سے جو قلم ہوا مرا سر نہیں تھا کچھ اور تھا

دمِ آخریں مری عمر کے شب و روز جب نظر آئے تو
وہ طویل و طول مسافتوں کا سفر نہیں تھا کچھ اور تھا

مری فکر کو ترے عکس کو کیا منتقل جو فضاؤں میں
تو مرے وجود پہ جو چھا گیا وہ اثر نہیں تھا کچھ اور تھا

بلا جد و جہد اُسے جو ملا تھا خیال سے بھی وہ ماورا
مجھے جو ملا مری کاوشوں کا ثمر نہیں تھا کچھ اور تھا

شبِ خونچکاں کے نصاب میں جو جگا رہا تھا ساعتیں
نئے آفتاب کی صبح کا وہ گجر نہیں تھا کچھ اور تھا

مری انگلیاں جسے لکھ گئیں مرے عشق کی تھی کتاب وہ
ترا حسن جو مجھے دے گیا وہ ہنر نہیں تھا کچھ اور تھا

○

ضیا شبنمی
(ملتان)

آتشِ غم کہاں اور کہاں' بارشیں
کہہ گئیں حالِ دل بے زباں' بارشیں

کر کے کیموز ملہار کی کوئی دھن
رات گاتی رہیں مہرباں' بارشیں

کوئی تشنہ دہن' تشنۂ جاں رہا
جبکہ برسیں سرِ بادباں' بارشیں

جب بھی بوندوں کی دستک ہوائے سُنی
گنگنانے لگیں سارباں' بارشیں

ہنستے ہنستے کوئی رو دیا اس طرح
ہو گئیں دھوپ کے درمیاں' بارشیں

ریگِ صحرا نے ہم سے کہا رات بھر
مانگتے ہیں دُعا سارباں' بارشیں

فصلِ اُمید کو آس کے باغ کو
کر گئیں ہیں ضیا رائیگاں' بارشیں

○

انوارفیروز
(راولپنڈی)

دیکھا سورج تو ڈر گئیں راتیں
پھر نہ جانے کدھر گئیں راتیں

خود تو چپکے سے گھر گئیں راتیں
تازہ ہر زخم کر گئیں راتیں

تم جو آئے اداس موسم میں
دن تو دن ہیں سنور گئیں راتیں

ایک جنگل تھا اور خاموشی!
اور پھر خود سے ڈر گئیں راتیں

رونقیں تھیں سبھی اُجالے سے
گھر کو ویران کر گئیں راتیں

شمع کی طرح ہم بھی جلتے رہے
یوں بھی اپنی گزر گئیں راتیں

اور کیا تھا جو وہ ہمیں دیتیں
دُکھ ہی جھولی میں بھر گئیں راتیں

ہم ہیں انوار نور کا پیکر
ہم جو آئے نکھر گئیں راتیں

○

غلام مرتضیٰ راہی
(فتح پور بھارت)

ڈبو کر دیکھتا تھا یار مجھ کو
سکھایا تیرنا بے کار مجھ کو

وہی ساحل وہی منجدھار مجھ کو
بتایا اس نے کھیون ہار مجھ کو

کبھی ہوتی نہ پھر لڑنے کی ہمت
ملی اب تک نہ ایسی ہار مجھ کو

ذرا سا سایہ کیا سورج سے مانگا
بنا رکھا ہے بس دیوار مجھ کو

کسی نے وصل کا وعدہ کیا ہے
بلایا ہے سمندر پار مجھ کو

ہے بر حق ''مرگ کا لیدا ز ما لے''
گرا چوٹی سے اے کہسار مجھ کو

○

خورشید انور رضوی

(اسلام آباد)

پہلی بار ہوا ہے ایسا
کسی سے پیار ہوا ہے ایسا

آنکھوں میں خوں بھر آیا
دل پر وار ہوا ہے ایسا

ہنس کر ستم سہے سب اُس کے
اِک دلدار ہوا ہے ایسا

یاروں نے بھی جان دِکھائی
ہاں! اے یار ہوا ہے ایسا

اب نہ کوئی محفل بھائے
دل بے زار ہوا ہے ایسا

کب یوں دل کی کہی کسی سے
اب اظہار ہوا ہے ایسا

آنکھ نے سونا چھوڑ دیا ہے
دل بیدار ہوا ہے ایسا

ہر سُو، ہر پل شور و غوغا
گھر بازار ہوا ہے ایسا

سوتے میں بھی شعر کہے ہیں
کتنی بار ہوا ہے ایسا

○

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی

(بھاگلپور، بہار)

سچائیوں کی کھوج بیانوں کے درمیاں
جیسے ضعیف لاش جوانوں کے درمیاں

کچھ نیکیوں پہ چل کے بھی سرخرو نہیں
کچھ باوقار سے ہیں گناہوں کے درمیاں

تاریخ ساز ہستیاں ستی کہ تھیں کبھی
ان کا بھی نام کب ہے نصابوں کے درمیاں

تم اہلِ دل کی بزم میں دیکھو تو بیٹھ کر
سب کچھ نہیں ملے گا کتابوں کے درمیاں

کچھ مسئلے حیات کے کاس سے بھی ہوتے حل
کیا کیا حقیقتیں ہیں فسانوں کے درمیاں

ایسے نظریہ ساز بھی ہیں علم و فن میں آج
جن کی دلیل جھوٹی ہے دعووں کے درمیاں

ان کو ہی راس آئی مناظر یہ زندگی
جو کھیلتے رہے ہیں بلاؤں کے درمیاں

○

تحسیر نوری

(کراچی)

یخ ہوا کی لہر میں کیسا دھندلکا رہ گیا
توڑ کے طوفاں سے رشتہ صرف صحرا رہ گیا

پیڑ کی پرچھائیاں سب گھر کے اندر آ گئیں
دھوپ سے جلتا ہوا بس ایک پتا رہ گیا

واپسی کا کوئی بھی اب راستہ باقی نہیں
میں تو نیرنگِ جہاں میں کھو کے تنہا رہ گیا

بعض عمرانی مسائل کس طرح میں حل کروں
میں تو تیرے شہر میں بن کر تماشا رہ گیا

زیرِ بار اس کا رہا ہوں، اس سے آخر کیا کہوں
میں تو بن کر شہر میں مٹی کا پتلا رہ گیا

دوست تھے جتنے مرے وہ چھوڑ کر مجھ کو گئے
دھوپ کی صورت بدن میں صرف سایہ رہ گیا

مٹ گیا اک آن میں جب سارے گلشن کا وجود
پیڑ پر یہ ایک غنچہ کیسے تازہ رہ گیا

رنج و غم کے درمیاں ہوتے ہوئے بھی اے تحسیر
سوچتا ہوں اس جہاں میں کیسے زندہ رہ گیا

○

گوہر کریم نگری

(بھارت)

انسان جو مختار ہے مجبور نہیں ہے!!
اُس کو بھی کسی بات کا مقدور نہیں ہے!!

مولا پہ توکل ہے جو مسرور نہیں ہے!!
وہ سینہ کافور ہے پُرنور نہیں ہے!!

ہر رنگ میں ہر روپ میں ہر ذرّہ میں دیکھو!
بوجھل ہے نگاہوں سے پہ مستور نہیں ہے

سنبھلو ابھی قسمت سے کھلا ہے درِ توبہ
دنیا سے حسابات کا دن دُور نہیں ہے

چیونٹی سے بھی لیتا ہے سبق ایک خردمند
کم عقل ہے گر جذبۂ تیمور نہیں ہے

رہتا ہے مرے سامنے میرا مہِ کامل
قسمت سے کوئی شب شبِ دیجور نہیں ہے

سب اپنی تمنا میں گرفتار ہیں گوہر
ہے کون جو اِس دہر میں رنجور نہیں ہے

○

صدیق شاہد
(شیخوپورہ)

کارِ مشکل ہی کیا، دنیا میں، گر میں نے کیا
پر نہ اس بے مہر کے دل میں گزر میں نے کیا

دل میں لیلائے تمنا، پاؤں چھلنی، تیز دھوپ
کس قیامت کا سفر تھا، جو سفر میں نے کیا

تیرا اپنا راستہ تھا، میرا اپنا راستہ
اس پہ بھی اے زندگی تجھ کو بسر میں نے کیا

مسکرا کر اس نے جب بانہیں گلے میں ڈال دیں
پھر جو اس سے رنج تھا صرفِ نظر میں نے کیا

زندہ تھے دشمن تو مجھ کو بازوؤں پہ ناز تھا
آنکھ کو ان کے گزر جانے پہ تر میں نے کیا

چشمِ کم سے دیکھتا تھا مجھ کو، آخر ایک دن
اس کے زعمِ خام کو زیر و زبر میں نے کیا

حرف اس کے قامتِ تحسین پہ جچتے ہی گئے
شاہدؔ ان کو اس طرح حرفِ ہنر میں نے کیا

○

ملک زادہ جاوید
(نوئیڈا بھارت)

مطمئن وہ سبھی سے رہتے ہیں
جگنوؤں کو دیا سمجھتے ہیں

خوشبوئیں آنچوں سی لہجے میں
کتنی کچی وہ بات کہتے ہیں

جنگلوں کے اُداس رستے پر
پاؤں دھرنے سے لوگ ڈرتے ہیں

ہم بھی اپنے شریر بچوں کو
فرصتیں بانٹنے سے بچتے ہیں

جب سے اُس نے چھوا ہے نظروں سے
آئینوں کے طرح چمکتے ہیں

مستقل کوئی بھی نہیں ڈیرا
وہ وفادار یاں بدلتے ہیں

اِس نگر میں اکیلے ہم جاویدؔ
تیری مجبوریاں سمجھتے ہیں

○

کالا سورج، تاریک صبح

فیروز عالم (یو۔ایس۔اے)

شیخ محمد فخر الاسلام صدیقی المدنی کو اپنے نام کی طوالت کے باوجود اس میں المدنی کا اضافہ بہت بھلا لگتا تھا بلکہ اس پر انہیں خاص فخر تھا۔ مدنی صاحب نہ تو عرب تھے نہ ہی انکے آباؤ اجداد عرب سے آ کر ہندوستان میں بسے تھے۔ انکا خاندان تو ہندوستان کے صوبے یوپی کے ایک چھوٹے سے شہر میں نہ جانے کب سے آباد تھا۔ دراصل ہوا یہ کہ جب مدنی صاحب کے والدین حج کرنے ملک حجاز گئے تو مدینے میں قیام کے وقت انکی ولادت کا وقت آ گیا اور اسی مناسبت سے انکے ابا نے انکا نام مدنی رکھ دیا۔ حقیقت تو یہ تھی کہ مدینے میں اتفاقیہ پیدائش کے سوا مدنی صاحب نے کبھی عرب کی سرزمین پر قدم بھی نہیں رکھا تھا مگر یہ شاید اسی حسنِ اتفاق کی برکت تھی یا نام کا مبارک اثر کہ مدنی صاحب کی تمام زندگی اسلام کے رنگ میں رنگ گئی تھی۔ وہ اپنی وضع قطع، کردار اور گفتار اور سوچ کے لحاظ سے ایک نہایت قابلِ تقلید مسلمان اور اچھے انسان تھے۔ زندگی میں اعلیٰ تعلیم کے حصول اور ایک باوقار ملازمت نے انکی شخصیت میں چار چاند لگا دیئے تھے۔

مدنی صاحب اپنی زندگی اور اپنے گھرانے کی سماجی حیثیت سے مطمئین تھے کہ ملک تقسیم ہوا، پاکستان وجود میں آیا اور وہ ان لاکھوں لوگوں کی طرح جو پاکستان کی محبت میں اپنے ماضی اور بزرگوں کی سرزمین کو چھوڑ کر نئے ملک میں آ بسے تھے، کراچی آ گئے۔ یہ ملک اور یہ شہر انکے لئے بالکل نیا اور اجنبی تھا شروع میں تکلیفوں کا سامنا بھی کرنا پڑا مگر انہوں نے ہمت نہیں ہاری اور آخر کار آبکاری کے محکمے میں ایک چھوٹی سی ملازمت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ انگریز فوج کی چھوڑی ہوئی بارکوں میں ایک جگہ انہیں بھی الاٹ ہو گئی اور انہوں نے ایک نئی زندگی کا آغاز کیا۔

تقسیمِ ملک سے جو نئی سماجی اور معاشی صورتحال پیدا ہوئی تھی اس کی وجہ سے لوگوں کی تقدیریں بھی بدل گئی تھیں۔ جو کبھی بہت اونچے تھے زمین پر آ گرے تھے اور جو بدحال تھے وہ ترقی اور مالی فارغ البالی کی نئی منزلوں کو چھو رہے تھے۔ مدنی صاحب کے پاس شاید وہ جوہر نہ تھا جو تقسیم کے فوراً بعد کراچی میں مالی کامیابی کے لئے ضروری تھا اس لئے وہ اس بندربانٹ اور لوٹ کھسوٹ میں ناکام رہے اور نتیجتاً بدحالی اور تنگ دستی کا شکار رہے۔ مزید یہ کہ اولاد کے معاملے میں ان پر قدرت خاص مہربان تھی اور وہ آگے پیچھے پانچ بیٹوں اور ایک بیٹی کے باپ تھے کم آمدنی اور کثیر اولاد ہونے کی وجہ سے انکی زندگی انتہائی دشواری اور غربت میں بسر ہو رہی تھی۔ لیکن اس کے باوجود ان کی ایمانداری، اخلاقی قدروں کی پابندی اور اللہ کی مرضی کے آگے خود سپردگی اپنی جگہ قائم تھی۔ وہ بہرحال میں اللہ کا شکر بجا لاتے تھے۔

وقت تیزی سے گزرتا رہا۔ چھوٹی سی بچی زاہدہ کے علاوہ بچے پل بڑھ کر جوان ہو گئے۔ باقی لڑکوں اور بیٹی نے تو معمولی تعلیم حاصل کی مگر ایک بیٹا زاہد مدنی خوش قسمتی سے آگے نکل گیا اور اسکالرشپ پر پڑھنے امریکہ پہنچ گیا۔ وہ پھر امریکہ کا ہی ہو رہا اور دس سال دو سال میں گھر والوں سے ملنے وطن واپس آتا تھا۔ اس دفعہ جو وہ ماں باپ سے ملنے گھر لوٹا تو اس کے پاس کنبے کی ترقی کا نیا فارمولا تھا۔ اس نے مدنی صاحب سے ضد کی کہ وہ اپنی بیوی بچوں کے ساتھ امریکہ ہجرت کر جائیں۔ مدنی صاحب کی نظر میں امریکہ شیطان کا مسکن تھا۔ ان کے خیال میں وہاں کی مشینی اور تیز رفتار زندگی انسانی جذبات، احساسات اور روح کے لئے زہرِ قاتل تھی۔ وہ وہاں کے اخلاق سوز ماحول، جرائم سے بھرپور معاشرے اور جنسی بے راہ روی کے تصور سے ہی کانپ اٹھتے تھے مگر امریکن بیٹے نے بہت جوش و خروش سے سب کو قائل کیا کہ مشینی زندگی سے مدنی صاحب کو کیا واسطہ؟ وہ تو بیٹوں کے گھر میں آرام سے رہ کر عیش کریں گے۔ اور جہاں تک جرائم کا تعلق ہے تو وہ تو چند بڑے شہروں کے کچھ خاص اندرونی علاقوں تک محدود ہیں اور یہ بھی کہ اخلاق سوز معاشرے کا پاکستانی گھرانوں پر کوئی اثر نہیں کیونکہ پاکستانیوں نے اپنی تہذیب اور روایات کو زندہ رکھا ہے بلکہ یہ کہہ کر تو اس نے سب کو حیران کر دیا کہ اب تو امریکہ میں پیدا ہونے والی لڑکیاں گھر کے باہر حجاب کا استعمال کرتی ہیں۔ پھر انکی یہ دلیل بھی خاصی وزنی تھی کہ اس کی بہن جنکی معمولی شکل و صورت کی وجہ سے اب تک شادی نہیں ہوئی تھی امریکہ میں گرین کارڈ کی وجہ سے انکی بھی شادی پکی ہے کیونکہ وطنوں مسلمان لڑکے جو امریکہ کی شہریت چاہتے ہیں ایسی لڑکیوں کی تلاش میں ہیں۔

کراچی میں تنگ دستی سے گذر کرنے والے کنبے کے لئے امریکہ منتقل ہو جانے اور وہاں رہنے بسنے کا تصور ہی ایک جادوئی خواب سے مختلف نہ تھا۔ مدنی صاحب نے لاکھ مخالفت میں زور لگایا مگر یوں لگتا تھا کہ انکے خلاف خاندان میں بغاوت ہو گئی ہو۔ ایک محاذ بن گیا تھا اور ماں سمیت بیٹوں اور بیٹی نے زاہد کی ہاں میں ہاں ملائی۔ سب سے بڑا بیٹا شادی شدہ تھا بلکہ انکی بیٹیاں بھی جوانی کی حد میں قدم رکھ رہی تھیں۔ وہ بڑی حد تک اپنے باپ پر گیا تھا۔ انکی بیٹیاں کراچی میں گھر پر بھی سر سے دوپٹہ نہیں اتارتی تھیں۔ وہ امریکہ آنے پر تیار نہیں تھا مگر تمام بھائیوں اور ماں نے اسے بھی اصرار کر کے راضی کر ہی لیا اور اس طرح یہ کنبہ شکاگو میں آ بسا۔

لیکن ہجرت بھی ہر ایک کو راس نہیں آتی۔ کئی سال گذرنے کے بعد بھی زاہد کے علاوہ کوئی بھائی بھی سیون الیون یا گروسری اسٹور کی نوکری سے آگے نہ بڑھ سکا اور مدنی صاحب شدید تنہائی کا شکار ہو گئے۔ صرف بیوی سے بھی کب تک باتیں کریں۔ نہ محلے داری نہ اڑوس پڑوس کے درمیان اپنے ہم عمروں کی

چھوٹی سی بچی سے صبح کی سیر نہ خاندان والوں کا آنا جانا۔ انہیں کراچی کی رونقیں ٹوٹ ٹوٹ کر یاد آتیں۔ وہ دن بھر بیٹھے کھڑکی سے باہر ٹنڈ منڈ درختوں کو تکا کرتے۔ پھر سردیوں میں جلد اندھیرا ہو جانا اور برفباری کے ساتھ تیز ہوا سیٹیاں بجاتی ہوئی دروازوں کھڑکیوں پر دستکیں دیتی۔ بس اپنا دل مسوس کر رہ جاتے۔ پھر تمام لڑکے الگ ہو کر خدا جانے کہاں اور کس کے ساتھ رہنے لگے تھے۔ مالی طور پر غیر مستحکم ہونے کی وجہ سے ان میں سے کسی کی شادی بھی نہیں ہوئی تھی۔ بیٹی کا بیاہ بھی مقدور بھر کیا تھا اور وہ کسی چائنا ٹاؤن میں کام کر کے زندگی کے دن کاٹ رہی تھی۔ ادھر ہوا یہ کہ امریکہ آتے ہی ایک دن بڑے بیٹے کے پیٹ میں درد اٹھا ہسپتال پہنچتے پہنچتے آنت پھٹ چکی تھی تین دن میں وہ جوان بیوی اور نوجوان بچیوں کو چھوڑ کر اللہ کو پیارا ہو گیا اب انکی بیٹیوں نے گھر چلانے کے لئے چھوٹی چھوٹی نوکریوں کو سہارا لیا اور فاسٹ فوڈ کی یونی فارم پہن کر سر پر کاغذ کی ٹوپیاں لگا کر ہیم برگر کی پڑیاں باندھنے لگیں۔

مدنی صاحب کے لئے یہ سب ناقابل برداشت تھا وہ اپنی دل کی بھڑاس کسی سے نکال بھی نہیں سکتے تھے۔ وہ شدید اعصابی کشیدگی، بلڈ پریشر کی زیادتی اور جذباتی تناؤ کی وجہ سے فالج کا شکار ہو کر ہمیشہ کے لئے معذور ہو گئے اور اس طرح ایک نرسنگ ہوم میں وہیل چیئر کی زینت بن کر رہ گئے۔ ڈاکٹر نے کنبے کو بتا دیا تھا کہ انکی دماغ کی رگ سے خون رِس رہا ہے اور اگر انکو کسی قسم کا جذباتی جھٹکا لگا تو رگ پھٹ جائیگی اور یہ جانبر نہ ہو سکیں گے۔ گھر والے انکی اب بھی وہی عزت کرتے تھے جو پہلے تھی اور اپنے طور پر انہیں خوش رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔

آج عید کا دن تھا۔ سارے لڑکے بیوی بچی اور پوتیاں ان سے عید ملنے نرسنگ ہوم آئے تھے انہیں نرسنگ ہوم میں داخل ہوئے اتنے ماہ ہو گئے تھے کہ انہیں باہر کی دنیا کی کوئی خبر نہیں تھی۔ وہ وہیل چیئر پر بیٹھے بچوں کی طرح غوں غاں کی آوازیں نکالتے رہتے تھے یا اپنے والد کی یادگار، مدینے میں خریدے عصا کو ایک ہاتھ سے سہلاتے رہتے تھے۔ اس وقت بھی تمام کنبہ انکے چاروں طرف تھا اور انہیں خوش کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ سب سے بڑی پوتی زیبا مدنی جو اب بھرپور جوان تھی اور بیحد خوبصورت اور گوری چٹی تھی عید کا کامدار سبز جوڑا پہنے انکے سامنے کھڑی تھی۔ اچانک ایک طویل القامت سیاہ فام حبشی نوجوان لڑکا تیزی سے انکی طرف آیا اور ایک کریہہ مسکراہٹ کے ساتھ زیبا کو دیکھا اور انکی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے اپنے سینے کی طرف کھینچا۔ مدنی صاحب کا چہرہ سرخ ہو گیا وہ یہ سمجھے کہ یہ غیر لڑکا موقعے کا فائدہ اٹھا کر ان کی عزت پر ہاتھ ڈال رہا ہے۔ مفلوج ہونے کے باوجود انہوں نے انتہائی قہر کے عالم میں اپنا عصا اٹھا کر اسے مارنے کی کوشش کی مگر عین اسی وقت انکی بچی درمیان میں آ گئی اور چیخ کر بولی "ابا۔ آپ کیا کر رہے ہیں؟ یہ تو زیبا کا دوست ہے" ابھی تک شاید اس میں اتنی رواداری تھی کہ اس نے "دوست" کا لفظ اردو میں کہا تھا۔ مدنی صاحب کی آنکھیں چند لمحوں کو حیرت سے پھیلیں۔ انکا دماغ تیزی سے چل رہا تھا "دوست، فرینڈ۔ یعنی بوائے فرینڈ" وہ اس سے زیادہ کچھ نہ سوچ سکے

زیبا مدنی، شیخ محمد فخر الاسلام صدیقی المدنی کی پوتی اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ انکے سامنے کھڑی تھی جو اسے سینے سے لگا کر چومنے کی کوشش کر رہا تھا۔ انکی گلے کی رگیں پھول گئیں، چہرہ پہلے سرخ اور پھر نیلا پڑ گیا، غرغرے سے عجیب آوازیں نکلیں ہونٹ نیلے ہو کر پھڑ پھڑائے اور انہیں ایک زور کی ہچکی آئی پھر گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔ انکی پتھرائی ہوئی آنکھیں زیبا پر لگی تھیں جیسے پوچھ رہی ہوں کیا یہی وہ صبح ہے جسکا اس نے وعدہ کیا تھا۔

☆

اسلامی یونیورسٹی کے نیوز لیٹر کا خصوصی شمارہ شائع ہو گیا

☆

"نیوز لیٹر" کے اس خصوصی شمارے میں عالمی پائے کی مدبر، دانشور، سیاستدان اور پاکستان پیپلز پارٹی کی سابق چیئرمین محترمہ بےنظیر بھٹو شہید کی پہلی برسی کے موقع پر منعقدہ سیمینار 'تقاریر' تصاویر کی روداد اور برطانیہ کے وزیر خارجہ ڈیوڈ ملی بینڈ اور انصاف کے وزیر جیک سٹرا کی اسلامی یونیورسٹی میں آمد اور مسلمان دنیا اور دیگر اقوام کے مابین تعلقات پر تقاریر شامل ہیں۔ دیگر موضوعات میں ۲۰۰۵ء کے زلزلے کی یاد میں خصوصی تقریب، امریکی خارجہ پالیسی کے دوہرے معیار پر خود امریکی دانشوروں کے خیالات، مغل سلطنت کے بانی بیرم خان پر خصوصی لیکچر' کیمساوس کی عالمی کونسل کے وفد کی آمد، اسلامی یونیورسٹی اور چینی جامعات کے مابین تعاون، یونیورسٹی میں عالمی کتاب میلے کی تفصیلات، ذرائع ابلاغ سے اسلام کی خدمت کے موضوعات شامل ہیں۔ نیوز لیٹر میں ممتاز اسکالر ڈاکٹر خالد علوی مرحوم اور یونیورسٹی کے اقتصادیات کے شعبے کے پروفیسر ارشد مرزا مرحوم کے بارے میں یونیورسٹی کے اساتذہ اور دانشوروں کے تاثرات بھی شامل ہیں۔ نیوز لیٹر میں یونیورسٹی کے متعدد شعبوں کی خبریں اور عالمی کانفرنس میں اساتذہ کرام کی نمائندگی کی تفصیلات بھی دی گئی ہیں۔ نیوز لیٹر میں یونیورسٹی کی سرگرمیوں پر بے شمار تصاویر بھی موجود ہیں۔ نیوز لیٹر کی ڈیزائننگ راجہ عالم زیب نے کی جبکہ تصاویر محمد شاہد مرزا نے فراہم کیں۔ نیوز لیٹر محمد رشید کی سربراہی میں مشتمل ایک کمیٹی تقسیم کر رہی ہے۔

☆

مرے تھے جن کے لئے

روحی فرخ (کینڈا)

شلپا تین دن سے نظر نہیں آئی ہے۔

ان تین دنوں میں نہ جانے کتنی بار مجھے ایسا لگا جیسے ابھی وہ دروازے سے سر اندر کر کے اپنی کھنکتی ہوئی آواز میں پوچھے گی بھابھی میں آ جاؤں۔ نہ جانے کتنی بار میں نے ماحول کا سونا پن محسوس کیا اور کتنی ہی بار اس کے ہاں جا کے اسکی خیریت پوچھنی چاہی۔ مگر ہمت نہیں پڑی۔

مجھے معلوم ہے کہ وہ بہت بیمار ہے۔ مجھے یہ بھی پتا ہے کہ اس نے کچھ نہ کھانے پینے کی قسم کھائی ہے اور رو رو کر اپنی آنکھیں سجا لی ہیں لیکن ہر وقت گلے میں بانہیں ڈال کر پیار جتانے والی شلپا سے کچھ ایسی غیریت اور شرم محسوس ہو رہی ہے کہ جا کے اس کو ایک نظر دیکھ لینے کی خواہش پوری نہیں کر پا رہی۔

مجھے خالد پر حیرت ہے میرا اور دیور جس کے لئے میں بھابھی، ماں، بہن سب کچھ ہوں، اور جس کا شلپا کے بغیر کچھ دیر گزارنا مشکل تھا، یوں انجان بنا ہوا ہے جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ جیسے میری ساری نصیحتیں، اس کے لئے کوئی معنی نہ رکھتی ہوں۔ جیسے اسکا اس سارے قصے سے کچھ لینا دینا ہی نہ ہو۔

ہم دو سال پہلے اس اپارٹمنٹ کمپلکس میں آئے تھے۔ یہاں آمد کا مقصد میرے میاں کی جاب تھی۔ یہاں بہت سے دوسرے انڈین اور پاکستانی خاندان آباد تھے اور سب میں خوب میل ملاپ رہتا تھا۔ شلپا سے میری ملاقات اپنی آمد کے دوسرے دن ہوئی جب اتوار کی صبح وہ محلے کے بھانت بھانت کے بچوں کو جمع کئے شور مچا مچا کر کرکٹ کھیل رہی تھی۔ بوٹے سے قد کی گول چہرے والی اس اٹھارہ انیس سال کی لڑکی میں جو چنچل پن اور شرارت تھی وہ دیکھنے کے قابل تھی۔ خالد کو، اسکی کشش کھینچ کر باہر لے گئی یا کرکٹ کی، یہ تو پتا نہیں، لیکن تھوڑی دیر کے کھیل کے بعد انکی دوستی ضرور ہو گئی۔ پھر وہ نہ صرف مجھ سے بھی ملنے آئی بلکہ اپنے ہاں رات کے کھانے پر بھی بلا گئی۔ اس کے گجراتی لب و لہجے کی ہندی میں خالد کو کھالد اور خود کو سلپا کہنا مجھے بڑا بھلا لگا۔ تھوڑی دیر میں اونچی سی ساڑھی باندھے گول مٹول سی اماں کو بھی ملوانے لائی جنہوں نے پھر رات کے کھانے کا پر خلوص نیوتا دیا۔ وہ کھانا مجھے آج تک یاد ہے۔ باورچی خانے میں چھوٹی چھوٹی چپاتیوں کا جا رہا تھا شلپا، اور اسکے بے ضرر معصوم سے گھر والے۔ ماتا جی، پتا جی، لالا جی سا بھائی جیتو اور بڑے سے اسکرین کے ٹی وی پر نظریں جمائے دادا جی۔ کھانا اتنا سادہ اور ماحول اتنا بے تکلف تھا کہ پہلی ملاقات کا شائبہ بھی نہ رہا۔ رخصت ہونے تک ہمیں ان سب کے بارے میں خاصا کچھ معلوم ہو چکا تھا۔ جیتو انگلش بہت اچھا کرتا ہے۔ دادا جی کو اردو، ہندی نہیں، صرف گجراتی آتی ہے اور یہاں انڈین فلموں کا انداز بھی نہیں ہوتا۔ خالد، شلپا اور جیتو کی اپنی محفل جمی تھی جس میں شلپا کے قہقہے نمایاں تھے۔ وہ شام ان شاموں میں سے ایک تھی جو اپنے دامن میں صرف خوشی کو رہنے دیتی ہیں لیکن بہرحال گزر جاتی ہیں۔

گزرتے وقت کے ساتھ شلپا کا میرے گھر آنے اور خالد سے تعلق گہرا ہوتا چلا گیا۔ خالد کو اس نے اپنی ہی کمپنی میں جاب دلوا دی۔ یوں ان کا ساتھ صبح شام کا ہو گیا۔ اسکے علاوہ رات کے کھانے کے بعد دونوں واک پر نکل جانا، اور چھٹی والے دن ساتھ مووی یا مال چلے جانا عام بات تھی۔ ہم کبھی کبھی مذاق میں خالد سے کہتے کہ تم تو شلپا کو پیارے ہو گئے ہو۔ اس مذاق نے کب حقیقت کا روپ دھارا اور کب وہ واقعی ایک دوسرے کو پیارے ہو گئے، یہ تو معلوم نہیں لیکن مجھے پہلی بار اس وقت کچھ غیر معمولی سا محسوس ہوا جب ایک دن شلپا نے باتوں باتوں میں مجھ سے کہا کہ خالد کہتا ہے وہ صرف مسلمان لڑکی سے شادی کر سکتا ہے۔ اور یہ کہ کیا میں اس کو نماز پڑھنا سکھا سکتی ہوں۔ اسے کٹر ہندو گھرانے کی لڑکی سے جس کی اماں نے گھر میں باقاعدہ مندر بنایا ہوا تھا، اور جو خود آئے دن نا جانے کون کون سے برت رکھے رہتی تھی یہ بات سننا کچھ اتنا غیر متوقع تھا کہ میں اسکی شکل دیکھتی رہ گئی۔ اس وقت تو اس نے بات آئی گئی کر دی مگر پھر اسکے اسلام کے بارے میں تجسس نے مجھے حیران کر دیا۔ اس نے اپنی جاب کے قریب کسی مسجد کے مولوی صاحب دریافت کر کے ان کے پاس اسلامی معلومات کے لئے بھی کبھی کبھار جانا شروع کر دیا تھا۔ اب جب حالات کا باریک بینی سے جائزہ لیا تو میں نے دیکھا کہ خالد کی آنکھوں میں اسے دیکھ کر جو جوت جلتی ہے یا شلپا کے چہرے پر خالد کے لئے جو رنگ بکھرتے ہیں وہ صرف دوستی کے نہیں۔ آئے دن اپنے ہاتھوں سے وہ جو قسم قسم کے حلوے، سموسے، اور مٹھائیاں بنا کر لاتی ہے وہ ہمارے لئے در اصل خالد کے طفیل ہوتے ہیں۔ اسے معلوم تھا کہ اچھا کھانا خالد کی کمزوری ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ جس کھانے کو خالد اچھا کہتا اگر دانا تھا بھنے ہوئے گوشت کے پکوان، وہ پکانا اس کے بس میں نہیں تھا۔ بلکہ کئی بار ایسا ہوا کہ ہمارے گھر آتے آتے سالن کی مہک محسوس ہوتے ہی کوئی بہانا کر کے الٹے قدموں پلٹ جاتی۔ ایک بار خالد کے ساتھ جاب سے واپسی پر کیا پکایا ہے پوچھتے پوچھتے اس نے دیگچی کا ڈھکن اٹھا کر مرغی پکتی دیکھ لی تھی۔ اور زور کی ابکائی لی تھی۔ میرے لئے یہ بات سمجھ میں آنے والی تھی لیکن جو بات مجھے حیران کرتی تھی وہ اسکا خالد کے لئے ایثار اور پیار کا اظہار تھا۔ لگتا تھا کہ اب اسے کسی کی پروا نہیں، وہ صرف خالد کی پسند کے سانچے میں ڈھلنا چاہتی تھی اور بس۔ مجھے وہ ہر لحاظ سے پسند تھی اور خالد کا اس سے شادی کرنے کے بارے میں سوچنے پر کم از کم مجھے کوئی اعتراض نہیں تھا۔ جب کہ وہ اسکے لئے مسلمان ہونے پر بھی راضی تھی۔ اب تک خالد نے اس سلسلے میں مجھ سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ وہ اپنے بھائی سے زیادہ مجھ سے بے تکلف تھا اور مجھے

امید تھی کہ جلد یا بدیر وہ بات ضرور کرے گا۔لیکن لگتا تھا اسے کوئی جلدی نہیں ہے اسکے برعکس شلپا کا بس نہیں چلتا تھا کہ چیخ چیخ کے دنیا کو بتا دے۔ایک دن میں نے اس سے چھیڑ چھاڑ کے انداز میں اس سلسلے میں بات کی تو اس نے اپنا دل میرے سامنے کھول دیا۔باتوں باتوں میں اس نے بتانے میں بھی کوئی عار نہ سمجھی کہ اسکے اور خالد کے درمیان سارے فاصلے طے ہو چکے ہیں اور وہ اسکو دل وجان سے اپنا پتی مان چکی ہے۔یہ ایک نیا انکشاف تھا اور اس کے بعد خالد سے اس سلسلے میں بات کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہ بچا۔

دوسرے دن چھٹی تھی اور وہ گھر پر تھا۔میرے میاں بچوں کو لے کر کسی کام سے باہر نکلے تو میں نے موقع غنیمت جان کر اس سے بات کرنا چاہی۔پہلے اشاروں کنایوں میں اور پھر اسکے کسی طرح بات نہ کرنے پر کھل کر۔پتی والی بات پر جب اسنے نگاہیں جھکا کر پہلو بدلا تو مجھ سے نہیں رہا گیا۔میں نے کہا کہ اب تم دونوں کو جلد شادی کر لینی چاہئے۔شادی کا نام سنتے ہی اس نے جھٹکے سے سر اٹھایا اور کہا

"کیا؟شادی؟"

"ہاں،شادی،تم شلپا سے ہی شادی کرنا چاہتے ہو نا؟"

"یہ آپ سے کس نے کہا؟وہ ٹھیک ٹھاک لڑکی ہے مجھے پسند ہے لیکن اس سے شادی کے بارے میں میں نے کبھی نہیں سوچا۔"

میں نے کچھ حیرانی سے کہا"کچھ خدا کا خوف کرو خالد،تم اسکے ساتھ اتنا آگے بڑھ چکے ہو،وہ تمہیں دل وجان سے اپنا شوہر مانتی ہے اگر تمہارا اس سے شادی کا کوئی ارادہ نہیں تھا تو تم نے یہ سب کچھ کیوں کیا؟"

وہ ڈھٹائی سے بولا"میں نے اسکے ساتھ کوئی زبردستی نہیں کی۔جو کچھ ہمارے بیچ میں ہوا اسمیں اسکی مرضی شامل تھی۔مگر ان سب باتوں کا میرا اس سے شادی کرنے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔آپ خود سوچیں میں ایسی لڑکی سے شادی کیسے کر لوں جو کھانے کے نام پر گھٹی دال اور سبزی بنانا جانتی ہے۔جو گوشت،مرغی پکانا تو ایک طرف رہا اسکے پکنے کی مہک سے بھاگی بھاگی ہوئی دور بھاگتی ہے۔نہیں بھابھی،میں زندگی بھر دال بھات اور پکوڑے کھا کر گزارہ۔۔۔۔۔"

تبھی ہم دونوں کو ایک ساتھ احساس ہوا کہ وہ دروازے میں کھڑی ہے ہکا بکا،بے یقینی کی کیفیت میں۔

کچھ کہنے اور نہ کہنے کے درمیان۔اسکی آنکھوں میں آنسو تھے گالوں کی سرخی غائب تھی اور ہونٹ سوکھے ہوئے تھے۔اتنی خاموشی تھی کہ ہمیں اپنی دھڑکن تک سنائی دے رہی تھی۔پھر اسنے کانپتے ہونٹوں سے خالد کو دیکھ کر کہا"مولوی صاحب تو کہتے ہیں کہ مسلمان وہ ہے جو کسی سے دھوکہ کھاتا نہیں اور کسی کو دھوکہ دیتا نہیں،پر تم نے مجھے دھوکہ دیا خالد مجھے نہیں پتا تھا کہ میں جس کے لئے اپنا دھرم چھوڑ چلی تھی وہ اسے مجھ سے زیادہ اپنی مرغی پیاری ہے۔پھر وہ مڑی اور دور بھاگتی چلی گئی۔"

اور آج تیسرا دن ہے کہ وہ نظر نہیں آئی اور شاید اب وہ شلپا کبھی نظر بھی نہ آئے جسکی شرارتوں اور معصوم باتوں سے ہم سب کے دل آباد تھے،اور جو کسی کو دھوکہ دینا اور کسی سے دھوکہ کھانا نہیں جانتی تھی۔

☆

عظیم الشان

اس الیکشن کی حقیقت جان کر انجان ہو
کیا بصیرت ہے تمہاری تم عظیم الشان ہو
قوم لیکن اب نہ دھوکا کھائے گی جانِ عزیز
جانتے ہیں سب کہ تم کیسے سیاست دان ہو

ہم نہیں ہوں گے

اضافہ قیمتوں میں کر کے بہتر کر معیشت تو
معیشت ہی معیشت ہوگی بہتر ہم نہیں ہوں گے
یہ کیسا ملک ہے اہلِ وطن پر ٹیکس ہے جینا
ہیں جتنے ٹیکس عاید اس وطن میں کیا کہیں ہوں گے

رہ گیا

جانے دکان دار نے کیا کہہ دیا اُسے
سینے پہ ہاتھ رکھ کے خریدار رہ گیا
حسرت بھری نگاہوں سے دیکھا دکان کو
آیا تھا چینی لینے نمک خوار رہ گیا

حقیقی لطف

خدا آباد رکھے واپڈا کے اہل کاروں کو
کہ جن کے دم سے موسم کا حقیقی لطف لیتے ہیں
اگر یہ مہرباں ہوتے تو ہم کو علم کب ہوتا
کہ سردی اور گرمی کا زمانہ کس کو کہتے ہیں

☆

پروفیسر عزیز جبران انصاری کی تازہ کتاب

"چھیڑ خوباں سے"

چند انمول موتی

خوف میں گھرا ہوا آدمی

سلمان ڈار (جہلم)

دکان کے کاؤنٹر پر بیٹھے ارشد کو جب لالی نے آ کر بتایا کہ کل وہ سامان خریدنے لاہور خود جائیں گے کیونکہ حالات بہت خراب ہیں تو ارشد کی غیرت نے جوش مارا اور اس نے کہا کہ نہیں وہ خود تھوک خریداری کیلئے لاہور جائے گا۔ ویسے بھی لالا کی طبیعت جب سے خراب رہنے لگی تھی ارشد ہی لاہور جاتا تھا۔ کچھ دیر بحث کے بعد لالا جی تو مان گئے مگر ارشد نے سوچا کہ وہ کیا کر بیٹھا ہے؟

مختلف چینلز پر دہشت گردی اور بم دھماکوں کی خبریں دیکھ دیکھ کر اسکی کنپٹیوں کی نسیں اکثر اوقات اپنی جگہ چھوڑ کر دماغ سے باہر آنے کی کوشش کرتی تھیں اور دل بھی تیزی سے دھک دھک کرنے لگتا تھا۔ کچھ ہی دیر پہلے نیوز بلیٹن میں لاہور میں بم دھماکے کی خبر سنی تھی۔ ٹیلی ویژن اسکرین پر منہدم عمارت اور انسانوں کی لاشیں بکھری پڑی تھیں اور نیچے سلائیڈ چل رہی تھی اس پر جنوبی افریقہ کے کسی علاقے میں فائرنگ سے ہلاک ہونے والوں کی خبریں تھیں۔

کاؤنٹر پر دوپہر کا اخبار رکھا تھا جس میں ایک ہی خاندان کے کراچی میں ہلاک ہونے والے پانچ افراد کی تصویریں تھیں۔ ارشد نے سوچا آدمی جس چیز سے دور بھاگے وہی اسکے تعاقب میں لگی رہتی ہے۔ وہ تو بقرعید پر چھری چلتے وقت بھی جانور کے قریب بھی گھبراتا ہوا تھا اور اب یہ حال ہے کہ جب بھی ٹی وی کھولو لاشیں اور خون ہی دیکھنے کو ملتا ہے۔

اس سے پہلے وہ ہمیشہ لاہور جانے کے بہانے ڈھونڈتا رہتا تھا جہاں اس کا کزن رضوان بھی منتظر رہتا تھا مگر اب ساری دنیا سے زیادہ اسے مریدکے کے اس چھوٹے سے قصبے میں گھر اور دکان کے درمیان شٹل کاک بنے رہنے میں عافیت معلوم ہوتی تھی۔

لاہور تو بہر حال جانا ہی تھا جس کیلئے اس نے ابھی سے تیاری شروع کر دی تھی۔ سب سے پہلے اپنے موبائل میں کارڈ لوڈ کیا تا کہ گھر والوں کو خیریت کی اطلاع دیتا رہے حالانکہ موبائل میں پہلے سے مناسب رقم موجود تھی۔ حفظ ماتقدم کی شدت نے اسے ایسا آن لیا کہ اپنا اصلی قومی شناختی کارڈ بھی رات ہی سے اپنے بٹوے کی زپ والی جیب میں اس خیال سے رکھ لیا کہ کسی حادثے کی صورت میں شناخت میں مشکل پیش نہ آئے۔ گھڑی کو الارم لگا کر جب سونے کے لیے بستر پر لیٹا تو دماغ کی اسکرین پر نیند کی بجائے نیوز بلیٹن چل رہے تھے۔ ابھی چند ساعت ہی بستر پر کروٹیں بدلی تھیں کہ موبائل فون کو چارج کرنے کیلئے اٹھا لیکن اسکی بیٹری پہلے سے پُر تھی۔ جب رات آدھی سے زیادہ گذر گئی تو نیند کا انتظار کرنے کی بجائے ارشد نے نیند کی آدھی گولی پانی کے ساتھ نگل لی جو وہ اکثر لیا کرتا تھا۔ گولی نے اپنا اثر دکھلایا اور نیوز بلیٹن رفتہ رفتہ بند ہونے لگے۔

جب گھڑی کے الارم نے اسے بیدار کیا تو وہ بمشکل تین گھنٹے سویا تھا۔ مریدکے کے بس اسٹینڈ سے لاہور جانے والی بس کی سیڑھی چڑھتے ہوئے بھی اسکے قدم لڑکھڑا رہے تھے اور دماغ ابھی بھی بوجھل تھا۔

بس میں اترتی چڑھتی سواریوں کے شور سے طبیعت اور بھی گھبرانے لگی۔ پچھلی سیٹ پر سے ایک آدمی اٹھا تو ارشد نے غنیمت جانا اور سیٹ پر جا بیٹھا اور اپنا چھوٹا سا بیگ گود میں رکھ لیا۔ کنڈکٹر ایک طالب علم سے بوڑھے آدمی کیلئے سیٹ خالی کروانے کیلئے جھگڑ رہا تھا اور بوڑھا اس بات سے خفا تھا کہ اگر بس میں جگہ نہیں تھی تو اسے بٹھلایا کیوں گیا تھا؟

اسی شور شرابے میں بس ہارن دیتی ہوئی مریدکے کے اسٹاپ کو چھوڑ کر اپنی اگلی منزل کی طرف بڑھنے لگی۔ ارشد گود میں بیگ رکھے پچھلی سیٹ پر دبکا ہوا تھا۔ ماحول ذرا پرسکون ہوا تو اس نے اپنے آس پاس بیٹھی سواریوں کو بغور دیکھا اور ان کے چہروں سے جائزہ لگانے کی کوشش کی جو سب کے سب اسے دہشت گرد لگ رہے تھے۔ پھر اس نے اپنی سیٹ کے نیچے سامنے اور ارد گرد نظر ڈالی اور اچھی طرح اطمینان کر لیا کہ ایسی کوئی مشتبہ چیز وہاں موجود نہیں ہے۔ وہ پھر سے گود میں رکھے بیگ پر سر رکھ کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ نیند نہ آئی تو دماغ میں اپنی حفاظت کی منصوبہ بندی شروع کر دی جس میں بس اسٹاپ پر اتر کر سب سے پہلے گھر والوں کو فون کر کے اطلاع دے گا کہ وہ خیریت سے پہنچ گیا ہے۔ پھر وہ جس رکشے پر بیٹھے گا اسکی سیٹوں کو بھی اچھی طرح دیکھے گا۔ ارشد نے فیصلہ کیا کہ وہ شیرانوالہ گیٹ سے اندرون شہر داخل ہو گا اور اسی راستے سے ہوتا ہوا شاہ عالمی کی مارکیٹ میں جائے گا۔ اس راستے کا انتخاب کرنے کی وجہ یہ تھی کہ اس سڑک پر ایک برس پہلے بم کا بڑا زبردست دھماکہ ہو چکا تھا جس میں درجنوں افراد ہلاک اور بہت سے زخمی ہوئے تھے۔ ارشد کا خیال تھا کہ جس جگہ ایک مرتبہ ایسا حادثہ ہو چکا ہو عام طور پر وہاں دوبارہ ایسا واقعہ نہیں ہوا کرتا۔ پھر وہ بڑی احتیاط سے بازار میں چلنے کیلئے وہ راستہ اختیار کرے گا جہاں لوگوں کا زیادہ رش نہ ہو اور ساتھ ساتھ وہ اپنے موبائل سے گھر والوں کو خیریت کی اطلاع دیتا رہے گا۔ شاہ عالمی سے خریداری کرنے کے بعد وہ اپنے کزن رضوان کو فون کرے گا کیونکہ خالہ نے اسے خاص طور پر اس سے مل کر آنے کی ہدایت کی تھی اور اسکے لئے کپڑوں کا ایک جوڑا بھی بھیجا تھا۔ یہ سب کام ختم کرنے کے بعد وہ بادامی باغ لاری اڈے پر آئے گا اور مریدکے کیلئے گاڑی پکڑے گا۔

یہ ساری فلم ارشد کے دماغ میں چل رہی تھی کہ اچانک بس کی درمیانی سیٹوں میں سے مسافروں کی آوازیں آئیں جو کسی نامعلوم گٹھڑی کے

بارے میں ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے مگر پوری بس میں کوئی اسکا وارث نہ تھا۔ معلوم ہوتا تھا جیسے کسی لوہے کے ڈبے کو دو تین موٹے کپڑوں میں لپیٹ کر مضبوطی سے گرہیں لگائی گئی تھیں۔ وہی طالبعلم جو کنڈکٹر سے بحث کے بعد بزرگ کو سیٹ دے کر خود کھڑا تھا گٹھڑی ایک طرف دھکا کر اس پر بیٹھ گیا۔

بزرگ بولا "ارے میاں ذرا ٹٹول کر دیکھو تو سہی اس میں کوئی بم وغیرہ نہ ہو"

طالبعلم نے جواب دیا "بابا جی ساری دنیا آج بموں پر بیٹھی ہے میں اکیلا تھوڑا ہوں۔ بھلا کس کس کی فکر کریں آپ؟" پھر وہ کنڈکٹر سے مخاطب ہوکر "بھائی پتہ کرو یہ گٹھڑی کس کی ہے آجکل حالات بہت خراب ہیں"

کنڈکٹر بے پرواہی سے کان میں قلم اڑستے ہوئے بولا "ابھی کوئی نہ کوئی اس کا مالک آجائے گا"

ارشد یہ سارا تماشا دیکھ رہا تھا۔ اسکا دل تیزی سے دھک دھک کرنے لگا اور دماغ کی رگیں بھی پھوٹنے لگیں۔ ایک دوسرے مسافر نے کنڈکٹر کو مشورہ دیا کہ وہ سامان اٹھا کر بس سے باہر پھینک دے۔ ارشد نے دل ہی دل میں اس مسافر کی ہاں میں ہاں ملائی مگر کنڈکٹر نے اسی بے پرواہی سے منہ پھیر لیا اور دوسری سواری کا ٹکٹ کاٹنے لگا۔ ارشد کو ایسا لگا جیسے کسی بھی لمحے گٹھڑی کا بم پھٹ جائے گا اور اس کے ٹکڑے سڑک پر دور دور تک بکھر جائیں گے۔ ایک مرتبہ تو ارشد کا دل چاہا کہ اگر کنڈکٹر گٹھڑی باہر نہیں پھینکتا تو بس رکوا کر یہیں اتر جائے لیکن اس شرم سے بیٹھا رہا کہ لوگ اسے ڈرپوک سمجھیں گے۔ بزرگ نے پھر ایک مرتبہ آواز لگائی "اگر تم میں سے کوئی اسکا مالک نہیں تو میں اسے باہر پھینکتا ہوں" طالبعلم لڑکا شوخی سے بولا "بابا جی مجھے سیٹ پر بیٹھے دیکھ کر آپ کو اچھا نہیں لگ رہا"۔

بزرگ "ارے خدا کا واسطہ ہے تو اپنی سیٹ واپس لے لے مگر اس آفت سے ہماری جان چھڑا"

ارشد جیب سے موبائل نکال کر گھر فون کرنا چاہتا تھا مگر اس کے دونوں ہاتھ سُن سے ہو گئے تھے اور پھر گھر فون کر کے کہتا تو کیا کہتا؟

اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا اور بس راوی کے پل پر سے گزر رہی تھی۔ بادامی باغ کا بس اسٹاپ چند منٹوں کے فاصلے پر تھا اور وہ چند منٹ صدیوں پر بھاری تھے اس کے دل کی دھڑکن اتنی تیز ہو گئی کہ جیسے اچھل کر منہ سے باہر آجائے گا۔ ارشد کو یہ قوت برداشت کرنے سے بہتر یہ لگ رہا تھا کہ گٹھڑی میں رکھا بم پھٹ جائے اور اسے اس کیفیت سے نجات مل جائے۔

اس نے بوجھل ہاتھوں سے موبائل نکالا اور رضوان کا نمبر ملا کر اپنی طبیعت کے خراب ہونے کی اطلاع دی۔ ٹکٹ پر سے گاڑی کا نمبر پڑھ کر بتایا اور فوراً اڈے پر پہنچنے کو کہا۔ رضوان رات بھر سڑکوں پر آوارہ گردی کرنے کے بعد صبح اس وقت سویا تھا جب مؤذن نے اللہ اکبر کا پہلا نعرہ بلند کیا تھا۔ پہلی مرتبہ تو رضوان فون سن کر پھر سے بستر پر لیٹ گیا اور جب ارشد کی Miss call پھر سے آئی تو اس نے جلدی سے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے اور موٹر بائیک اسٹارٹ کر دی۔ رضوان کی بائیک بادامی باغ کے لاری اڈے کی طرف دوڑنے لگی جہاں پر آکر بس رک گئی تھی اور سارے مسافر پہلے اترنے کی کوشش میں تیزی سے اپنی جگہیں چھوڑنے لگے تھے۔

اچانک ایک سانولا سا پھرتیلا لڑکا بس کی چھت پر سے دروازے کے ساتھ کا آہنی ڈنڈا پکڑ کے نیچے اترا اور دروازے سے اندر آکر کنڈکٹر سے کہنے لگا "میرا گٹھڑ کدھر ہے جو میں نے تجھے دیا تھا"۔ "ارے اوئے تیرے اس ردی گھی کے ڈبے نے سارا راستہ خوب تماشا لگائے رکھا" کنڈکٹر نے ہنستے ہوئے بولا۔ "خالص ہے خالص" لڑکے نے جواب دیا۔

کنڈکٹر "تو تھوڑا سا دے جانا" کنڈکٹر جیسے گھی لانے کیلئے گٹھڑی کی گرہ کھولنے ہی لگا تھا کہ لڑکا اپنی گٹھڑی اس کے ہاتھ سے دبوچ کر دروازے سے نیچے کود گیا اور اسے منہ چڑاتا ہوا نہ جانے کہاں بھاگ گیا۔

رضوان بسوں کا نمبر تلاش کرتا ہوا جب ارشد والے نمبر کی بس کے پاس پہنچا تو اسے بس خالی دکھائی دی۔ پہلے تو وہ حیران ہوا پھر بس کے اندر چلا گیا۔ بس میں واقعی اور کوئی نہیں تھا۔ مگر آخری سیٹ پر ارشد ٹیک لگائے آنکھیں بند کیے ہوئے سو رہا تھا۔ رضوان نے قریب آکر ارشد کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ہلکا سا ہلایا تو ساکت جسم لڑھک کر بس کے نیچے فرش پر آگرا۔ ساتھ ہی موبائل فون بھی گود سے گر کر ایک سیٹ کے نیچے جا پڑا۔ رضوان نے کانپتے ہاتھوں سے کانپتا ہوا موبائل اٹھایا۔ اسکرین پر ارشد کے گھر کا نمبر blink کر رہا تھا۔

☆

سورۃ البقرہ میں بنی اسرائیل کے زوال کے اسباب کو اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان کے لیے سبق کے طور پر پیش کیا ہے تا کہ وہ غلطیاں ہم نہ دہرائیں اور ان سے عبرت حاصل کریں۔ بنی اسرائیل وہ قوم تھی جو دعا کے لیے بھی خود ہاتھ نہ اٹھاتی اور اس کام کے لیے بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کہتی کہ "اے موسیٰ جاؤ اپنے رب سے دعا کرو کہ وہ ہمارے سامنے سے عذاب ٹال دے۔" جب اللہ رب کریم اپنے نبی کی دعا قبول فرما کر عذاب ٹال دیتے تو بنی اسرائیل واپس نافرمانیوں کی طرف پلٹ جاتے۔

(القرآن)

فاتح اور مفتوح

گلزار جاوید (راولپنڈی)

کبھی کبھی معمولی فائدے کے لیے انسان بڑا نقصان کر بیٹھتا ہے بزرگوں نے اسی بات کے پیش نظر لالچ کو بری بلا سے تعبیر کیا ہے۔ یوں تو ہم ہمیشہ ہی شور شرابا ، بھیڑ بھاڑ اور ہاؤ ہو سے بہت گھبراتے ہیں، معاملہ جب ہماری ذہانت و فطانت کے اعتراف اور تعریف و توصیف کا ہوتا ہے تو ہم بڑے سے بڑا خطرہ مول لے کر بھی انسانی بھیڑ کو چیر کر اپنی راہ تلاش کر لیتے ہیں۔

آج کے میزبان کو چکمہ دینے کی ہم نے بہت کوشش کی۔ وقت کی قلت، کام کی زیادتی، طبیعت کا اضمحلال بھی کچھ ہمارے نہ آنے کے بہانے تھے جو ایک ایک کر کے ہم نے آج کے میزبان پر داغ ڈالے۔ ویسے بھی ایک ہی بلاوے میں جانے کی حامی بھر کے ہم اپنا وزن کم کرنا نہیں چاہتے تھے۔ ہمارے ترکش میں اور بھی کئی تیر انکار کے عذر میں موجود تھے۔ مثلاً بیگم کی بیماری، ڈاکٹر سے اپائنٹمنٹ، بچے کا عقیقہ یا سالگرہ وغیرہ، بیرون شہر سے مہمان کی آمد یا روانگی، سرکار دربار کی طرف سے ہنگامی پریس کانفرنس یا بلاوا غرض دل بے ایمان جتنوں کے ڈھیر کے مصداق ہماری نیت کا تو نہ جانے کون کون سے عذر تراشنے پر مائل بہ پرواز تھا کہ میزبان نے گزشتہ واقعے کا ذکر کرتے ہوئے ہماری عقل مندی کے غبارے میں ہوا بھرنا شروع کر دی۔

"راجہ نثر کس قدر خوش تھا، میں نے زندگی میں اس شخص کو اس انداز میں خوشی کا اظہار کرتے کبھی نہ دیکھا تھا۔ پڑھا لکھا مہذب آدمی ہو کر بھی کس فراوانی سے مغلظات کی تکرار میں ایک ہی بات دہرائے جا رہا تھا۔ سالوں کو نانی یاد آ رہی ہوگی، چھٹی کا دودھ یاد دلا دیا ہے آج ہم نے بھی، حد ہوتی ہے ہر بات کی حد ہوتی ہے مگر اس مردود نے کسی بھی حد کو پار کرنے اور انسانیت کا خون کرنے میں کبھی دریغ نہیں کیا۔ ہم لوگوں سے خدا واسطے کا بیر ہے اس ناہنجار کو آپ دیکھ لینا، لینے کے دینے پڑ جائیں گے، سالوں کو اپنی سلامتی برقرار رکھنا مشکل ہو جائے گی۔ بڑا غرور تھا اس کو اپنی طاقت پر، آج ہمارے چند سرپھرے نوجوانوں نے سالے کی ساری طاقت چوتڑوں کے بل نکال کر رکھ دی۔ اب میں بھی دیکھوں گا کہ یہ دنیا پر کس طرح حکومت کرتا ہے، کس طرح مجبور و لاچاروں کو بھیڑ بکریوں کی طرح ہانکتا ہے......"

راجہ نثر اس وقت جذبات کی جس تیز ناؤ پر سوار تھا اس سے اختلاف کرنا ایک طرح سے اپنی سلامتی کو خطرے میں ڈالنے کے مترادف تھا۔ پھر بھی بلا ارادہ ہمارے منہ سے یہ الفاظ ادا ہو گئے۔ "راجہ صاحب یہ جوش کا نہیں ہوش کا وقت ہے۔ دشمن کے مضبوط قلعے سے چند اینٹیں نکال کر بغلیں بجانا سراسر حماقت ہے۔ یہ سازش بھی ہو سکتی ہے ہمیں جال میں پھانسنے اور ہماری جگہ سے پیچھے دھکیلنے کی۔ اگر ہمارا اندیشہ درست نکلا تو خدانخواستہ ہم لوگ اس واقعے کے ردعمل میں کم و بیش ایک صدی پیچھے چلے جائیں گے۔ ایک مرتبہ پھر اندھیرے ہمارا مقدر بن جائیں گے۔ یہ موقع بچوں کی طرح پھلجھڑیاں چلانے والوں کے لیے تالیاں بجانے کا نہیں تدبر سے غور و فکر کا ہے۔"

خدا معلوم ہمارے الفاظ میں اثر و تفکر کا ردعمل تھا یا دل سے نکلنے والی صدا تھی راجہ صاحب کچھ کہنے سننے کے بجائے حیرت سے ہمارا منہ تکنے لگے۔ اس وقت ہمیں اور بھی صدمہ پہنچا جب جعفر صاحب، سلیمان صاحب، ماجد صاحب، یحییٰ صاحب اور اکرام صاحب نے ہمارے خیال کی تائید میں سنجیدگی سے بھرپور فکرمندی کا اظہار کیا۔

ویسے تو میزبان نے ہماری فتح مندی کا اعلان کر کے ایک طرح سے میدان مار ہی لیا تھا مگر ہمارے رام ہونے کی ایک خوش وجہ اور بھی تھی۔ ہم شروع سے پیٹ کے پجاری واقع ہوئے ہیں یعنی ہمارا شمار آپ خوش خوراک لوگوں میں کر لیں تو کوئی مضائقہ نہیں، یہ احتیاط رہے کہ ہم بسیار خور ہرگز نہیں ہیں۔ جب جب جہاں جہاں اچھا اور نفیس کھانا دستیاب ہوتا ہے تب تب ہماری پیٹ وہاں جانے کے لیے ضرور پھڑکنے لگتی ہے۔ جیسے ہی میزبان نے ترکش کے تمام تیر آزما کر ہمیں اطلاع دی کہ آج کی دعوت کا اہتمام "لذت کام و دہن" کے زیر اہتمام ہوا ہے، انکار کی صلاحیت خود بخود ہمارے اعصاب سے سلب کر لی گئی۔ کون بدذوق ہوگا جو "لذت کام و دہن" کے لذیذ کھانوں اور نفیس پیشکش سے انکار کر سکے۔ یوں تو "لذت کام و دہن" ہر طرح کے مشرقی و مغربی کھانوں میں یکتا ہیں بالخصوص تکہ کباب، کڑاہی گوشت، روسٹ مرغ اور فرائی مچھلی کے ساتھ مٹکی بریانی، زعفرانی قورمہ اور شاہی نان خوشبو، لذت اور ذائقے میں اپنی مثال آپ ہیں۔ اگر آپ کے ہاں ایک صد مہمانوں کی آمد کا امکان ہے تو آپ کو ایک سو پچاس افراد کے کھانے کا بندوبست کرنا ہوتا ہے۔ "لذت کام و دہن" کے کھانوں کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ آدمی پیٹ کے ساتھ دل بھر کر کھاتا ہے اور اس وقت تک کھائے جاتا ہے جب تک اس کے اندر سے کسی طرح کے خطرے کا الارم نہیں بج اٹھتا۔

سب سے پہلا نقصان ہمیں جسمانی طور پر اس وقت اٹھانا پڑا جب ضخیم میزبان نے اپنا تھوڑی دیر مصافحے کے لیے بڑھے ہاتھوں کو نظرانداز کر کے ہماری ناتوانی سے بھینچ لیا۔ اضافی طور پر گرمجوشی کے اظہار نے جسم کے بہت سے نادیدہ حصوں کو صدمہ پہنچا کر تکلیف کے ساتھ کوفت میں مبتلا کر دیا۔

"کیا خیال ہے آپ کا؟" یقیناً آج کے واقعے کی طرف میزبان کا اشارہ تھا۔ مختصر اظہار خیال کے بعد ہماری خواہش میزبان سے گلوخلاصی حاصل کر کے محفل میں شریک دیگر لوگوں سے ملنے کی تھی۔ میزبان ہمارے ارادے کو

بجانب گئے تھے یا ان کی چھٹی حس نے ان کو ہمارے فوری کی اطلاع پہنچائی تھی کہ انہوں نے نرمی اور بے تکلفی کے باہم امتزاج کو بروئے کار لاتے ہوئے ہمارے ہاتھ کو تھام کر اپنے مہمانوں سے ہمیں ملانے کی خواہش کا اظہار کیا۔ جیسے ہی ہمارے میزبان نے ''الف'' صاحب سے ہمارا تعارف کرانے کی کوشش کی۔ ''ارے صاحب انہیں کون نہیں جانتا یہ تو ہمارے ملک کے ٹاپ ٹیکس پیئرز میں شمار ہوتے ہیں۔ بہت اچھا کیا آپ نے انہیں زحمت دے کر آج کے واقعے کی بابت ان سے بہتر کون روشنی ڈال سکتا ہے'' ہم بزرگوں کے اس قول کو مدت سے پلے باندھے ہوئے ہیں کہ بولنے سے زیادہ سننے والا عقلمند ہوا کرتا ہے۔

ہم نے لہٰذا ''الف'' صاحب کی طرف سوال اچھال دیا۔ ''آپ کے محسوسات کیا ہیں آج کے سانحہ کی بابت''--- ''لگی صاحب مشکل میں ڈال دیا ہے آپ نے!'' نظر کے دبیز چشمے کو آنکھوں سے اتار کر صاف کرتے ہوئے ''الف'' صاحب نے سلسلہ کلام آگے بڑھایا۔ ''دراصل اسٹاک مارکیٹ میں مندی نے میرے دماغ کو بالکل ماؤف کر دیا ہے۔ مجھے تو اس وقت خسارے کی فکر کھائے جا رہی ہے اگر ان کی محبت (میزبان کی طرف اشارہ) کا خیال نہ ہوتا تو میں آج دعوت وغیرہ کھانے کی کنڈیشن میں قطعی طور پر نہیں ہوں۔'' ''واقعی آج کے سانحہ کی وجہ سے اسٹاک مارکیٹ بہت نیچے آگئی ہے' آپ فکر نہ کیجیے چند روز میں بہتر ہو جائے گی۔ آپ تو ویسے بھی پرانے کھلاڑی ہیں اسٹاک مارکیٹ کے اپ اینڈ ڈاؤن سے بخوبی جانتے ہوں گے۔''

ہم نے ''الف'' صاحب کے غم پر پھاہا رکھنے کی کوشش کی تو وہ بپھرے ہو کر کہنے لگے ''نہیں صاحب ہرگز نہیں! میں پرانا کھلاڑی نہیں ہوں۔ میں تو اچھا بھلا حکومت سے چھ پرسنٹ کی شرح پر قرض لے کر ''قومی مالیاتی اداروں'' میں چودہ پرسنٹ پر سرمایہ کاری کیا کرتا تھا۔ آٹھ پرسنٹ کی کمائی تھی آدھی اپنی اور آدھی ان کی! جب سے مالیاتی اداروں میں منافع کی شرح کم ہوئی ہے تب سے میں اسٹاک مارکیٹ میں آیا ہوں۔ پہلے پہل تو مارکیٹ اوپر ہی اوپر جاتی رہی۔ گزشتہ کچھ دنوں سے عالمی کساد بازاری کے سبب نیچے کی طرف گرتی جا رہی ہے اور مجھے نقصان کا خوف کھائے جا رہا ہے'' ہمارے پاس ''الف'' صاحب کی دلجوئی کے لیے حوصلے اور تسلی کے سوا کچھ نہ تھا' فیاضی سے چند جملے ان کی نذر کر کے آگے بڑھنے میں عافیت جانی۔

''ان سے ملئے یہ ہمارے ملک کے سب سے بڑے بلڈر اور کالونی آرگنائزر ہیں اور ان کو تو آپ جانتے ہی ہوں گے'' ''ب'' صاحب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے میزبان نے ہم دونوں کا تعارف کرایا۔ ''آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی' آج کی دعوت میں آنے کو جی نہ چاہتا تھا اب آپ مل گئے ہیں تو ضرور آج کے واقعہ کی بابت تفصیل سے جان کر طبیعت ہلکی ہو جائے گی۔'' ''آپ کیا محسوس کرتے ہیں' کن لوگوں کی کارروائی ہو سکتی ہے یہ'' ایک بار پھر ہم نے مدمقابل کے کورٹ میں گیند لڑھکا دی۔

''دیکھئے صاحب! ہم تو اس بات کے قائل ہیں' جس کا کام اسی کو ساجھے' اگر میں آپ سے کہوں کہ آپ ہاؤسنگ سیکٹر پر تبصرہ کیجئے' اس کی ٹیکنالوجی پر روشنی ڈالئے تو آپ کے ساتھ نا انصافی ہوگی۔ عمر گزر جانے کے بعد بھی ہر روز کوئی نہ کوئی نیا نکتہ' نئی الجھن سر اٹھائے کھڑی ہوتی ہے'' ''کمال کر رہے ہیں صاحب' ہماری معلومات کے مطابق آپ کے پیشے میں پیسہ سیلابی پانی کی طرح آ رہا ہے'' ''جی ہاں بالکل آ رہا ہے' جا کس طرح رہا ہے یہ بھی تو غور کیجیے' بڑے بڑے مل اور فیکٹری اونر اپنے یونٹ فروخت کر کے ہمارے کاروبار میں انوسٹمنٹ کیے ہوئے ہیں۔ وہ ہر حال میں منافع چاہتے ہیں۔ انہیں اس سے کیا غرض کہ مالیاتی بحران کس کروٹ بیٹھے گا' حکومتی ادارے کس طرح سے ہمارا بھرکس نکال رہے ہیں' پولیس کس طرح ہمارا راستہ بند کیے ہوئے ہے'' لفظ پولیس کی ادائیگی پر ''ب'' صاحب تھوڑی دیر کو ٹھٹکے پھر خفت دور کرنے کے لیے بولے ''چھوڑیے ان جھگڑوں کو یہ تو روز کا معمول ہے آج جو کچھ ہوا اس سے طبیعت بڑی فکرمند ہے۔ خدا معلوم حالات کا اونٹ کس کروٹ بیٹھے؟ ٹریڈ اور انڈسٹری پر کیا اثرات پڑیں' ابھی تجارت کیا رخ اختیار کرے' کل ہی نئی ایل سی ہے؟'' قبل اس کے ''ب'' صاحب شہر کے امن کے بارے میں مزید ہلکان ہوں' ہم نے فضا میں معنوی طریقے پر ہاتھ ہلا کر خیالی دوست سے ہیلو ہائے کرتے ہوئے ''ب'' صاحب سے اجازت چاہی۔

''آپ کے قلم میں بڑا دم ہے' بڑی قوت ہے آپ کی تحریر میں خود کو پڑھوانے کی۔ آپ ہی بہتر روشنی ڈال سکتے ہیں آج کی دل ہلا دینے والی خبروں پر' بھلا خبریں سنتے ہی کام کاج سے جی اچاٹ ہو گیا۔ مجھے پوری امید تھی کہ آپ ضرور تشریف لائیں گے اور کچھ نہ کچھ امید ضرور بندھائیں گے۔'' ''ج'' صاحب نے تعارفی کلمات کے بعد ہمیں امتحان سے دوچار کر دیا۔ ان کی دردمندی دیکھتے ہوئے ہمارا دل چاہنے لگا کہ کچھ نہ کچھ شک شبہ ان بیچاروں کی ضرور کرنا چاہیے۔ ''کیا عرض کروں' (رازداری سے کان کے قریب ہوتے ہوئے) لوگوں نے دھڑا دھڑ ڈالر پونڈ کی خریداری شروع کی ہوئی تھی۔ کرنی بھی چاہیے تھی' یہ روز اوپر ہی اوپر جا رہے تھے۔ یہاں! ایک ہی جلسے میں نو دس روپے نیچے آگئے ہیں۔ خدانخواستہ حالات بہتر نہ ہوئے تو میرا کیا ہوگا؟ میں تو مفت میں مارا جاؤں گا' کمائی پانچ' دس پیسے کی اور خسارہ نو دس روپے کا' اللہ ہی کرم کرے گا'' توبہ توبہ میرے مالک توبہ استغفار۔''

''عرض کر لیجیے! آپ کا استدلال درست بھی ہے پھر بھی آپ کیا کر سکتے ہیں؟'' ''ج'' صاحب نے نہایت چابکدستی سے گیند کو ہماری جانب لڑھکا دیا تھا۔ ''حکومت کو کچھ نہ کچھ کرنا ہی ہوگا۔ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنے سے خطرے کا مقابلہ تو نہیں ہو سکتا!'' ہم نے بھی سینہ تان کر کٹ اسٹروک مار دیا۔

"حکومت سے آپ کی مراد اگر بیوروکریسی ہے تو آپ سخت مغالطے میں ہیں! بندہ پرور! تیس چالیس ہزار کی تنخواہ لینے والے کے اپنے مسائل اتنے زیادہ ہوتے ہیں کہ وہ کسی اور طرف دیکھ ہی نہیں سکتا۔ ہر طرف کرپشن کرپشن کا شور الگ ستائے رکھتا ہے۔ پلاٹ، پرمٹ، میڈیکل بل، بیرونی دورے کسی زمانے میں کرپشن ہوتے ہوں گے اب تو یہ وقت کی ضرورت ہے۔ ایسے آدمی سے آپ کس طرح کی لانگ ٹرم پلاننگ کی توقع کر سکتے ہیں جس کے سر پہ ہر وقت تبادلے اور ترقی کی تلوار لٹکتی رہتی ہو۔ میں تو سمجھتا ہوں ارباب اختیار نے اگر عقل کے ناخن نہ لیے تو اس طرح کے اور بھی بہت سے خطرات مستقبل قریب میں پیش آ سکتے ہیں۔ مجھے تو وہاں پر موجود بچوں کے مستقبل کی فکر کھائے جا رہی ہے میرا اپنا بیٹا وہاں... خدا معلوم اس حادثے کے بعد وہ کس حال میں ہو گا۔ تمام تر کوشش کے باوجود کسی طرح کا رابطہ نہیں ہو پا رہا۔"

"ارباب اختیار سے آپ کا روئے سخن کس جانب ہے؟ آپ سے بڑھ کر صاحب اختیار کون ہو گا؟" "ج" صاحب نے دخل در معقولات کرتے ہوئے "خ" صاحب کو کسی قدر غصے میں ڈال دیا۔ "سر میرا مطلب یہ ہے میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ ہم تو نوکر لوگ ہیں آرڈر اور حکم ماننے والے! پالیسی میکر تو آپ لوگ ہیں نا! عوام کے منتخب نمائندے، جو پالیسی آپ لوگ وضع کرتے ہیں ہم لوگ تو اس کی تعمیل پر مامور ہیں سر!" "تو آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہماری غلط پالیسیوں کے نتیجے میں آج کا حادثہ رونما ہوا ہے؟" "نہیں سر نہیں! میرے کہنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا! میں تو یہ کہنا چاہتا تھا......" "اگر ہم انصاف سے کام لیں تو اس وقت ملک میں سب سے زیادہ مظلوم مخلوق وہ لوگ ہیں جنہیں آپ عوام کے منتخب نمائندے کہتے ہیں۔ گلی گلی، محلہ محلہ، گاؤں گاؤں، شہر شہر ووٹوں کی بھیک مانگنے والے جس قدر بے بس اور مجبور ہیں اس ملک میں کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا! جن لوگوں کی قسمت میں ہر وقت قصیدہ گوئی لکھ دی گئی ہو جو لوگ ترقیاتی فنڈز کے نام پر الیکشن کے اخراجات کی بھیک مانگ رہے ہوں، جن کی حاضری نچلے درجے کے سرکاری اہل کار لگا رہے ہوں وہ بھلا کیا اختیار کے مالک ہوں گے؟ میرے خیال میں سب سے زیادہ مظلوم ہم لوگ ہیں۔ آپ کو ہمارے ساتھ ہمدردی کرنا چاہیے، ہماری امداد کرنا چاہیے......!"

"اسی لیے تو ہم لوگ ہر وقت آپ کو ساتھ ملانے کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔" "خ" صاحب بلا اجازت اور بغیر تمہید شریک گفتگو ہو کر باریش لوگوں کی نمائندگی کا فریضہ نبھا رہے تھے۔ میزبان کی توجہ پا کر ان کی آواز کا زیر و بم اور زیادہ دردم میں آ گیا تھا۔ جب میزبان نے ان کی توجہ ہماری موجودگی اور گفتگو کا رخ آج کے حادثے کی جانب موڑنے کی کوشش کی تو انہوں نے بہت سی اہم باتوں سے روگردانی کرتے ہوئے ملک کے اندر جاری بے حیائی کی لہر کا ذمہ دار ہمیں اور ہماری بے ادری کو گرداننا شروع کر دیا۔ ہمارے چہرے کا تبسم بھی اس وقت انہیں بہت کھل رہا تھا۔ وہ صاحب ملک کے اندر و باہر جاری بے راہ روی کی جڑ اسلامی تعلیم سے روگردانی میں تلاش کر رہے تھے جب ان سے اسلامی تعلیمات کی تشریح کی بابت دریافت کیا گیا تو وہ اپنے مسلک کی تعلیمات پر زور دے کر کہنے لگے کہ صرف یہی راہ نجات کا ہے۔

"خ" صاحب سے برداشت نہ ہوا تو انہوں نے "ف" صاحب پر حکومت کی بی ٹیم ہونے کا الزام جڑ دیا۔ "ف" صاحب نے ان پر ملک کے باہر سے بدامنی لینے کا الزام داغ دیا۔ محفل میں شریک ایک نسوانی آواز "ذ" صاحبہ نے از خود شریک گفتگو ہو کر ملک میں نسوانی حقوق کی عدم دستیابی اور ان کے لیے جدوجہد کرنے والوں کے حشر سے آج کے حادثے کو نتھی کر دیا۔ "ف" صاحب نے جوش جذبات میں "ذ" صاحبہ پر بے حیائی اور فحاشی کا الزام تھوپ دیا۔ "ذ" صاحبہ نے "ف" صاحب پر فسطائیت کا الزام بڑے شد و مد سے لگایا اور آج کے سانحے کی ذمہ داری "ف" صاحب اور ان کے گروہ کے سر ڈال دی۔ الف۔ ب۔ ت۔ ج۔ ح۔ خ۔ د۔ وغیرہ ہم آواز ہو کر بولنے لگے۔ ہر کوئی ایک دوسرے کو اپنے نکتہ نظر کا قائل کرنا اور دوسرے کو غلط ٹھہرانا چاہتا تھا۔ میزبان بے بسی کے ساتھ کبھی ایک طرف کبھی دوسری طرف خشمگیں نظروں سے دیکھتے اور چہرہ پر مصنوعی مسکراہٹ سجا کر ہر کسی کے حق میں سر ہلا کر گفتگو جاری رکھنا چاہتے تھے۔ محفل کا مزاج اس قدر گرم ہو چکا تھا کہ کوئی بھی شخص اپنے مقام سے ہٹنے کو تیار نہ تھا اور آج کے واقعہ کا ذمہ دار ایک دوسرے کو ٹھہرایا جا رہا تھا۔ ہم حیران تھے کہ میزبان کھانا کھول کر اس قصے کو ختم کیوں نہیں کر دیتے!

یکایک محفل میں شریک سب لوگوں کی آواز آہستہ آہستہ گھٹنا شروع ہو گئی۔ سب کے چہروں کا تناؤ بھی خود بخود کم ہونا شروع ہو گیا۔ خدا معلوم نووارد کی آمد یا اس کی شخصیت کا سحر تھا یا اس کے شانوں پر سجے پھولوں کی کشش کہ محفل میں موجود سب چہرے ہشاش بشاش دکھائی دینے لگے۔ کسی کو کسی سے کوئی شکایت یا گلہ نہ تھا۔ ہر کوئی نووارد سے بڑھ کر ملنے اور مل کر اسے خوش کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

نووارد نے گلا کھنکار کر بڑے وقار سے میزبان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا، "میرے خیال میں کوئی خاص مسئلہ زیر بحث تھا۔" "نہیں سر! ایسی تو کوئی بات نہیں بس.....وہ.....ذرا.....آج کے حادثے کی بابت اظہار خیال ہو رہا تھا.....۔" "اچھا تو یہ بات ہے.....میں سمجھا کوئی اہم مسئلہ درپیش ہے۔ لیڈیز اینڈ جنٹلمین! آپ لوگ ہرگز فکر نہ کریں، ہمارے ہوتے ہوئے آپ کو فکر کرنے کی ضرورت کیا ہے؟ ہم ہیں نا فکر کرنے کے لیے! آپ نے غور نہیں فرمایا ہم نے کتنے تھوڑے وقت میں غربت، جہالت، صحت، صفائی کے باب میں کتنی بڑی بڑی کامیابیاں حاصل کی ہیں۔ دفاعی شعبے میں بھی ہم نے دشمن کو منہ توڑ جواب دیا ہے۔ بین الاقوامی سطح پر بھی بڑی کامیابیاں ملی ہیں۔ جو لوگ پہلے ہم سے سیدھے

باقی: ایک سائیکو سائیکل وحشت میں

حُسنِ پیمبر

زُہیر کنجاہی
(راولپنڈی)

میرے دیوار و در مہکے ہیں کیا موئے معنبر سے
تعلق ہے مرے دل کو تری زلفِ معطر سے

چلا جاتا ہوں میں پڑھتے ہوئے صلِ علیٰ دل میں
لگی ہے لو مرے دل کو یہ کیا حُسنِ پیمبر سے

مُرادیں میری بھر آئیں، اُمیدیں ہو گئیں پوری
کبھی مایوس لوٹا ہی نہیں میں آپؐ کے در سے

تری چشمِ کرم ہے سارے عالم پر تو اے مولا
"کبھی تپتے ہوئے صحرا پہ بھی ابرِ کرم برسے"

نہیں ہوتی ہے پوری خواب کی تعبیر باتوں سے
نہ جب تک ہُوک اُٹھے آدمی کے دل کے اندر سے

ترے در سے زُہیرؔ بے نوا نے لو لگائی ہے
مرے ویران دل پر بھی ذرا ابرِ کرم برسے

○

نجمہ عثمان
(لندن)

مانوس یوں قفس کی فضاؤں سے ہو گئے
پنجرے کا در کھلا رہا، پنچھی نہیں اڑے

گہرے سے ہو چلے تھے قزح کی دھوپ میں
کچے تھے رنگ آنکھ کی بارش میں ڈھل گئے

رشتہ جو نام کا تھا کبھی کا بکھر چکا
یہ دکھ کی نسبتیں تھیں کہ ہم ساتھ ساتھ تھے

اک اجنبی سے شہر میں مانوس ایک شخص
ایسے ملا کہ خود کو بھی ہم اجنبی لگے

اب اس جدید دور میں یہ حسرت قدیم
بچوں کے بازوؤں کا سہارا کبھی ملے

اس بار بھی بہار و خزاں میں ٹھنی رہی
پھولوں کے رنگ ماند تھے، پتے ہرے رہے

بس یہ دعا ہی کی تھی، اجالوں کی خیر ہو
پوروں پہ انگلیوں کے ستارے چمک اٹھے

○

عشرت ظفر
(کانپور، بھارت)

یہ جو شعلہ ترے رخسار میں رکھا ہوا ہے
ایک جوہر ہے کہ تلوار میں رکھا ہوا ہے

کیا ہو اس شہر میں گوہر کی نمائش کہ جہاں
خیرہ چشمِ خریدار میں رکھا ہوا ہے

آتشیں دھوپ بھی بکھری ہے مرے چاروں طرف
اک خنک سایہ بھی دیوار میں رکھا ہوا ہے

وصل کے لمحۂ شاداب کا دیتا ہے سراغ
وہ سخن جو ترے انکار میں رکھا ہوا ہے

قرض اتارے گی مرے خون کا کیا خاکِ چمن
موسمِ گل بھی رگِ خار میں رکھا ہوا ہے

دشت میں دیر ہے بس میرے قدم پڑنے کی
رقصِ زنجیر کی جھنکار میں رکھا ہوا ہے

عشرتؔ اشکوں کی تراوش میں نہایا ہوا چاند
رات کے دشتِ پُراسرار میں رکھا ہوا ہے

○

انور جاوید ہاشمی
(کراچی)

وہ ایک شعر جو پینتیس سال میں نہ ملا
کسی کے حسن کسی خدوخال میں نہ ملا

ہم اختیار کی منزل میں ہیں کہ جبر کہیں
جواب اس کا تو میرے سوال میں نہ ملا

ابھی جو ہاتھ میں تھا اُڑ گیا وہ غبارہ
اب اس ملال کو میرے خیال میں نہ ملا

اسی پہ ختم ہوئی کیا قیاس آرائی!
بچھڑ نہ جائیں اسی احتمال میں نہ ملا

کہاں کی ہجر نوازی بجز نظر بازی
یہ کرب روح کا اس کے وصال میں نہ ملا

وہ روز و شب کی مسافت، سڑک، دکاں، گلیاں
تمام قصے ہیں ماضی کے حال میں نہ ملا

خدا کو ڈھونڈ لیا ہم نے چارسُو جا کے
جنوب و مغرب و شرق، شمال میں نہ ملا

○

ضیا فاروقی سندیلوی

(بھوپال، بھارت)

غم حیات کو یومِ خوشگوار کر لیا ہے
کہ ہم نے حال کو ماضی شمار کر لیا ہے

خود اپنے آپ پہ جب اعتبار کر لیا ہے
تو ایک آگ کا دریا بھی پار کر لیا ہے

وہ ایک دانہ تسبیح تھا بدن کی طرح
سو ہر نفس کو اسی پر شمار کر لیا ہے

یہ گرد باد مجھے اب کہیں بھی لے جائے
کہ اب فقیر نے خود کو غبار کر لیا ہے

کسے یقین دلائیں کہ ہم نے تیرے لیے
خود اپنے آپ کو بے اعتبار کر لیا ہے

وہ جن سے ترکِ تعلق پہ بات کرنی تھی
انھیں سے رستہ جاں استوار کر لیا ہے

جب انکار کیا ہم نے احترام کے ساتھ
تمام گھر کو ضیا شرمسار کر لیا ہے

○

سہیل اختر

(بہاولپور)

وہ لوگ خود کو سمجھتے ہیں جو خدا کی طرح
خدا نے چاہا تو اُڑ جائیں گے ہوا کی طرح

جہانِ جبر میں دہشت سے گنگ ہے انساں
اُداس ہونٹوں پہ دم توڑتی صدا کی طرح

ہم اہلِ دل کا خزاں رُت میں ساتھ چھوڑ گیا
وہ شخص تھا جو بہارِ گریز پا کی طرح

ترے ستم کی شکایت بھی میرے ہونٹوں پر
رہی ہے رقص کناں نقشۂ وفا کی طرح

مہک اُٹھیں مری سانسیں گلاب کی مانند
یہ کون پاس سے گزرا ہے یوں صبا کی طرح

سہیلؔ غور طلب ہی سہی پلٹ کے تو دیکھ
کسی نے تجھ کو پکارا تو آشنا کی طرح

○

صابر عظیم آبادی
(کراچی)

مت جلی ایسی اڑا ایوان میں
یہ بھی گستاخی ہے میری شان میں

جس میں ہوتی ہے کشش دونوں طرف
وہ محبت ہے کہاں انسان میں

کام سارا کر رہے ہیں جب وہی
فرق کیا ہے آپ میں شیطان میں

شہر کے جو رستم و سہراب ہیں
وہ کبھی آئے نہیں میدان میں

مت سجایا کر خدا کے واسطے
رنجشوں کے پھول کو گلدان میں

مسکرانے سے ترے اے جانِ جاں
جان کچھ تو آ گئی ہے جان میں

خار بھی اس کی ثناخوانی میں ہے
پھول بھی ہے غرق اس کے دھیان میں

اس کی صورت اس کا جلوہ دیکھ کر
کچھ فتور آ ہی گیا ایمان میں

کیا گیا صابرؔ کہ وہ سارا سکوں
لے گیا ہے باندھ کر سامان میں

○

کاوش پرتاپ گڑھی
(دہلی بھارت)

جب دکھ ہی دکھ یہاں ہے تو باہر نکل ہوا
کس نے کہا ہے تجھ سے کہ گھر ہی میں چل ہوا

مضبوط اور لمبی جڑوں کا درخت ہوں
مجھ سے نہیں گروں گا لگا سارا بل ہوا

اس بار میرے باغ کو کیا لگ گئی نظر
سرسر کے گرنے لگ گئے پیڑوں کے پھل ہوا

بارعب، باجلال، موثر تھی کس قدر
جب میرے گھر میں آئی تو پہلے پہل ہوا

ان پر کسی کا زور چلا ہے کہیں کبھی
یہ بے لگام طاقتیں ہیں آگ، جل، ہوا

تو کتنی تیز رو ہے ذرا میں بھی دیکھ لوں
جب جی کرے ترا تو مرے ساتھ چل ہوا

ملتے ہی حکم جانب منزل وہ چل پڑی
پھر کیا کسی کے روکے رکی ایک پل ہوا

آہستگی سے چلنے میں آرام ہے کہاں
کچھ دیر کے لیے ہی سہی تیز چل ہوا

کچھ کام بھی نہیں ہے مگر وقت ہے کہاں
خود سے بھی مل نہ پاؤں گا میں آج کل ہوا

جب بڑھ نہیں رہا ہے ترا دوستی کا ہاتھ
اس سلسلے میں کرتے ہیں ہم ہی پہل ہوا

ایسی غزل سنی ہی کہاں ہوگی آج تک
سن لے مری زبان میں تازہ غزل ہوا

سیف الرحمٰن سیفی
(کراچی)

نہیں ہے کوئی یہاں پھر بھی بولتا کوئی ہے
جو تُو نہیں تو تیرے جیسا دوسرا کوئی ہے

صبا گزرتی ہے میرے قریب سے ہو کر
کہ جیسے دور سے مجھ کو پکارتا کوئی ہے

کسی کے آنے کی آہٹ نہ کوئی دستکِ در
کہا یہ کس نے ابھی مجھ سے گھر میں کیا ہے کوئی ہے

بغیر تیرے یہ دل آبلہ سا ہو جیسے
تو ہی بتا کہ مرے درد کی دوا کوئی ہے

تُو مانتا ہے کہ دیتا ہے کوئی رزق ہمیں
تو یہ بھی مان لے آخر کہیں خدا کوئی ہے

بلائے دہر و زمانہ سے آج تک سیفی
بچائے رکھا ہے جس نے مجھے دعا کوئی ہے

○

انجم بارہ بنکوی
(بھوپال، بھارت)

ایسا نہیں کہ زعم بصارت میں کھو گئے
ہم عہد ساز لوگ تو غربت میں کھو گئے

بے چہرگی کا رنج ہے بے قیمتی کے ساتھ
جب سے ہم آئینوں کی تجارت میں کھو گئے

ہنستے ہیں اب کے بار تو اشکوں کے قافلے
موسم کی خوشگوار قیادت میں کھو گئے

اب تو طلسم لقمہ تر ٹوٹ جائے گا
سادات عشق صبر کی لذت میں کھو گئے

صحرا سے بے پناہ عقیدت تھی کل جنہیں
وہ لوگ اپنے گھر کی زیارت میں کھو گئے

○

حفیظ انجم کریم نگری

(بھارت)

مری پسند کا کپڑا ابھی تو تھان میں ہے
وہ تھان شہر کی سب سے بڑی دکان میں ہے

نہ مانگ ہے نہ ضرورت ہے آجکل اس کی
مرا خلوص مرے گھر کے پرف دان میں ہے

تم اپنی بات کہو، اپنی بات منواؤ!!
نہ خاندان میں رکھا نہ پاندان میں ہے

یہ سوتی ساڑی ہے کیسے پسند آئے گی
تمہاری آرزو پہلے ہی سے کتان میں ہے

جوان بیٹا بہو سب، مزے سے گھر میں ہیں
یہ بوڑھی ماں ہے، اکیلی ہے، سائبان میں ہے

اب اپنے غیر سے بھلا کس شمار میں ہوں گے
بلا کا جھوٹ ہمارے ہی پاسبان میں ہے

یہ دیکھنا ہے کہ اترے گا آسمان سے کب
ترے غرور کا پنچھی، ابھی اڑان میں ہے

ہر ایک فرد کا کہنا ہے یہ حفیظ انجم
حسد کا روگ ہمارے ہی خاندان میں ہے

○

شگفتہ نازلی

(لاہور)

اُس کو اپنی بات بتانی مشکل ہے
کوئی جھوٹی آس لگانی مشکل ہے

وہ تو سب کچھ بھول چکی برسوں پہلے
ہوگی کوئی یاد سہانی مشکل ہے

کچھ تو لکھ کر بھی ہم کو بتلانا ہے
کیوں کہ سب تفصیل زبانی مشکل ہے

چہرہ پڑھنے کے ڈھب کو وہ جانے ہے
اُس سے کوئی بات چھپانی مشکل ہے

کیوں کر سب جزئیات بھلا بتلا پائیں
ساری کہانی پھر دہرانی مشکل ہے

سب کے دل جیتے اُس نے دانائی سے
کیسے سرزد ہو نادانی مشکل ہے

اب تو ہولے ہولے باتیں کرتی ہے
پہلے جیسی کہاں روانی مشکل ہے

○

اختر رضا سلیمی
(اسلام آباد)

آئینہ و چراغ کو یکجا کروں گا میں
اس عالمِ فسوں میں اضافہ کروں گا میں

اب تک تو خیر تیری تمنا میں کٹ گئی
تُو مل گیا تو سوچتا ہوں کیا کروں گا میں

اب کے فریب دینا ہے اس فتنہ ساز کو
سو، جو کہے گا اس پہ بھروسہ کروں گا میں

یہ کیا کہ بار بار گریباں ہی چاک ہو
اس بار کوئی اور تماشا کروں گا میں

کب تک حنا پسند رہیں گے کسی کے ہاتھ
کب تک یہاں پہ خون خرابہ کروں گا میں

اے خواب تیرے حسن پہ مرنا ہے ایک دن
اے حسن تیرے خواب کو زندہ کروں گا میں

○

خالد ندیم بدایونی
(بدایوں بھارت)

پھول گلشن میں جو رنگیلے تھے
میری چاہت کے سب وسیلے تھے

جن میں سنگیت تھا سُر یلے تھے
وہ پرندے بڑے ہٹیلے تھے

میٹھے موسم کی بات ہی کیا تھی
پھل درختوں کے سب رسیلے تھے

چاند، سورج، شمع، دیئے، جگنو
روشنی کے سبھی وسیلے تھے

پیار، خوشبو، وفا، انا، اُلفت
سب ہی دارورسن کے حیلے تھے

تھیں ہوائیں عروج پر اُس دم
رنگ بادل کے جب ہٹیلے تھے

یوں ہواؤں نے کردیا زخمی
بند میری قبا کے ڈھیلے تھے

جنکو سمجھا تھا آگہی کا پہاڑ
ریت کے وہ بلند ٹیلے تھے

پتھروں کا مزاج تھا ضدی
آئینے بھی بڑے ہٹیلے تھے

○

طالب انصاری
(دوحہ کینٹ)

آؤ تصویرِ رخِ یار بنانے لگ جائیں
بن ہی جائے گی جو اک بار بنانے لگ جائیں

ایک جھونکے سے بکھر جاتا ہے خوابوں کا محل
ہم وہ خوش فہم کہ ہر بار بنانے لگ جائیں

طاق پر بیٹھ کے رونے سے کہیں بہتر ہے
پھر سے ٹوٹی ہوئی دیوار بنانے لگ جائیں

قد بڑھانے کی تمنا ہی نہیں ہے ورنہ
ہم سے فن کار بھی دستار بنانے لگ جائیں

ضد میں آجائیں اگر ہم تو یہ ساکن بھی ہے
مشت پر خاک سے کہسار بنانے لگ جائیں

آزمائش کے کڑے وقت میں ہیں غیر تو غیر
کتنی باتیں ہیں جو غم خوار بنانے لگ جائیں

○

تصوّرِ اقبال
(پنڈی گھیب)

تاج والے جو سر نہیں ہوتے
کیا وہ سرِ معتبر نہیں ہوتے؟

''جن پرندوں کے پر نہیں ہوتے''
اُن کے پیڑوں پہ گھر نہیں ہوتے

آنسوؤں میں بھی فرق ہوتا ہے
سارے آنسو گہر نہیں ہوتے

بھول جاتا ہوں کس لیے اکثر
زر، زمیں اصل زر نہیں ہوتے

اُن کی قسمت پہ رشک آتا ہے
عارضے جن کے گھر نہیں ہوتے

سب مکاں ایک سے نہیں ہوتے
کچھ مکانوں میں در نہیں ہوتے

گھر سے رستہ بنا لیا تُو نے
گھر تو یوں رہگزر نہیں ہوتے

وقت کی کوئی حد نہیں ہوتی
وقت کے بال و پر نہیں ہوتے

جان پہچان جب نہیں رہتی
رابطے معتبر نہیں ہوتے

روز میں ''اُن'' سے ملنے جاتا ہوں
روز وہ اپنے گھر نہیں ہوتے

○

ناصر عباس ناصر (دری خیر)

بہت مغموم ہوئے تیرگی کی چوکھٹ پر
چلو اب مل کے چلیں روشنی کی چوکھٹ پر

زمانہ ہم سے نکل جائے گا بہت آگے
پڑے رہیں گے اگر بے خودی کی چوکھٹ پر

فرات تو نے بھی باطل کی طرف داری کی
نہ آیا تو بھی تو ابنِ علیؑ کی چوکھٹ پر

خلوص دل میں نہیں ہے اگر تمہارے تو
ملے گا کچھ بھی نہیں بندگی کی چوکھٹ پر

جو آئے احمد مرسلؐ کے در پہ ہم ناصرؔ
ہوا محسوس کہ ہیں روشنی کی چوکھٹ پر

○

پروین نقش (میاں چنوں)

بے کلی ہے نہ شادمانی ہے
زندگی درد کی کہانی ہے

جیت کیا ہے مجھے نہیں معلوم
ساری دنیا سے ہار مانی ہے

پھول، خوشبو نہیں ہے میرے پاس
ساری بے رنگ زندگانی ہے

یادِ محبوب، ایک مدت سے
میرے ہونے کی اِک نشانی ہے

کیا بتاؤں، سناؤں کیا تم کو
عشق میں کتنی بے کرانی ہے

دل کی دنیا کو لوٹنے والے
دل کی دنیا بڑی سہانی ہے

ایسی باتوں سے فائدہ کیا ہے
تُو نے نقشؔ دل میں ٹھانی ہے

نورزمان ناوک
(ٹلہ گنگ)

یہ بھولی بھالی شکیل چڑیاں
عطائے ربِ جلیل چڑیاں

گداز خاطر، لطیف لہجہ
صبیح طینت جمیل چڑیاں

خلوص و الفت کے زائچے میں
بہاروں کی دلیل چڑیاں

رضائے یزداں پہ خوش ہمیشہ
ادائے عکسِ خلیل چڑیاں

ہے تین تنکوں پہ ان کی کٹیا
ہوائے تند اور علیل چڑیاں

نثار کر دیں تعلوں میں خود کو
وفا میں کب ہیں بخیل چڑیاں

نئی صدی کے نئے تقاضے
سمجھ گئیں ہیں عقیل چڑیاں

نہیں ہیں، یہ کشتیاں، نہیں ہیں
ہیں مغفرت کی سبیل چڑیاں

ہلا کے رکھ دی فصیلِ جاں تک
ہوئیں کچھ ایسے رذیل چڑیاں

اداس و تنہا شجر رہے وہ
نہ جس پہ چہکیں جمیل چڑیاں

جہاں میں اکثر ہوئی ہیں ناوکؔ
عدیم شک پر قتیل چڑیاں

○

رپورتاژ۔۔۔ نگلیں گم گشتہ

طاہرہ اقبال (فیصل آباد)

دھند کے غباروں میں دودھیا لہریے تھے جیسے جھیل کے ریشمی پانیوں میں ہنو کھونٹ بھرتی ہو۔ خشک گھاس کی رنگت، پکے دھان کی بالیوں لکی تھی اور خاکستری جھاڑیاں، شہر سے دریچے کی مانند سر خود رو بوڑھی تھیں، دھند کے خالی خولی گنبد کو اذان کی آواز بھرنے لگی تھی۔ چیختی ہوئی تاریکی کے بدن پر جا بجا شور سے پہلے اندھائے تھے جو شاید اسی آواز کو خود میں سمونے کو بے تھے۔ سحر کا آنکھیں ملتا ہوا شہر اور پہلا سماں، دھندلایا آسمان، خاکستری جھاڑیاں اور بھوکلی مٹی اور ان سب میں رچی ہوئی اذان کی مہک، کچھ بھی تو مختلف نہ تھا البتہ سطح سمندر سے 50 فٹ نیچا یہ شہر ہمارے لیے یوں مختلف تھا کہ ہم اسے پہلی بار دیکھ رہے تھے لیکن جس کا نام بڑھکی بڑی پرنگی کی پرانی چوٹ کی طرح ٹیسیں چھوڑتا اور دکھن بھرتا رہا تھا۔ شہر اپنی پوری تاریخ، ساری خصوصیات اور حادثات اپنے ناموں کے آہنگ پر دہرائے کیوں رہتے ہیں۔

فلسطین: جنازے وصول کرنے والوں کے ہاتھوں میں پکڑے پتھر جو بستیاں مسمار کرنے والے بلڈوزروں کے آہنی جبڑوں پر لگ کر ٹوٹتے ہیں، مظلومیت، دکھ، کربی، حوصلہ مندی اور آزادی کی علامت۔

رہلیاتی ہوئی بیٹیاں اور جوان بیٹوں کے لاشوں پر چیختی ہوئی مائیں۔ نارنجی وعدہ خلافی اور ناصرفت کی پرانی کہانی۔

عراق: بیدہ ویلا کو وبش کی ہٹ دھرمی، جھوٹ و بہتان اور بربریت کی سلسلے وار داستان۔

افغانستان: تباہی، کھنڈرات اور جوانوں کے خون میں نہائے آتش انتقام میں جلتے دامن کہسار کی خون چکاں تصویری کہانی۔

اور یہ سامنے پھیلا شہر ڈھاکہ، جس کے ساتھ سقوط کا لفظ لاحقہ سا ہو گیا ہے۔ مدت ہوئی ہمارے بچے تاریخ کی کتابوں میں سقوط ڈھاکہ کا تو ذکر پڑھتے ہیں مگر خود ڈھاکہ کا نقش لفظوں کے معنی اپنے پس منظر کو سمو کر مفاہیم اور ہیئت کیونکر تبدیل کرتے رہتے ہیں۔ مجھے یہاں ایئر لائن کے گھسے گھسے پرانے جہاز کی وہ ایئر ہوسٹس یاد آئی جس کی بھری ہوئی ٹرالی پر سے چاولوں کا ڈبہ گر گیا تھا اور جس نے فوشیبر زمین لپیٹ لپیٹ چاول اور بوٹیاں اکٹھے کیے تھے۔ سبز ساڑھی اور بڑے سے جوڑے کو سنبھالتے ہوئے پھر بھی کچھ چاول کوری ڈور میں بکھرے رہ گئے تھے۔ ہر حادثے کے گزر جانے کے بعد ایسے بکھرے ہوئے چاولوں جیسی باقیات رہ کیوں جاتی ہیں جو بعد میں آنے والوں کے پیروں سے مسلے ہوئے چاولوں کی طرح چپکی رہتی ہیں جیسے ڈھاکہ کے بکھر جانے کے بعد سقوط کا لفظ چاولوں کی پیہائی ہوئی پچھکی طرح چپکا رہ گیا ہے۔ گرائے جانے اور ڈھا جانے کا دکھ لیکن یہ شہر تو کہیں بھی گرا ہوا معلوم نہ ہو رہا تھا۔ پورے قد سے کھڑا تنا ہوا بلکہ کچھ زیادہ ہی دراز قد نظر آیا۔ تیس تیس تیس منزلہ بلند عمارتیں، جدید تعمیر، بڑھتا اور پھیلتا ہوا شہر ڈھاکہ۔ ضیاء انٹرنیشنل ایئرپورٹ پر منی چینجر نے جب پاکستانی ہزار روپے کے نو (9) سو ٹکے تبدیل ہوئے تو اس شہر کی استقامت اور بلندی کچھ زیادہ ہی سر چڑھ کے بولی۔ تین گھنٹے کراچی ایئرپورٹ کی خواری اور پونے چار گھنٹے کی یہاں ایئر لائن (جسے بچے بے ایمان ایئر لائن ہی کہتے رہے) کی ناآسائش خلافت پوری رات کا رتجگا اور سمندر کنارے گزرے ہوئے پچھلے دن کی تھکن، دماغ کی تندی کو کند اور بینائی کی تیزی کو دھندلا چکی تھی۔ گویا جسمانی بیٹری لو ہو چکی تھی اور چارج ہونا مانگتی تھی۔

ہمیں وصول کرنے کے لیے آنے والے ڈپلومیٹ کی شناخت کے بعد دماغ اور آنکھیں پھر ابہام کے لحاف میں دبکنا چاہتی تھیں۔

''آپ جس سڑک پر سے گزر رہے ہیں، یہ ڈھاکہ کی بہترین شاہراہ ہے۔''

ضیاء ایئرپورٹ سے باہر نکلتی اور ڈھاکہ شہر میں پہنچتی اس سڑک پر رواں وین میں ڈپلومیٹ نے گائیڈ کے فرائض سنبھال لیے تھے لیکن یہ سڑک تو بہت تنگ اور کافی حد تک ٹوٹی پھوٹی ہے۔ ہمارے شہر اسلام آباد اور لاہور کو تو چھوڑو۔ خود فیصل آباد میں متعدد سڑکیں اس سے کہیں بہتر ہیں۔ نزہان اور صہیب دونوں بچوں نے اک فاخر اور احساس برتری کے ساتھ اس سڑک کو دیکھا۔ اب بچوں کو یہ بتانے کی کیا ضرورت ہے کہ گھٹنوں گھٹنوں دلدلی ہی گلیاں، گندگی کے ڈھیر اور چھپروں بھرے جوہڑ نما سڑکیں بھی اسی پاکستان میں بکھری پڑی ہیں۔ پر اس سے کیا وہ تو ان لوگوں کے لیے ہیں جو لکیر زیریں خط میں رہنے کے موروثی طور پر عادی ہیں، جہاں سے غیر ملکیوں نے سفارت کاروں، حکمرانوں اور امراء نے گزرنا ہے تو کسی بھی یورپی شاہراہوں سے کم نہیں۔ عدم مساوات تو فطرت کا قانون ہے ہی، یوں بھی جب کبھی اچانک مہمان گھر آ جائیں تو گھر کا کوڑا صوفوں اور پلنگوں کے نیچے چھپا ہی دیا جاتا ہے۔ ہم سب نے اس سیاستدان کی جی کھول کر تعریف کی، جس کی سیاسی ساکھ کا کردار سے قطع نظر یہ کارنامہ قابل ستائش ہے کہ آج ڈھاکہ کی ان سڑکوں کے جواب میں ہم موٹروے، مری مال روڈ، لاہور کینال روڈ جیسے بھاری بھرکم جوابی چھکوں سے لیس ہیں۔

بچے بہ فاخر قوم کے سپوت بن کر چلائے۔

''ہماری سڑکیں گھاودھ کا بیڈ ٹول پہلے ہی ہے۔ اشارے جگمگاتے ہوئے ٹیکسیوں کی گاڑیاں ایک مدت کے اندر اندر گزر جاتی ہیں۔ یہ ہی نہیں چلا اور یہاں ٹوٹی پھوٹی سڑک کے ہر چوک پر کھمبوں تک دستانے پہنے اور گھٹنوں تک بوٹ چڑھائے ڈنڈے لہراتے سارجنٹ کھڑے ٹریفک کنٹرول کرتے ہیں جو غریبوں کی بڑھتی ہوئی آبادی کی طرح کبھی کنٹرول میں نہیں آتی اور رکشہ سٹر

طے کرنے کے لیے دو دو گھنٹے ٹریفک بلاک رہتا ہے۔
ڈپلومیٹ نے اپنی بات جاری رکھی۔

"یہ علاقہ گلشن کہلاتا ہے جو 71 کے بعد بنا ہے۔ یہی ڈھاکہ کا پاش ایریا ہے جہاں تمام سفارت خانے ہیں۔ سفارت کاروں اور امراء کی رہائش گاہیں ہیں اور جدید اور مہنگے شاپنگ پلازے مثلاً روشن پلازہ، تنزن شاپنگ مال وغیرہ بھی یہیں ہیں۔"

اس پاش ایریا میں عمارتیں کئی کئی منزلہ بلند اور خوبصورت تھیں اور مزید عمارتیں بنائی جا رہی تھیں۔ تعمیرات یہاں کی ایک بڑی صنعت کے طور پر ابھری ہے۔

"یہاں ڈھاکہ میں مچھر بہت ہیں مگر۔" ڈپلومیٹ کی آواز پر ساتی جھیلوں اور نالوں سے گھرے ہوئے پانیوں میں سرسبزی جس پر کیلے کے چھال اور ناریل کے خول پڑے سستا رہے تھے۔ "کچھ نہ پوچھیں مگر! بڑے تنگ ہوئے ہیں یہاں آکر۔۔۔ مہنگائی اتنی زیادہ کہ زندہ رہنا مشکل اور بچوں کی تعلیم اس قدر مہنگی کہ انگریزی سکولوں میں پڑھانا ہمارے لیے ممکن ہی نہیں۔ ہم تو عام سرکاری سکولوں میں بچے پڑھاتے ہیں۔ جہاں ذریعہ تعلیم بنگلہ ہے۔ اب ہمارے بچے بنگلہ پڑھا کریں گے۔ اس قدر پلوشن کہ ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن نے دنیا کا موسٹ پلوٹڈ شہر ڈھاکہ کو قرار دیا ہے۔ ڈیڑھ کروڑ آبادی کا یہ شہر غربت اور لاقانونیت کا گڑھ بن چکا ہے۔"

جہاں غربت ہوگی وہاں لاقانونیت تو ہوگی ہی۔ میں نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے بنگالی ڈرائیور کو دیکھا جو یقیناً ہماری باتیں سمجھ رہا تھا کہ نہیں مجھے تو کسی اجنبی کا گمان سا لگا تھا، ایک دم جاسوس سا خاموش اور گمبھیر یا انتہائی حد تک بے ضرر اور معصوم۔ انتہاؤں کی چوٹیاں دراز ہوتی ہوئی باہم مل کیوں جاتی ہیں۔ بے تحاشہ مٹھاس، بے تحاشہ کڑواہٹ، دونوں اپنی شناخت اور ذائقے کھو دیتے ہیں جیسے برف اور آگ دونوں ہی جلا ڈالتی ہیں۔

اب تک ڈھاکہ کا تصور ہمارے ذہنوں میں ایسا بن چکا تھا کہ جی چاہ رہا تھا کہ یہیں سے واپس ایئرپورٹ کو پلٹ جائیں اور کراچی کی ہوائی فلائٹ پکڑ لیں لیکن آنے والا کل یعنی یکم جنوری 2004 کو ڈھاکہ کا ٹریڈ فیئر شروع ہونا تھا جس کے پاکستانی پویلین کے ڈائریکٹر کے طور پر اقبال صاحب کو ای۔پی۔بی نے یہاں بھیجا تھا اور ساتھ میں ہم بنگلہ دیش دیکھنے چلے آئے تھے۔ ایک پرانی خواہش اچانک ایسے ہی مستجاب ہوئی کہ جب ہم کہہ دیا کرتے ہیں۔ "کچھ اور ہی مانگ لیا ہوتا۔" کینیڈین ایمبیسی کے پڑوس میں واقع گلشن ٹو کے جس فلیٹ میں ہم نے قیام کیا تھا، اُسے دیکھ کر اپنے سابقہ خیالات میں ترمیم کرنا پڑی۔ لفٹ کے ذریعے ہم جس رہائش گاہ میں پہنچے تھے اس کے کشادہ بیڈ روم، سفید براق ماربل کے فرش، لکڑی کے فرش، پینٹنگ اور ہم رنگ پردوں اور فرنیچر والا ڈرائنگ روم، سب نیا، خوبصورت اور جدید تھا۔ شاید اس کی آرائش میں کسی بنگالن کے ذوق کمال نے رنگ بھرا تھا، وہی کمال جو راج شاہی سلک کی ساڑھی کی فال کی لہلہاہٹ میں ہے، گھنگھریالوں کی تاب دو سیاہی میں ہے اور جھالوں کی چکلی سنولاہٹ اور آنکھوں کی گنگا جمنی آب میں سے جھلکتا ہے۔ اسی کا ایک ٹچ یہ فلیٹ بھی تھا۔ انسانوں کی وضع قطع اُن کی معاشرت اور تمدن کو اپنی ہی شبیہیں عطا کر جاتی ہے۔ بچوں نے شور مچایا۔

"واہ اتنا خوبصورت فلیٹ، اتنے بڑے بڑے ٹب، ماڈرن Accessories والے باتھ روم، بہترین کراکری سے سجا ہوا کچن اور لاؤنج میں رکھا ہوا ٹی وی جس پر سارے وہی چینل آتے تھے جنہیں بچے پاکستان میں دیکھتے تھے۔ اشرکا کی بیل بجی۔

"میں مسز قریشی بول رہی ہوں۔ آپ ناشتہ ہمارے ساتھ کریں گے۔" بنگلہ آمیز اردو (جو پوری طرح سمجھ میں آتی تھی۔) پنجابی آمیز اردو جیسی ہی مہمان نوازی۔

"آپ کتنے بجے ناشتہ کرنا پسند کریں گے۔"

صبح کے سات بج رہے تھے، ناشتے کا وقت تو ہو ہی چکا تھا۔ ساری رات کا سفر، تھکن اور رتجگا، ناشتہ کہاں کرنے دے گا۔

"کہہ دیجئے دس بجے۔ پر دس بجے کون اُٹھے گا۔"

دماغ کا ایک حصہ شدید غنودگی اور ایک حصہ تنگ تک بیداری میں لٹکا ہوا ذہن کچھ وقت حاصل کرنا چاہتا تھا۔ نئے ماحول کی جگہ کو تولنے کے لیے جس طرح مختلف درجہ حرارت سے مانوس ہوتے وقت جسم ایک کپکپی ایک سنسنی سے گزرتا ہے اسی طرح دماغ بھی نئے حالات سے متعلق ہونے کے لیے ایسی ہی کپکپی اور سنسنی سے دوچار تھا۔ ڈھاکہ شہر بیدار ہو رہا تھا اور ہم اس جھٹکے کو سہارنے کے لیے خود کو سمیٹ رہے تھے۔ نیند بھی کہاں آئی تھی کہ پھر اشرکا کی بیل بجی۔ فلیٹ کے منیجر صاحب، انجینئر صاحب کو ساتھ لائے تھے۔

"آپ کو سمجھا دیا جائے کہ یہ سوئچ گیزر کا ہے، یہاں سے ٹی وی آن ہوتا ہے، گیس کا کنکشن ادھر ہے۔"

بڑی ہی آرگنائزڈ قوم ہے، کبھی کسی کو کوئی سوئچ تک ڈھونڈنے کی پریشانی بھی نہیں اٹھانی پڑے۔ فلیٹ کے ذوقِ آرائش، مہمان نوازی اور اب یہ منظم طرزِ عمل متاثر کر گئی تھی۔ اب تک یہ سمجھ آ چکی تھی کہ یہاں سب سے بڑا مسئلہ زبان کا ہے۔ اُدھر کی ٹوٹی پھوٹی انگریزی بھی ایسی ہی تھی جیسی اِدھر کی۔ پر کام چل رہا تھا۔ اقبال صاحب جو موجود تھے، جو اپنی سی۔ ایس۔ ایس والی انگریزی میں سب سنبھال رہے تھے۔

آنکھ شاید ابھی لگی ہی تھی۔ پھر اشرکا کی بیل بجی۔ ناشتہ آیا تھا اور ساتھ میں یہ بھی پوچھا گیا تھا، آپ لنچ کتنے بجے کریں گے۔

"کہہ دیجئے دو بجے۔" دو بجے تک تو دال روٹی پھر تو پڑے گی تو دیکھا جائے گا۔ مخصوص لیٹ ڈھاک ازم والی پاکستانی ذہنیت، کتنا آرام ہے اس

فراریت میں اور توکل بھی ۔۔۔ دیکھو اور انتظار کرو ۔۔۔ دیکھو اس وقت تک خدا کیا سبب بناتا ہے یا حالات خود بخود ہی ہمارے لیے وسیلہ بن جاتے ہیں۔ تقدیر کے فیصلے میں بھی کتنی آسودگی ہے۔

شاید آٹھ کنگ تھی کا ناشتہ ڈائننگ ٹیبل پر پڑا ٹھنڈا ہوتا رہا قریب بارہ بجے تک۔ پراٹھے قیمہ انڈے سے کامل رولی، ذائقہ تقریباً اپنے وطن ہی ٹھنڈا ہونے کے باوجود اچھا۔ البتہ بنگالی رس گلے اور گلاب جامن کچھ زیادہ نہ بھائے کہ ہمارے ادھر کے بنگالی رس گلے ان کی نسبت کہیں مزیدار ہوتے ہیں۔

اب تک ہم لاشعوری طور پر موازنے کے عمل سے دوچار تھے۔ ہمارے ہاں یہ یہاں یہ وہاں ایسا یہاں ویسا اور اپنے پر اچھے اور مکمل کی اجارہ داری ہم لگاتے چلے جا رہے تھے۔ پر یہ موازنے کے ساتھ یہ جو ٹیس سی اٹھتی تھی جس کی گونج سی دونوں پسلیوں میں سنائی دیتی تھی۔ اس کی حقیقت نفسیات والے جانیں اور یہ بھی کہ احساس برتری کس کمتری کا نتیجہ ہوا کرتا ہے اور اچھے کب لگنے لگتے ہیں اور جب اچھے لگنے لگتے ہیں تو دل اُس وقت ریکٹر سکیل کے کس درجے کے جھٹکے سے گزرتا ہے۔

ڈائننگ ٹیبل پر چاول، آٹا، دالیں، پھل، دودھ کے پیکٹ، جوس، بسکٹ، چائے، چینی سارا گھریلو سودا سلف پڑا تھا جو حق میزبانی ادا کرتے ہوئے کمرشل سیکرٹری وقار بھائی صبح صبح چھوڑ گئے تھے۔ وہی عورت کی قسمت میں لکھی ہوئی سدا سدا کی گھر گرہستی کا سارا انتظام موجود کر دیا گیا تھا لیکن ایک چیز یہ بھی کہ سارا سامان پولی تھین کے شاپروں میں نہیں بلکہ کپڑے کی تھیلیوں میں ڈالا ہوا تھا۔ معلوم ہوا پلاسٹک کے شاپر یہاں ممنوع ہیں اور پولیوشن کی وجہ سے ان کا استعمال جرم ہے۔ چلو ایک بات میں تو ہم بنگلہ دیش سے پیچھے رہ گئے۔

وہیں ناشتے کی میز پر ہی کچھ بھی آ موجود ہوا۔ لانے والی دھوتی نما ساڑھی کے پلو سے سر ڈھکے بنگالی بُوا تھی جس کے کالے رنگ چہرے کی جلد بھی چمکتی تھی جیسا رنگ کا تیل ملا ہو چہرہ بنا چھوڑ دیا گیا ہو جو ابھی کے کول تین سے نکلا ہو۔ بڑے دھیمے سبھاؤ بولتی چلی گئی یہ جانے بنا کہ مخاطب کچھ بھی سمجھ رہے ہیں یا کہ نہیں وہ کیا کہنا چاہ رہی؟ ہم کچھ نہ سمجھے اگرچہ بنگلہ میں متعدد الفاظ اردو پنجابی کا آمیزہ ہیں۔ مثلاً آیا، ماں، بھائی، جیب، آدمی اور بے شمار دیگر۔ لیکن لہجے کی تبدیلی سمجھنے نہیں دیتی۔ ایک ملتے یکساں مخرج رکھنے کے باوجود اپنی ہی بولی کیسے اجنبی ہو جاتی ہے۔ کتنی مثالیں، کتنی اکائیاں ذرا سے بدلے ہوئے لہجے کی نذر ہو جاتی ہیں۔ یہ لہجے کی ذرا ذرا تبدیلیاں سیدھی جا کر مطالب میں گھستی ہیں، ذہن اور ابلاغ کے فاصلے بڑھا دیتی ہیں کہ بندہ ایک دوسرے کی بات ہی نہیں سمجھ پاتا۔

اٹھ کر فلیٹ کی بالکونی سے باہر جھانکا تو گلیوں اور گھروں کی چھتوں پر گملوں کا کاروان بنائے گئے تھے۔ پھول پھلواری سے آراستہ چھتیں جیسے پارک بنے ہوں۔ جگہ کی کمی کی وجہ سے باغیچے چھتوں پر چلے گئے ہیں اور پورچ زمین سے نیچے اتر گئے ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ الٹ کام بھی کتنے سیدھے لگنے لگتے ہیں جیسے مشرقی پاکستان ۔۔۔ خیر چھوڑیے بنگلہ دیش اپنی پوری جیتوں کے ساتھ ہمارے سامنے موجود تھا۔ اتنا سرسبز اور شاداب! ارے یہ پودے تو ہمارے ہاں بھی ہیں۔ وہی پام، وہی مروکیریا، وہی فلیکس، وہی بیلیں، وہی پھول، وہی پیڑ ہمارے اپنے والے ہی تو ہیں۔ ادھر اور ادھر کی آب و ہوا میں یکساں پنپتے ہوئے شناخت اور اشتراک کا عمل اچھی زمین پر کیسی آسودگی دیتا ہے۔ ہاں بس ناریل ادھر پنجاب میں نہیں ملتا پر کراچی میں تو یہ بھی نظر آتا ہے۔ کچھ پھلوں کی مالائیں، جن کے گچھوں کے گرد لپٹی تھیں۔ موٹے موٹے منکوں والی جیسے کوئی ملنگ مالائیں ڈالے ہوں۔

دائیں ہاتھ تعمیر ہوتی کئی منزلہ عمارت پر مزدور مرد عورتیں کام کر رہے تھے۔ شناخت اور اپنائیت کا پھر اشتراک ہوا۔ مزدور تو شاید ہر جگہ کے ہی ایک جیسے ہوتے ہیں۔ وہی پتلی بنیانیں، کس کر منڈھا ہوا اچھوٹا سا، مختصر چارخانہ دھوتیاں، تنگ گھیر والی اور عورتوں کی اوڑھنیوں جیسی ڈال بیل پر بغیر بھی اوپر شرٹ جو ہمارے ہاں پٹھان پہنتی جاتی ہیں۔ یورپین نے سب سے پہلے بنگال کو اپنی منڈی بنایا۔ اُن کی نشانیوں میں سے ایک یہ نشانی بھی یہاں پوری طرح موجود ہے جبکہ بنگال کا اپنا کرتا تو گھٹنوں تک جھلتا ہوا ہمارے کرتے کے قریب قریب ہی ہے۔ اگرچہ اب لنڈے کلچر سے متاثر ہو کر نوجوان لڑکوں میں پوری دار پاجامہ کرتا بھی رواج پا رہا ہے۔

دلی کی ساڑھیاں جو ساڑھی کے خاص تصور کو بری طرح مجروح کرتی تھیں۔ بنگلہ گھروں میں لپٹی ہوئی تال نہ لبکتا ہوا پلو، یہ ایک سوتی دھوتی ہی تھی جو کمر سے بل کھاتی کمر کو ڈھانپے لپٹی تھی۔ بالکل ایسے ہی جیسے ہمارے ہاں کسان عورتوں کی گھسی پٹی دھوتیاں جو کبھی اچھی یا تنگی کے کندھے پر داغ سا ہیں۔ ایسے ہی یہ ساڑھیاں لڑکیوں، عورتوں اور داسیوں کی ساڑھیوں کی تحریف معلوم ہوتی ہیں۔ البتہ دھوتی نما ساڑھی کے اندر ہڈیوں کی سخت مختصر ہونا دکرور ہوتی ہے۔ دھوتی کے اندر بھی بچیاں، بندھا ہٹی کھلے پیر والی اور مضبوط نظر آتی ہیں۔ شاید یہ گندم اور چاول کا بنیادی فرق ہے لیکن یہ فرق کمر پر چھوٹے اینٹیں اٹھا کر گھر پر چڑھنے میں تو کہیں حائل نظر نہ آتا تھا۔ وہی دست چھانے والا چھاتا، وہی کردن کی سیڑھی، وہی اینٹیں، وہی سامرا، وہی لب و لہجہ کی شکلوں کی شناخت تھوڑی مختلف تھی۔

بائیں ہاتھ ایک محل نما گھر تھا جس کی چھت پر جنگلی پھلواری کے بیچ دھان کے کھاتے کی ڈھلانی ساخت والی آرائش جو بنی ہوئی تھی۔ بنگال کی دیہی معاشرت کا نچ پیش کیا گیا تھا۔ نیچے وسیع لانوں میں چھتریاں لگا کر جدید صوفے سیٹ رکھے گئے تھے۔ دیواروں کے ساتھ پنجروں میں پھڑپھڑاتے مور اور اعلیٰ نسل کے کتے بند تھے۔ جہاں چوکیدار اور ملازم اور کتوں کے گھر بھاگتے پھرتے تھے۔ مالک آنے والوں میں بھی کبھی نظر نہ آئے تھے۔ یہ لینڈ لارڈز کی اصطلاح بھی

عجیب ہے۔ ڈولیاں اور پتلیاں تو نظر آتی ہیں پر انہیں چلانے والے ہاتھ دکھائی نہیں دیتے۔ اس گل کے چوراہوں میں B.M.W، مرسڈیز، کھڑی ہوتیں جس کے سامنے سے گزرتی سڑک پر سائیکل رکشہ دوڑتے جنہیں پیچھے لگی ہوئی ڈولی میں بھری چار چار سواریوں کو لادے پر بلند دھوتی والا شخص کھڑا سائیکل سوار کھینچ رہا ہوتا۔ بچوں نے اس انوکھی سواری پر حیرت اور خوشی کا اظہار کیا۔

”توبہ غریب، سائیکل رکشے والے“ ہمارے ہاں تو مدت ہوئی بہاولپور سے سائیکل رکشہ ختم ہو گیا۔“ ہم نے ایک سیاسی لیڈر کے اس مستحسن اقدام کو سراہا۔ تھوڑا افتخار اور بڑھ گیا اور سائیکل رکشہ چلانے والوں سے ہمدردی گہری ہو گئی۔ اگر بہاولپور میں تا حال یہ رکشا چل رہا ہوتا تو ہم یہ پُر فخر لمحۂ ہمدردی کیونکر حاصل کر سکتے تھے۔ کسی سے ہمدردی بھی انسان کے اندر کیسا اعتماد اور غرور بھر دیتی ہے۔ محبت جذبات کو منفعت کیوں لگتی رہتی ہے اور احساسِ زیاں کس سطح پر جا کر احساسِ برتری میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ یہ بھی کوئی نفسیاتی سا ہی مسئلہ تھا۔

شام کو ہمارے میزبان وقار شاہ صاحب اور ان کی بیگم ڈاکٹر فریسہ آئیں۔

”چلیں آپ کو بازار کا چکر لگوا دیں۔“ یعنی شاپنگ، عورتوں کی پسندیدہ سرگرمی، کسی نئی جگہ جانے کا بنیادی جواز، ضرورت اور استعمال سے قطع نظر خریدو، زندگی کا بیشتر حصہ باہر گزارنے والے لوگوں کے انتظار کا عذاب جھیلتی بیویوں کے لیے شوہروں کی کمائی سے لیا گیا آسودہ انتقام۔ ایام گزاری ونڈو شاپنگ۔

”لیکن ہمارے پاس تو ٹکے نہیں ہیں۔“ ٹکا اور روپیہ کی قدر ایک ہی ہے لیکن ایئرپورٹ پر منی چینجر نے پاکستانی سو کے 90 ٹکے دیئے تھے۔ یعنی وہی ڈاؤ، داؤ، اس لیے ہم نے زیادہ روپے ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا تھا اور جو پاس تھے وہ اتنے نہیں تھے کہ شاپنگ کی جائے۔ ”لیکن ڈالر نہیں۔ جا تک لینے میں کیا حرج ہے۔ یوں بھی آپ چاہیں تو مجھ سے ٹکے تبدیل کر سکتی ہیں۔ آج ڈھاکہ شہر تو آپ کو دیکھنا چاہیے۔“

ڈاکٹر فریسہ کی تجویز بڑی معقول تھی۔ یہاں کے نوٹوں کی تو دنوں بعد تک سمجھ نہ آئی۔ ایک ہمارے نوٹ بڑے بڑے یکساں ہر ایک پر قائداعظم کی چھپائی ہوئی تصویر، اور پہچان کے لیے نوٹ کا گھر درا کا لڑنا کہ جعلی نوٹ نہ بنیں پھر بھی پتہ نہیں کیسے اصل سے زیادہ جعلی گردش میں رہتے ہیں۔ جعلی پولیس مقابلے، جعلی مقدمے اور پھانسیاں، جعلی الیکشن اور اُمیدوار، جعلی حکومتیں اور وزارتیں، جعلی ادارے اور نوکریاں، جعلی روپے اور کردار تو پھر جعلی نوٹ چہ معنی دارد۔ یہاں بھی جعلی نوٹ بہت چلتے ہیں کہ تیسری دنیا کے تمام ملکوں کی سائیکی ایک جیسی ہی ہوتی ہے جس کی بنیادی اکائی دھوکہ ہے۔ قوم سے دھوکہ، اداروں سے دھوکہ، فرد سے دھوکہ، ہر سطح پر دوسرے کو بیوقوف بنانے کی کوشش۔ یہاں پانچ سو کا سب سے بڑا نوٹ ہے۔ کسی پر مجیب الرحمٰن کی تصویر کوئی پتھر تصویر کے حسینہ واجد آتی ہیں تو تصویر بنا دیتی ہیں۔ خالدہ ضیا آتی ہیں تو تصویر اڑوا دیتی ہیں اور ہم جیسے غیر ملکیوں کے لیے ان نوٹوں کی شناخت مشکل بنا دیتی ہیں۔ رنگ مختلف، سائز مختلف، تصویریں مختلف، چھوٹے چھوٹے ٹکٹی سے نوٹ۔ معیشت کا تو اکنامکس والے جانیں لیکن کسی قوم کی تاریخ، ثقافت، جمالیات اور نیچر کے غماض یہ نوٹ بھی ضرور ہوتے ہیں۔ شاید اسی لیے سکہ سازی کو فنونِ لطیفہ میں شامل سمجھا گیا تھا۔ بنگلہ دیشی نوٹوں میں بدصورتی ہی نظر آئی۔ مجبوری دور والی گھبراہٹ تھی پھر یہ کہ ہم خوش جگہ والی مجبوری گھبراہٹ سے دو چار تھے۔ ڈاکٹر فریسہ ہماری بہت اچھی گائیڈ تھیں۔

”یہاں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو پاکستان میں نہ ملتی ہو بلکہ وہاں نسبتاً اچھی اور سستی چیزیں دستیاب ہیں۔ پاکستان کی تو بات ہی کیا ہے۔ ہمیں تو اپنے ملک کی یہاں آ کر قدر آ گئی۔ یہاں مہنگائی اُف توبہ، کوئی پھل کوئی سبزی ترکاری سو ٹکے سے کم نہیں۔“

ہم سب نے مل کر اپنے وطن کی رطب اللسانی کی۔ اب پتہ چلا 47 کو ہجرت کرنے والی بڑی بوڑھیوں کو اب تک، یہاں کی نعمتوں سے پچپن سال بسر ہونے کے باوجود نہ سبزیوں میں وہ ذائقہ ملا، نہ پھلوں اور اجناس اور موسموں میں وہ مٹھاس رس اور تاثیر، جو وہ امرت سر یا جالندھر کے کسی چھوٹے سے گاؤں میں چھوڑ آئی تھیں۔

فریسہ نے اپنی بات جاری رکھی۔

”تنگ آ گئے ہیں۔ چھ سال سے یہاں رہ رہے ہیں۔ بچوں کی ایجوکیشن اس قدر مہنگی لاکھوں ٹکا سالانہ فیسیں جاتی ہیں۔ طرفہ تماشہ ہر سال پچاس ہزار ٹکا ایڈمیشن فیس نئے سرے سے بھرنی پڑتی ہے۔ اگر گورنمنٹ آف پاکستان بچوں کا تعلیمی خرچ برداشت نہ کرے تو ہم سے تو ممکن ہی نہیں۔ یہاں سیکورٹی کا مسئلہ الگ اور پاکستانیوں کے لیے تو ویسے بھی حالات بہت خراب ہیں۔ آپ آزادی سے گھوم پھر نہیں سکتے، لیکن پھر بھی چند چیزیں آپ خرید سکتی ہیں۔ مثلاً راج شاہی سلک، ساڑھیاں، پٹ سن اور سرامکس (Ceramics) جس کی کوالٹی یہاں بنگلہ دیش سے ہی مل سکتی ہے۔ Bone China Set یہاں بنتے ہیں پھر فرانس جاتے ہیں پھر فرانس کی مہریں لگ کر پوری دنیا اور پاکستان میں آتے ہیں اور لاکھوں میں بکتے ہیں۔ وہی آپ یہاں چند ہزار میں خرید سکتی ہیں۔ ایک ڈنر سیٹ تو بیٹی کے لیے ضرور لے لیں۔“

”ابھی سے۔۔۔“ میں نے دس سالہ زریاب کو دیکھا، یہ لڑکیاں بھی زری آکاس بیل ہیں۔ پیدا ہوتی ہیں تو ماؤں کو ان کی شادی کی امر بیل چمٹ جاتی ہے۔ اور جہیز کی فکر، اچھا پہننے، اچھا کھانے کے رستے میں جہیز کے کھونٹے گڑی ہو جاتی ہے۔

باہر بازاروں میں بنگال کا جادو بکھرا پڑا تھا لیکن جادوگر کا شہر کہیں کہیں نظر آیا۔ موٹے موٹے نقوش، سانولے چہرے، چھوٹے قد، البتہ ایک

چمک لیکن ضرور تھی جو بالوں کی سیاہی سے نکلتی' آنکھوں سے جھلکتی' گالوں سے چھلکتی کو ایک نمبر ۱ درسا پردۂ بصارت میں کھبتا چلا جاتا۔

یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ یہاں ساڑھی بہت کم پہنی جارہی ہے اور شلوار قمیص رواج پارہی ہے۔ لمبی قمیصیں اور کھلے پائنچوں والی بھاری شلواریں جو ہمارے ہاں کچھ برس پہلے کا فیشن تھا۔ وہاں ابھی مروج ہے۔ ساڑھی مزدور عورتوں' تقریبوں یا پھر بڑی عمر کی عورتوں تک محدود ہوگئی ہے۔ ساڑھی اپنے پُرتکلف لوازمات کے ساتھ تقریبات کا حصہ ہے لیکن روزمرہ اُسے Manage کرنا مشکل ہے۔ جینز بھی پہنی جاتی ہے کھلے پائنچوں والے پائجاموں کا رواج عام ہے اور سب سے بڑھ کر شلوار قمیص چل رہی ہے۔ اپنے لباس کی مقبولیت خوش کرگئی۔ انسان بھی بنیادی طور پر کتنا خود غرض ہے اپنے اثرات کا غلبہ بھی اچھا لگتا ہے۔ البتہ طبقہ امراء میں مغربی لباس خصوصاً جینز' ٹراوزر اور شرٹس ہی لڑکیاں پہنتی ہیں۔

خریداری میں سب سے بڑا مسئلہ زبان کا تھا۔ یہاں دوگنی قیمتیں بتا کر آدھی سے بھی کم میں چیز فروخت کردی جاتی ہے لیکن بھاؤ تاؤ تو ظاہر ہے کہ بنگلہ میں ہوگا۔ اگر آپ انگریزی کا سہارا لیں گے تو پھر آپ کو غیر ملکی سمجھ کر قیمتیں مزید بڑھادی جائیں گی۔ 1971ء کے بعد اردو زبان کو یہاں ختم کردیا گیا تھا۔ اس کا پڑھنا لکھنا سرکاری طور پر ممنوع قرار پایا۔ اسی لیے بعد کی نسل اردو بالکل نہیں جانتی' اور جو جانتے ہیں وہ یہ ظاہر نہیں کرتے اسی لیے تو ایک دکان پر جب مریان نے کہا' بڑی گرمی ہے' تو دکان دار نے فوراً پنکھا چلادیا لیکن یہ تاثر بالکل نہ دیا کہ وہ ہماری زبان سمجھ رہا ہے تو خریداری کے لیے زبان کا جاننا بہت ضروری ہے اور ہماری گائیڈ ڈاکٹر فریدہ ایسے ہی بنگلہ بولتی تھیں جیسے اُن کی دوسری زبان ہو۔ یہ جملہ تو ہم نے بھی سیکھ لیا۔ "ایٹا کوتو کورے" یعنی اس کی کیا قیمت ہے" اور "خوشنو" یعنی ذرا سستا تو ۔۔۔" پہلے بچوں کے کپڑے خریدے جائیں کہ ان کی فرمائشیں پوری نہ ہوئیں تو پھر مزید کوئی خریداری ممکن نہ ہوسکے گی۔ چاندنی بازار میں بچوں کے کپڑے بھرے پڑے تھے۔ تنگ گلیاں اور چھوٹی چھوٹی دکانیں جیسے ہمارے پرانے بازار خصوصاً شمالی علاقوں کے بازار ہیں۔ کھوکھا نما دکانیں مال سے اٹی ہوئی۔ آدھی گلی میں پھیلے بکھرے ہوئے کپڑے نے ڈھکا کھا رکھا تھا گزرنا مشکل' آتے جاتے ایک کو دوسرے کو راستہ دینا پڑتا تھا۔ ایک [illegible] ہوئی جس کی قیمت پوچھی۔ "دو شو ٹکا" ہمیں اس وقت مزید حیرت ہوئی جب ڈاکٹر فریدہ نے کہا "نہ دو شو ٹکا نہ پچاس ٹکا"

اسّی ٹکا (80) میں سودا طے ہوا۔ ہم نے ایک ہی دکان سے ہزار ٹکا میں بچوں کے اتنے کپڑے خرید لیے کہ اٹھانا مشکل ہوگیا۔

دراصل بنگلہ دیش نے گارمنٹس خصوصاً سٹیچنگ میں بہت ترقی کی ہے۔ وہ فیبرکس باہر کے ملکوں سے منگواتے ہیں مثلاً آسٹریلیا' مصر' پاکستان' انڈیا وغیرہ اور یہاں سٹیچنگ ہوتی ہے۔ پورے ڈھاکہ میں سٹیچنگ یونٹ بکھرے پڑے ہیں۔ دنیا میں اسے ایک معیار حاصل ہے۔ بڑے بڑے برانڈز کے گارمنٹس یہیں تیار ہوتے ہیں۔ کچھ ریجیکٹڈ یا پھر چوری کا مال باہر آکر انتہائی سستے داموں بکتا ہے۔ راج شاہی سلک کی کوالٹی بھی بہت بڑھیا تھی۔ ایسی خوبصورت ساڑھیاں جو کسی لڑکی کو کلاسیک مشرقی حسینہ کا اعزاز دلا جائے' ڈلش پرنٹ' بلاک پرنٹ' رنگوں اور ڈیزائنوں کی کہکشاں' ڈھاکائی عریبیوں میں لہراتے آنچلوں جیسی چال جیسے ساکت جھیلوں میں پروا چہل قدمی کرتی ہو۔

ململ کے دوپٹے ڈھاکہ کی ململ' جس کے داستانی تذکرے بچپن کی کہانیوں اور بڑوں کی گفتگو کا حصہ ہیں۔ انگوٹھی میں سے تھان گزار لو۔ یا کسی کی کوئی مثل ہے۔ انتہائی نفیس اور خوبصورت' دو شو ٹکا میں ایک دوپٹہ خرید لو۔ کرنوں کی چلمن سی شانوں' بالوں کو سجا دے۔ سنولاہٹ میں گلابی رنگوں کا چورا' جس کے ذرے بنگالی گالوں اور آنکھوں کو دمکا دیتے ہیں۔

پرل بھی بتایا گیا' یہاں بالکل Real ملتے ہیں' ایک لڑی آٹھ نو سو ٹکا میں جو گلے کے گرد ڈبل آسانی لپٹ سکتی ہے۔ سفید اور سنہرا رنگ' پالش والے بھی چاہیے سارے ہی گلے میں ڈال لیں۔ موٹی موٹی بنگالنیں بھی دیکھیں' پھولی پھولی ساڑھیوں میں کئی کئی لڑیوں کو آپس میں بل دے کر گلے میں پہنتی ہوئیں۔ صحت مند امیر بنگالنیں مختلف کٹس والے پرل کے سیٹ' بندوں اور ہاروں کے آرڈر دیتی ہوئیں' ہماری ڈائمنڈ اور سونے کے سیٹ خریدتی ہوئی بیگمات کے مقابلے میں خاصی کمزور لگیں۔

چینی کے برتنوں کی دکانوں میں بون چائنا کی ورائٹی بھری تھی اور انتہائی معقول قیمت پر دستیاب تھی۔ نازک شفاف اور نفیس' سفید' کوالٹی کوٹڈ جیسے ڈیکوریشن پیس ہوں۔ سٹائل پکچرز' منظر نگاری پر قیمتیں طے شدہ تھیں۔ آنکھیں بند کر کے خرید لو' چیز اچھی ہے۔ عام دکانداروں کا انداز وہی بھاؤ تاؤ والا تھا۔ سستے مال سے فٹ پاتھ ریڑھیاں اور کھوکھے سجے تھے۔ مصنوعی زیورات' چینی اور پلاسٹک کے برتن' لنڈا گارمنٹس' ڈوری' پونیاں' وہی امبر کچھ آدھ پونی سڑک پر تجاوزات کی بھرمار ایشیائی کلچر ہے' جیسا بنگلہ زبان کا مرکب بہاؤ' اتنا تیزی سے بولتے جیسے کوئی سمندری طوفان شور کرتا [illegible] کی رفتار سے بانس کے جھونپڑوں اور کشتیوں کے تختوں کو چیرتا پھاڑتا بڑھتا چلا آرہا ہو۔ البتہ ایک چیز بڑی شدت سے محسوس ہوئی کہ کھانے پینے کے پوائنٹ یہاں بہت کم تھے۔ نہ ٹھیلوں اور تنوروں کو لگے فٹ پاتھ پر جابجا گرم سینڈوچ' جوس' ملک شیک کے کھوکھے اور کھابوں سے لدی ہوئی ریڑھیاں' نہ کہیں فوڈ سٹریٹ۔ جس طرح ہمارے ہاں بازاروں گلیوں کے گندے کھابوں سے تھڑے تھڑے ہوتے ہیں کہ نہ چاہتے ہوئے بھی آپ چٹ پٹی کیا بات خود میں بھر لیتے ہیں۔ یہاں چاہتے ہوئے بھی کہیں کھانے کو کچھ نہیں رہتا۔ بنگالیوں کی سمارٹنس کی ایک وجہ یہ بھی ہوگی کہ کھانے کو ڈھونڈنے کے لیے خاصی تگ و دو کرنا پڑتی ہوگی۔

☆

''چشمہ رواں''

اجمیر شریف

محمود شام (کراچی)

للہ الحمد۔ کہ خواجہ کا بلاوا آیا
کتنی صدیاں بھی مرے ساتھ چلی آئی ہیں
کتنا خوش بخت ہوں پھر ایک حضوری ہوگی
پھر سے جغرافیہ تاریخ تماشائی ہیں

وقت کو یاد ہیں فیضان کے سارے ادوار
ایک چشمہ ہے کہ ہر لحہ رواں رہتا ہے
کتنے پیاسے ہیں جہاں بھر سے چلے آتے ہیں
رات دن عرض گذاری کا سماں رہتا ہے

اسی دربار میں شاہوں نے فقیری مانگی
اک اشارے سے گداؤں کو شہنشاہ کیا
کتنے سلطان جھکائے ہوئے گردن آئے
کتنے گمراہ تھے۔ پھر راہ سے آگاہ کیا

مانگنے جو بھی یہاں آتے ہیں پالیتے ہیں
اک نظر ہم پہ بھی فرمایئے چشتی چشتی
پیاس لوگوں کی شب و روز بجھانے نکلیں
ہم بھی اس دور میں ہو جائیں بہشتی بہشتی

○

سدا سہاگن

(قردی رومانوی غزل کے نام)

شبنم شکیل (اسلام آباد)

جیسے ملہار چھیڑ دے کوئی
جیسے برسے بہار کا بادل

جیسے بارش میں بھیگتا ہو چاند
جھیل میں جیسے کھل رہا ہو کنول

جیسے رانجھے کی بانسری سن کر
ہیر کے پاؤں کی بجے پایل

اِک مدھر راگنی محبت کی
جس میں لگتی ہوں سب سُریں کومل

جیسے داسی ہو کام دیو کی اک
سانوری نار دھ بھری چنچل

مالا جپتے ہیں نام کی اِس کے
عشق نے جن کو کر دیا پاگل

دل میں سب کے پجاری اک ہلچل
ایسا لہجہ کہ جایئے تل تل

روپ اس کا کبھی ہے اگنی سا
کبھی شبنم کے جیسا نرمل جل

خود بخود دیپ جل اٹھیں جیسے
روشنی شاعری میں جائے ڈھل

بیت جیسے امیر خسرو کی
میر کی جیسے کوئی تازہ غزل

○

رباعیات

عبدالعزیز خالد (لاہور)

(۱)

مقسوم ہے غالباً ہم ایسوں کا وہی
غالبؔ نے بیاں جس کی حقیقت کر دی
"پیچھے بھی میرا کوئی غمخوار نہیں
مرنے پہ عزادار نہ ہوگا کوئی!"

(۲)

اسلام کے نام پر کریں خونریزی
چنگیز کی آل کھیلیں خوں کی ہولی
باقی ہے وہیں قبائلی ذہنیت
غلبہ ہے رسومِ جاہلیت کا وہی!

(۳)

اقدار کی ایسے ہوئی کایا پلٹی
تفریقِ ستودہ و نکوہیدہ مٹی
گو دعوے ہیں مصطفوی ہونے کے
اطوار ہیں لیکن سارے بولہبی!

(۴)

تہذیب کے ہر مظہر سے ان کو عناد
انسان کشی ان بوالجہلوں کا جہاد
اٹی کو ٹڈا کرے جیسے پامال
یونہی کریں طالبان ہم کو برباد!

(۵)

سانسیں ہیں ہر اک فردِ بشر کی محدود
ہے دائرۂ کار بھی اس کا محدود
مطلوب ہے سعی اس سے بحدِ مقدور
قطعِ نظر اس سے گوئے سبقت کہ رہوں؟

(۶)

ہو کر بھی ہو تزکیۂ نفس کہاں
رہتی ہے بڑھاپے میں بھی حرص جواں
دعویٰ تو کریں ترکِ علائق کا بہت
مشکل ہے کہ ہوں تارکِ لذاتِ جہاں!

(۷)

بنتے ہیں زمانے میں وہی بختاور
رکھیں نہ قدم جو اپنی خو سے باہر
بے معرفتِ نفس ہو معلوم کسے
کیا عظمت و پستی ہے اس کے اندر؟

(۸)

"رمّازِ رموز بیں پردہ نہ ہوا
اسرارِ نہاں سے کوئی آگہ نہ ہوا
جو بھی کہے کوئی کہ از روئے قیاس
مجمل ہر شے، قصہ کوتہ نہ ہوا!"

(ترجمہ)

ڈاکٹر یوگیندر بہل تشنہ (دہلی بھارت)

۲۰۰۸ کی آخری نظم

جن کا کوئی خدا نہیں ہے، اُن کو خوفِ خدا ہو کیسے!
دیکھیں جو رب ہر بشر میں، اُن سے اللہ جدا ہو کیسے!

اُٹھا کر دیوارِ بغض و نفرت ہوئے جو منکر انسانیت سے
میں سب میں خود کو دیکھتا ہوں کوئی ''خود'' سے خفا ہو کیسے!

کدورتوں کا سم قاتل، کبھی روحوں کو نہ پلاؤ!
یہ ''جوک'' تجھ کو لگ گئی تو، تیرا اُس دن بچاؤ ہو کیسے!

سانپوں کے پھن دکھا کے مجھکو جو حقارت سے دیکھتے ہیں
میں تو کوئی نہیں ہوں دُوجا، مجھکو اُن سے گلہ ہو کیسے!

فریبِ عیار میں اُلجھ کر، کب سے الگ ہوئے ہو!
آؤ مل جائیں پھر سے یارا، بچھڑا ملا ہو جیسے!

گیتا، انجیل، قرآن، درسِ آدمیت کے نگہبان
مسئلوں کا حل، باہم سوچیں، آدمی کی بقا ہو کیسے!

ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی، رنگ و نسل کے یہ طبقے سب ہی
بانٹنے کے سلسلے ہیں تشنہ، بندے سے بندہ جدا ہو کیسے!

○

''شرپسندوں سے خطاب''

(۲۷ نومبر ۲۰۰۸ء ممبئی میں شرپسندوں کے حملے سے متاثر ہو کر)

تُو اور نہیں، میں اور نہیں، کیوں خود سے خفا ہو بیٹھا ہے
جو نورِ خدا ہے تجھ میں بسا، مجھ میں بھی وہی تو بستا ہے

سکھاتا نہیں مذہب بیر رکھنا آپس میں ہے مل جل کر رہنا
ہے ''بانگِ درا'' میں بھی لکھا علامہ اقبالؔ یہ کہتا ہے

زندگی دینا، زندگی لینا، اللہ کا وہی واحد حق ہے سُن!
گنا ہ سے ملوث ہو جائے گا تو جو اس پر یقین نہیں رکھتا ہے

یہ جنگ و جدل، یہ آگ زنی یہ دہشت گردی اور خونریزی
یہ کار ہیں شیطانوں کے شیطان ہی کاٹتا، بانٹتا ہے

خود پرستوں کی باتوں میں آ کر احترامِ دین ہو بھول گئے
آ پیار، محبت بانٹیں ہم بھی قرآن، بائبل، گیتا ہے

بندوق بدست اِن ہاتھوں میں لے مشعلِ الفت، رستہ دکھا
دے اہلِ مغرب کو درسِ وفا، یہ ہی اہلِ شرق کا رستہ ہے

آ جہاں میں محبت عام کریں مذہب کو نہ ہم بدنام کریں
''جیو اور جینے دو'' کا ہو چلن اس طور سے فاصلہ گھٹتا ہے

شیطانوں کے جنگل میں نہ پھنسو گلزار کی صورت درست جیو
''ہم سب ایک خدا کے بندے ہیں'' ہر دین دھرم بھی کہتا ہے

یک طرفہ جھگڑا دوست میرے کبھی رہتا نہیں ہے دیر تلک
ہم بھول گئے جو تم نے کیا، تشنہ کو تو پیار ہی آتا ہے

○

ہم کون لوگ ہیں؟

(خودکش حملوں کے پس منظر میں لکھی گئی ایک نظم)

غافر شہزاد؟ کاظمی (کراچی)

سنا تھا ہوں کہ ہم سب
بہت بہادر ہیں
بہت جری ہیں
بہت جنگجو ہیں
وحشی ہیں
کہ ہم۔ پہاڑوں کے بیٹے
چٹانوں کی نسلیں
کہ جن کی مائیں بھی
جزاؤں کے کلیجوں کو
ابھی تلک سرِ مقتل
چبائے جاتی ہیں
ہماری بستی میں
یوں تو بہت سی عماریں ہیں
مگر یقین ہے کہ عمارِ حرا نہیں کوئی
یہاں پہ مدرسے
اہلِ مدرسہ ہیں بہت
کہ جن کے حجروں میں
کچھ ایسی دور بینیں ہیں
جہاں بہشت کے منظر۔ دکھائے جاتے ہیں
جہاں پہ حوریں وغلمان
پائے جاتے ہیں
سنا تھا ہوں کہ ہم سب
بہت بہادر ہیں
بہادری ہے کہ بارود کا
کفن اوڑھے
کسی علاقے کی معصومیت
سے ٹکرا کر
جو ہم مریں تو مریں
دوسرے بھی مر جائیں
ہمیں تو ہیں۔ جو ثقافت کی مردہ رسموں میں
ثواب کا کوئی پہلو نکال لیتے ہیں

ہمیں تو ہیں
کہ جو تہذیب کے تصادم میں
جفا گروں سے۔ غنیموں سے
لڑ نہیں پائے
ہمیں تو ہیں جو شناگر ہیں
کاروکاری کے
جو بیٹیوں کو بھی
زندہ ہی دفن کرتے ہیں
ہمیں تو ہیں کہ جو صحرا میں
اپنے لوگوں کو
تلاشِ حق کیلئے
ذبح کرتے رہتے ہیں
ہمیں تو ہیں۔ جو خدا کی قسم
زمینوں پر
فسادِ خلق کا آئین
عام کرتے ہیں
ہمیں تو ہیں کہ
جہادوں کے نام پر یارو
خود اپنے گھر کو جلا کر تماشہ دیکھتے ہیں
ہمیں تو ہیں جو
شریعت کا نام لے لے کر
بموں کے شعلوں میں
انسان کو جلاتے ہیں
ہمیں تو ہیں کہ جو دشمن ہیں
اپنی جانوں کے
ہمیں تو ہیں جو
عبادت گہوں میں گھس گھس کر
عجب جنوں ہے کہ سب کا لہو بہاتے ہیں
سو اب عزیزو بتاؤ...... بہادری کیا ہے؟
دیارِ عشق میں راہ و پیمبری کیا ہے؟

○

روشنی

قیصر نجفی (کراچی)

اے خوشا وہ صبح جس کو
ساری صبحوں پر تفوق ہے نصیب
کوہِ فاراں کی فلک پیما بلندی سے ہوئی تھی آشکار
اور ہوا تھا جلوہ آرا
آفتاب آفتاب
دامنِ جاں میں لئے وہ روشنی
جو جہانوں کی ازل سے
تا ابد ضیا دے

اے خوشا وہ صبح کہ دن
جو سرِ فاراں مجسم ہو گئی تھی
اور جب گویا ہوئی تو
حق نوائی کے جھرنے تھے
پھول، جن کی خوشبوؤں کے قافلے
اس روشنی کا لے کے پرچم
چل پڑے تھے
تا کہ قرنوں
سے بھٹکی آدمیت کو
نشانِ راہ ملے
منزل ملے

○

نیلی موت

انگریزی سے ترجمہ (گلزار ممبئی بھارت)
سنگریتا (دہلی بھارت)

بیکراں نیلے سمندر
کہیں سے سفید ہوتے آسماں کے درمیاں
میں کھڑی تھی
ایک نقطے کی طرح
بے پناہ اس کائنات میں
کبھیاں نیلے میں ریلنگ پر کھڑی تھی
بہتی ہوا سا سے بوسے کی طرف
ایک طوفان
ایک جھنڈ شارکز کا
یا وہیلز کا
فیل ہو جائے جو انجن ''امرا'' کا
یا بیڈینگ ہی ٹوٹ جائے اگر
ایک آبی قبر۔ بس!

کچھ تو ہو
کچھ بھی سہی
کوئی معمولی یا کوئی غیر معمولی سا کچھ
تیر بھی کچھ نہیں میں
اور ساحل
وہ نظر آتا نہیں!!

○

بہادر صحافی

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی
(بھاگلپور،بہار)

ملی کردار کو جس کے بلندی آسمانوں کی
دکھایا جس نے بے باکی کا جوہر بر سرِ محفل
جہاں میں ہر طرف پھیلا ہے شہرہ جس کی جرأت کا
ہے جس کے منہ کی گالی بھی بہت تعریف کے قابل
تمنا قید کی سختی سے پختہ تر ہوئی جس کی
کہ ہے تاریخ کا حصہ بھی جوتا جس کا دس نمبر
جو پھر اپنے عمل کو چاہتا اک بار دہرانا
کہ جوتا اس بہادر کا لگے ظالم کے سر ہی پر
بہادر ہے وہ عراقی صحافی منتظر زیدی

○

زندگی

شاہد عزیز (اڑیسہ،بھارت)

یہی سب زندگی ہے
اس میں ایسا ہوتا رہتا ہے
کوئی مرتا ہے جیتا ہے
کسی کو منزلیں آواز دیتی ہیں
کوئی بے نام راہوں میں بھٹکتا ہے
پرندے پھر کہیں جا کر
کسی انجان بستی میں اترتے ہیں
اور یہ بھی بھول جاتے ہیں
کہ وہ اپنی زمینیں چھوڑ آئے ہیں
چلو ہم بھی پرندوں کی طرح سے
زندگی کو پھر سے جیتے ہیں
اور یہ بھی بھول جاتے ہیں
کہ جو ہم سے بچھڑتے ہیں
وہ ہم کو یاد آتے ہیں

گوشۂ تنہائی

کرامت بخاری (لاہور)

وحشتِ دہر سمٹ آئی ہے دروازے تک
اب در و بام کی میراث فقط سائے ہیں
غم گزیدہ ہے یہ رات فسردہ تارے
دل کے حصے میں کئی رنج و الم آئے ہیں

آج بچے ہوئے لمحات کی بھیگی آنکھیں
میرے گم گشتہ شب و روز کا غم کھاتی ہیں
کئی یادیں مجھے ملنے کا بہانہ کر کے
میری خلوت کے خرابوں میں چلی آتی ہیں

دل کے داغوں پہ برستی ہے کہیں رات گئے
میرے مجبور ارادوں کے لہو کی شبنم
اور اِس شہر کے بے مہر فضا میں ہر سو
گونجتی رہتی ہے ہر آن صدائے ماتم

سرنگوں وقت کا رہوار رواں ہے کب سے
چارسو موت کے ماحول کی ویرانی میں
لمحہ لمحہ یونہی بیزار ہوا جاتا ہے
عمر کی ڈولتی کشتی کی پریشانی میں

رات روتی ہوئی ہوتی ہے روانہ گھر سے
دن نکلتا ہے نئے غم کی کہانی لے کر
بیٹھ جاتا ہوں کہیں گوشۂ تنہائی میں
سرِ مژگاں کوئی تصویر پرانی لے کر

○

پنچ بھُجی

بھگوان داس اعجاز (دہلی بھارت)

کیوں اپنا جتا مجھے
رات رات بھر تو کے
ڈھونڈے لیے چراغ
یہاں کون دودھوں دُھلا
کون یہاں بے داغ!

کھانے کو روٹی نہیں
پاؤں میں جوتی نہیں
تن پہ نہیں لباس
رام راج کی آس میں
کاٹے سال پچاس!

پیٹ آگ بھڑکی رہی
اپنے گھر کڑکی رہی
تیرے گھر تیوہار
تو نے کس ساہو سے لی
داڑھی مونچھ ادھار

سارے ٹھاٹ امیر کے
کیا کچھ نہیں خریدتے
دین دھرم ایمان
وہ کرتے ہر چیز کا
پیسے سے بھگتان!

فاقہ کش بکری مری
آدھے گھر میں بھکری
آدھے گھر پکوان
ایک ہی گھر میں ہو رہی
دو گھر کی پہچان!

کتنے چہرے لے بدل
بیٹھ گیا جو آنکھ میں
داغ نہ جانے پائے
من سے اترا آدمی
سون مٹی ہو جائے

یہاں بکیں باہر بکیں
انگ بکیں بازار میں
آنکھیں گردہ خون
جیسے جان غریب کی
ہے دکان پرچون!

جنتا کے سائے تلے
کچھ پلے کمال
گھر میں کتا شیر ہو
پانی میں گھڑیال!

-------: میرا جی :-------

ممتاز احمد (برطانیہ)

نام نہ جانے
کیا تھا اُن کا
میرا جی مشہور تھے لیکن
جانے کیسا
روگ تھا اُن کو
"بے جوتی"
جیسا لگر
جب بھی تھے روتے رہتے
اُن کا سایہ
عشق ہوا تھا
جس کے غم میں
وکی گھر ا
اصلی نقلی جانے کیا کیا
بوتل سے یوں پیتے تھے
جیسے ازل سے پیاسے ہوں
مدہوشی کے عالم میں بھی
مے کی طلب بڑھتی ہی رہتی
باتیں اکثر مبہم کرتے
لوگ اُنہیں دیوانہ کہتے
جانے کیا کیا کہتے تھے
لیکن اپنی طرز کے واحد
تنہا اکیلے شاعر تھے وہ

پارا پار

پرت پال سنگھ بیتاب (جموں کشمیر)

کبھی کبھی کوئی نقطہ
دیکھتے دیکھتے پھیل جاتا ہے
کیسی کیسی شکلیں اختیار کر لیتا ہے
کبھی دائرہ کبھی مکون کبھی ستارہ
کبھی چاند کبھی سورج
کبھی کبھی نقطہ
نظر کے کمزور ہونے کی وجہ سے بھی
پھیلا ہوا دکھائی دیتا ہے
اور کبھی کبھار کم بہت ہی کم
دیکھنے والے کی نظر میں
دھیان کی شکتی
ایسی کمال کی ہوتی ہے
کہ جو کسی نقطے کو پھیلا کر
کھنڈ منڈل برہمنڈ
لوک پرلوک بنا دیتی ہے
کبھی کبھار کسی ایسی ہی نظر کی طاقت
کسی نقطے کو
موجود سے غیر موجود کر دیتی ہے
اور ایسے میں ایسی نظر
غیر موجود نقطے کے پیچھے چھپے ہوئے
کھنڈ منڈل برہمنڈ لوک پرلوک
بلکہ اس سے پرے کی کائنات کو بھی
دیکھتی ہے۔

○

''قطعات''

شگفتہ نازلی (لاہور)

''وقت''

آ رہے گا اِک پہر تیرے میرے درمیاں
ہو رہے گی وہ سحر تیرے میرے درمیاں
زیست کی ناؤ ترے سنگ سنگ رہے
لمحوں کا بہتا بحر تیرے میرے درمیاں!

''کتاب''

ہر صفحہ مفہوم کی سرگوشی ہے
ہر حرف میں ایک صورت تیرے میرے درمیاں
البم ہو جملوں کا جیسے روبرو
ہر تصور ایک صورت تیرے میرے درمیاں!

''شام''

سانولی سی چھب تمہاری چھا گئی
دیپ دیکھو ہیں جلے تیرے میرے درمیاں
ہے پذیرائی کی خوشبو چارسو
کیسے کیسے گل کھلے تیرے میرے درمیاں!

''شجر''

مہرباں سایہ ترا سب کے لیے
چہرے کچھ دیکھے ہوئے ہیں تیرے میرے درمیاں
راستوں کی اپنی اک تاریخ ہے
نام کچھ لکھے ہوئے ہیں تیرے میرے درمیاں!

○

اجنبی آشنا

مظہر بخاری (میاں چنوں)

آنکھ نے
آنکھ نے
جانے کیا بات کہہ دی
کہ دل مضطرب ہو رہا ہے
اور اک اجنبی پیار لمحہ بہ لمحہ
سرایت کیے جا رہا ہے
مرے جسم اور روح میں
ایسا محسوس ہونے لگا ہے مجھے
سلب کرنے لگا ہے کوئی میری آزادیاں
کون ہے!!
کس جس کا مرے جسم میں گدگدی کر رہا ہے
مجھے ایک بے نام راحت تلے
کرب میں مبتلا کر رہا ہے
نظر ڈھونڈتی ہے
مرے سامنے آ
میں تیری نظر سے
تجھے دیکھنا چاہتا ہوں
میرے اجنبی آشنا.....

○

سین ریو

نوید سروش (میرپور ماتھیلو)

رب جانے ہے سب
ہم سب کے دل کی باتیں
اپنے روز و شب

کھلتا چہرہ تھا
چپکے چپکے روتا ہوں
وہ بھی ٹھہرا تھا

وہ چپ رہتا ہے
لیکن دار پہ چڑھ کر بھی
سچ ہی کہتا ہے

تم بھی سنبھلو گے
میرا سچ سننے کے بعد
پہلو بدلو گے

کھولی تھی کھڑکی
منظر بدلا بدلا تھا
غائب تھی لڑکی

فکر کا دریا ہے
بانگِ درا کا ہر مصرع
سچ ہی کہتا ہے

نقطہ سچا ہے
اقبال کے شعروں میں
حق کا رستا ہے

کیسا ہے یہ رنگ
اقبال کا اک اک شعر
کر دیتا ہے دنگ

تخلیق عصر

نئی تصانیف کا تعارف

عطیہ سکندر علی (سکھر)

صبا اکبرآبادی کی غزل نگاری

میر کی روایت اور غالب کی امانت کے پاسبان خواجہ محمد امیر صبا اکبر آبادی کی شخصیت و شاعری کسی تعارف، تنقید و تبصرے کی قطعاً محتاج نہیں ہے کیونکہ بیس بائیس برس کی عمر سے شعری سفر کا آغاز کرنے والے حضرت صبا اکبر آبادی حمد، نعت، مرثیہ، سلام، منقبت، غزل اور رباعی میں قادرالکلامی اور صنفی نیابتی کے کم و بیش ساٹھ برس تک اس قدر کارہائے نمایاں سرانجام دیئے ہیں کہ ان کا احاطہ کرنا کسی ایک شخص یا ادارے کے لیے بہت دشوار کام ہے مگر ہفت خواں ادیب، شاعر، نقاد، محقق، صحافی اور مدیر جناب شفیق احمد شفیق نے ذمہ داری اور بردباری سے کچھ اس طور انجام دے دیا ہے کہ ایک ہی دستاویز میں آپ کی صبا اکبر آبادی کی تمام جہات سے بخوبی آگاہی ہو جاتی ہے۔ "صبا اکبرآبادی کی غزل نگاری" کے عنوان سے ترتیب دی گئی اس اردو دستاویز میں جہارگل کے عنوان سے حضرت صبا کی تصنیف "اوراق گل" کے تاثر میں ابوالاثر حفیظ جالندھری، پروفیسر فراق گورکھپوری، ڈاکٹر ابوالخیر کشفی، پروفیسر ابراہیم خلیل نقوی، پروفیسر مرزا محمد منور نے صبا صاحب کی غزل کے تمام پہلوؤں پر حاصل گفتگو کی ہے۔ حاصل تجزیہ کے عنوان سے "مجموعۂ بہار" کے حوالے سے ڈاکٹر عبادت بریلوی، ڈاکٹر سید عبداللہ اور ڈاکٹر محمد علی صدیقی کے رشحات قلم شامل اشاعت ہیں۔ نقد و تجزیہ کے زیر تحت "ثبات" کے حوالے سے جناب شہزاد احمد نے صبا صاحب کے تمام فنی پہلوؤں کو مغربی اور مشرقی حوالوں سے گفتگو کا موضوع بنایا ہے۔ حاصل مطالعہ کا عنوان "میر سے حصے کی روشنی" کے لیے جناب اکرام بریلوی کے مقالے کے لیے مخصوص کیا گیا ہے۔ سب سے آخر میں اس باتصنیفی کتاب کے خالق جناب شفیق احمد شفیق نے جناب صبا اکبرآبادی کی غزل کی تمام جہات پر مفصل گفتگو کی ہے۔ جس کا حاصل ہمارے خیال میں درج ذیل اقتباس قرار دیا جا سکتا ہے:

''صبا صاحب کی غزلوں میں تغزل اور تفکر، لفظ اور معنی، اسلوب اور اظہار کا خوب ملاپ نظر آتا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ کہ صبا صاحب نے مختلف ادوار کی روایتوں سے زندگی آمیز خیال فروز جوہروں کی کشید بڑے محتاط انداز میں کی ہے جس کے سبب انہیں نئے تجربات اور نئے مشاہدات کی شعری پیکر تراشی میں بڑی مدد ملی ہے۔ ان کا تغزل توانا تر دانہ اور ان کے محبوب جمال و کمال سے ملو شوخی آمیز شائستگی کی مثال ہے۔ ان کا تغزل ان کے محبوب کی طرح صرف خوبصورت ہی نہیں بلکہ رفتار و گفتار اور عشوہ و ناز کے حوالے سے بھی ان کی غزل ان کے محبوب کا پرتو محسوس ہوتی ہے۔'' اس کے علاوہ مجموعی تجزیہ و تاثرات کے تحت زیر نظر کتاب میں بڑی معتبریت کے حامل عنوانات تجویز کیے گئے ہیں جن میں ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، ڈاکٹر احسن فاروقی، پروفیسر مجتبیٰ حسین، جناب احسان دانش، پروفیسر ممتاز حسین، محترم فیض احمد فیض، جناب احمد ندیم قاسمی، جناب جمیل الدین عالی، ڈاکٹر خلیق انجم، ڈاکٹر الیاس عشقی، ڈاکٹر کوثر مظہری، ڈاکٹر منظور احمد، پروفیسر عبدالقوی ضیا، جناب اطہر مانوپوری، ڈاکٹر محمد علی صدیقی، ڈاکٹر ساحر عاشق ہرگانوی، جناب احمد ہمدانی، جناب حمزہ شنواری، جناب عبداللہ جاوید، جناب ہارون ایمن اور صبا صاحب کے صاحبزادے جناب تاجدار عادل کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔ اس کے علاوہ مختلف ادبی جرائد میں صبا صاحب کی شخصیت و فن کے حوالے سے خاص اشاعت کے حوالے اور تواریخ بھی درج کی گئی ہیں جن کی مدد سے صبا صاحب پر تحقیقی اور تنقیدی کام کی بابت آگاہی بھی ملتی ہے۔ پانچ صفحات یعنی صفحہ ۱۸۵ تا صفحہ ۱۸۹ اور کتاب کے آخر میں صفحہ ۲۹۵ تا ۳۰۴ یعنی مزید دس صفحات صبا صاحب کی شاعری کے لیے مختص کیے گئے ہیں۔ یہ چند لائنے بلند مرتبت شاعر کے کلام کا احاطہ اس قدر کم صفحات میں ممکن نہ ہے مگر یہ صرف قاری کے اشتیاق کے پیش نظر کیا گیا ہے ورنہ کتاب کی ضخامت اس سے زیادہ صفحات کی ہرگز متحمل نہ ہو سکتی تھی البتہ اس کی کو مضامین میں صبا صاحب کے کلام کے حوالوں نے بحسن و خوبی پورا کیا ہے۔ اسی انتخاب سے ایک شعر آپ کی آتش شوق کو مہمیز دینے کے لیے درج کیا جاتا ہے:

آئینہ بن جایئے جلوہ اثر ہو جایئے
سامنے وہ ہوں تو سراپا نظر ہو جایئے

قیمت: دوسو پچاس روپے، پتہ: ۱۸۰، بلاک ۱۸، گلشن نما، فیڈرل بی ایریا، کراچی۔

عام آدمی کے خواب

''یہ کہانیاں ایک عام آدمی کے وہ خواب ہیں جو اس نے زندگی بھر دیکھے لیکن تمام تر جدوجہد اور خواہشوں کے باوجود تعبیر نہ پا سکے کیونکہ وہ ایک عام آدمی تھا، ایک عام آدمی کے گھر پیدا ہوا، جیا اور ایک عام آدمی کی حیثیت سے مر گیا، لیکن اس نے خواب دیکھے اور خواب وراثت میں منتقل ہو جاتے ہیں، وراثت میں منتقل کرنے کے لیے اس کے پاس اور کچھ تھا بھی نہیں، سو اس نے اپنے خواب اپنے بیٹے کو جو اسی کی طرح عام آدمی تھا، منتقل کر دیئے اس امید کے ساتھ کہ جدوجہد ایک نسل سے دوسری، تیسری اور کئی نسلوں تک جاری رہتی ہے۔ یہ امید کہ شاید کسی دن ان خوابوں کو تعبیر مل جائے ـــــ یہ کہانیاں اس خواہش کی تصویریں ہیں'' ـــــ رشید امجد

''رشید امجد کا افسانہ جدید اردو افسانے کا محض نمائندہ نہیں، اس کا تاریخی بیانیہ بھی ہے۔ اس کے افسانوں میں جدید اردو افسانہ ایک نئی جہت میں اپنی تاریخ اور روایت کی تشکیل کرتا ہے۔ یہ جہت انسانی شناخت کے جدید اور کثیر الاطراف سفر سے عبارت ہے۔ رشید امجد کا جدید فرد اپنی وجودی شناخت

کے لیے اپنی تہذیبی تاریخ' مابعد الطبیعاتی روایت اور سماج سے رجوع کرنا ہے۔ اسے تاریخ و روایت میں بنا بنایا حتمی جواب نہیں ملتا' نہ اس کی اسے آرزو ہے۔ اس کا وجود جس مکانی و زمانی تناظر میں بکھرا ہے' خود تاریخ و روایت کو ایک نیا مفہوم دینے اور قبول کرنے پر اصرار کرتا ہے''۔۔۔۔ ناصر عباس نیر

''عام آدمی کے خواب'' ڈاکٹر رشید امجد کے ایک سو چھتیس مطبوعہ و غیر مطبوعہ افسانوں کا ایسا مجموعہ ہے جس میں ڈاکٹر صاحب کی فنی ریاضت کا نچوڑ اور نصف صدی پر پھیلی قلمی کاوشات کی بھرپور نمائندگی دستیاب ہے۔ اگر ناشر صاحب تھوڑی توجہ فرماتے تو یہ مجموعہ ڈاکٹر صاحب کے افسانوں کی کلیات بھی بن سکتا تھا۔ بہر حال ایک جلد میں' ایک وقت میں اور ایک کوشش میں اپنے دور کے نامور اور نمائندہ افسانہ نگار کے اس قدر زیادہ تعداد میں افسانے دستیاب ہوا کسی سوغات سے کم نہ ہے۔ سات سو پچاس صفحات مجلد کی روشن اور دیدہ زیب یہ سوغات فقط چھ سو پچاس روپے کے عوض پورب اکادمی www.poorab.com.pk سے طلب کی جا سکتی ہے۔

پاکستانی ادب کے معمار

محترمہ کشور ناہید کا نام اور شخصیت پاکستان اور پاکستان سے باہر ہر اس جگہ جانا پہچانا اور بحث کا موضوع ہوا کرتا ہے جہاں علم و ادب اور انسانی و اخلاقی روایات کا پرچم بلند رکھنا مقصود ہوا کرتا ہے۔ کشور ناہید صاحبہ ترقی پسند نظریات کی حامل ایسی شاعرہ ہیں جن کا فنی سفر قریب پانچ دہائیوں پر محیط ہے اور اس سفر کی سب سے اہم بات یہ ہے کہ محترمہ نے قلم و قرطاس کے علاوہ انسانی مسائل اور زمینی حقائق کو بھی اپنی ترجیحات میں ہمیشہ اولیت و اہمیت دی ہے۔ آپ پاکستان کی ان چند تخلیق کاروں میں نمایاں مقام کی حامل ہیں جنھوں نے ہر دور میں ظلم اور جبر کے خلاف ہر ہر سطح پر آواز بھی اٹھائی ہے اور عملی جدوجہد اور خدمات بھی انجام دی ہیں۔ پاکستانی ادب کے معمار کے تحت ڈاکٹر شاہین مفتی صاحبہ نے اکادمی ادبیات کے اس نیک کام میں عمدگی سے ہاتھ بٹاتے ہوئے محترمہ کشور ناہید کے فن اور شخصیت کو محترمہ کی تخلیقات اور احباب کی آراء میں خوبصورتی سے سجایا ہے۔ ''میں کون ہوں'' کے عنوان سے محترمہ کشور ناہید کی تحریر بھی ان کی بابت قاری کو بہت سے دلچسپ اور حیرت آمیز حالات و واقعات سے آگاہی دیتے ہیں جنھیں پڑھ کر اس باہمت خاتون کے حوصلوں کو داد دیے کو جی چاہتا ہے مگر ایک بات جو باخبر اور غیر جانب دار قاری کو اس دستاویز میں نہایت دردمندی سے کھٹکتی ہے وہ یہ کہ کشور جیسی Out Spoken اور دلیر خاتون نے خدا معلوم کیوں اپنے آپ کو محدود کئے اور اپنے مرحوم شوہر جناب یوسف کامران کو ظالم سماج سے تشبیہ دے چھڑوانے کی دانستہ یا نادانستہ کوشش کی ہے جبکہ حقیقت حال سے واقف ہر دو جانب کے بہت سے احباب ابھی بقید حیات اور مصروف عمل ہیں۔ بس ایک خامی اس نمائندہ دستاویز میں ایسی در آئی ہے جو اس کی افادیت کو کسی قدر دھندلاتی ہے ورنہ جناب کشور ناہید کے فن' شخصیت اور کارناموں سے باخبری کے لیے یہ عمدہ' نفیس اور لاجواب دستاویز ہے جس کی دستیابی اکادمی ادبیات' اسلام آباد کے دفتر سے ایک سو پچاس روپے سے مشروط ہے۔

سلطان جمیل نسیم کے افسانے

''مجھے سلطان جمیل نسیم کے افسانوں میں کیا کیا بات نظر آئی وہ میں کیف و کم مقدمہ میں خاصی وضاحت کے ساتھ لکھ چکا ہوں جس کے مزید اظہار اور تکرار کی اس مختصر سے ابتدائیہ میں چنداں ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ سلطان جمیل نسیم کو میں نے یوں بھی اپنا موضوع بنایا ہے کہ وہ کئی حوالوں سے مجھے بے انتہا عزیز بھی ہیں اور سب سے بڑی بات یہ کہ وہ ایک بہت اچھے افسانہ نگار بھی ہیں۔۔۔۔ خدا کرے یہ تجزیاتی مطالعہ ادب دوستوں کو بھی پسند آئے''۔۔۔۔ اکرام بریلوی

جناب سلطان جمیل نسیم بہت بڑے علمی اور ادبی خاندان کے چشم و چراغ یعنی حضرت صبا اکبر آبادی کے فرزند اور ناہید و عادل کے برادر افضل ہیں۔ ہر چند آپ نے شعر و سخن کو وسیلہ تخلیق بناتے ہوئے فن افسانہ نگاری کو اپنے اظہار کا ذریعہ بنایا مگر ان کے افسانوں کے مطالعے کے بعد قارئین اور ناقدین بیک اتفاق اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ جناب سلطان جمیل نسیم کا مہذب اور شائستہ انداز تحریر اور اس کے اندر بین السطور بامعنی پیغام اپنی تمام تر دھیمی اور مدھم لے کے باوجود قاری کو اپنی جانب متوجہ بھی کرتا ہے اس کی تہذیب اور تربیت کا فریضہ بھی انجام دیتا ہے اور ساتھ ساتھ اس قدر مہین و مسکین چٹکیاں بھی لیتا ہے جس سے قاری کبھی لطف اندوز اور کبھی افسردہ ہو جاتا ہے مگر اس سارے عمل میں کسی طرح کا اضطراب' بے چینی یا اکتاہٹ کا احساس تک نہیں ہوتا۔ جناب اکرام بریلوی کے ابتدائیہ سے مذکورہ بالا اقتباس آپ کی توجہ ان کی اس کاوش کی جانب مبذول کرانے کی غرض سے درج کیا گیا ہے جو جناب اکرام بریلوی نے اپنی دو سو صفحات پر مشتمل کتاب میں جناب سلطان جمیل نسیم کے چار افسانوی مجموعوں (۱) کھویا ہوا آدمی (۲) سایہ سایہ دھوپ (۳) ایک شام کا قصہ (۴) میں آئینہ ہوں کے آٹھ چیدہ افسانوں کو بحث کا عنوان بناتے ہوئے جناب سلطان جمیل نسیم کی شخصیت و فن کے قریب قریب سب ہی گوشوں پر کچھ اس طور روشنی ڈالی ہے کہ نہ صرف مصنف کے تخلیق کردہ تمام کردار بلکہ مصنف کی شخصیت بھی ہمارے روبرو ہمکلام ہونے لگتی ہے۔ ہماری بات کی تصدیق ذیل کے بیان سے بحسن و خوبی ہو رہی ہے۔

''سلطان جمیل نسیم کے فن یا ان کی تخلیقات کے بارے میں یہ بات واضح طور کہی جا سکتی ہے کہ ان کے افسانوں میں شہری زندگی کی بیشمار تصویریں مختلف زاویوں اور خوب خوب رنگوں کے ساتھ اس طرح بیان ہوتی ہیں کہ قاری سے

مکالمہ ہی نہیں کرتی بلکہ اسے احساس دلاتی ہیں کہ وہ بھی ان تصویروں میں موجود
اور ان مکالموں میں شریک ہے''۔۔۔۔نسیم درانی

قیمت: دو صد روپے بیرونی ملک' دس امریکی ڈالر، دستیابی: بختیار اکیڈمی
A-49-3 گلشن اقبال' کراچی، صبا اکبر آبادی اکیڈمی 1-A-2-37' ناظم آباد'
کراچی، انشاء مطبوعات، پوسٹ بکس نمبر 8712' صدر' کراچی، ویلکم بک
پورٹ، تحریر پبلشرز، اردو بازار' کراچی۔

پاکستانی ادب کے معمار

اکادمی ادبیات پاکستان کے زیر اہتمام گزشتہ کئی سالوں سے پاکستانی ادب کے معمار کے عنوان سے اپنے دور کے نامور اور نمائندہ اہل قلم کی شخصیت و فن کو کتابی شکل میں ترتیب دیا جا رہا ہے اس وقت ہمارے روبرو اردو' انگریزی' پنجابی کے نامور شاعر' ادیب' ڈرامہ نگار' سیاستدان اور اکادمی کے موجودہ چیئرمین جناب فخر زمان کی پیدائش سے لے کر ان کی تمام علمی' ادبی' سیاسی' سماجی اور انسانی خدمات کا تفصیلی ذکر' احاطہ اور تجزیہ پیش کرنے کی عمدہ کوشش بشکل کتاب موجود ہے۔ اس طرح کی کاوش کا ایک فائدہ قاری کو یہ ہوتا ہے کہ ایک ہی جلد میں اپنے محبوب تخلیق کار کی نسبت تمام معلومات بآسانی دستیاب ہو جاتی ہیں جس سے زیر بحث شخصیت کے بارے ٹھوس رائے قائم کرنے میں آسانی اور مزید تحقیق پیش رفت کے لیے رہنمائی دستیاب ہوتی ہے۔ ڈاکٹر امجد علی بھٹی صاحب نے بھی سوائے جناب فخر زمان کی تاریخ پیدائش تمام گوشوں پر عمدگی سے روشنی ڈالی ہے مثلاً جناب فخر زمان کے بچپن اور نوجوانی کے ایام' تعلیمی اور کھیل کود میں دلچسپی' سیاست میں آمد' لکھنے پڑھنے کی جانب رغبت' کتابوں پر اثرات اور بندش' اعزازات اور ان کی تخلیقات پر مرحلہ وار تجزیاتی رائے۔ عام تبصروں اور تجزیوں میں اکثر نمونے از خروارے کے طور پر زیر بحث تخلیق کار کی تخلیق سے کچھ نمونے یا مشاہیر کی آراء سے اقتباسات درج کر کے تحریر کو وزن فراہم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے جبکہ ہم اس روایت سے پرہیز کرتے ہوئے آپ سے گزارش کریں گے کہ ہمارا کام اس عہد کے ایک اہم تخلیق کار کی بابت اہم ترین معلومات کے ماخذ تک آپ کی رسائی اور آپ سے یہ گزارش کرنا تھی کہ اگر آپ جناب فخر زمان کی شخصیت و فن میں دلچسپی رکھتے ہیں تو ولیم فرمت میں اکادمی ادبیات پاکستان کے اسلام آباد میں واقع دفتر سے رجوع کیجیے جہاں ہمارے دور کے اہم ادیب' شاعر' ڈرامہ' ناول نگار جناب فخر زمان کی شخصیت و فن سے معمور یہ کتاب فقط ایک سو پچاس روپے میں دستیاب ہے یاد رہے زیر نظر کتاب جناب فخر زمان کے دور سے پہلے جناب افتخار عارف صاحب کے زمانے میں شائع کی گئی ہے۔

تم کب تک بھٹو مارو گے

ادب کسی بھی زبان' ملک یا خطے کا ہو زیادہ دیر تک اپنے عصر سے لاتعلق نہیں رہ سکتا۔ تیسری دنیا کے نیم جمہوری' نیم اسلامی ملک پاکستان میں بھی نامساعد حالات کے باوجود ہر دور میں احتجاجی ادب تخلیق ہوتا رہا ہے۔ مہذب دنیا میں جس طرح احتجاج کرنے کے طریقے رائج ہیں وہ ہیں یہ بھی لازمی تصور کیا جاتا ہے کہ احتجاج کرنے والا کسی نہ کسی نظریے اور نصب العین کو پیش نظر رکھ کر ہی احتجاج کر سکتا ہے۔ پاکستان میں بھی مختلف ادوار میں مختلف نظریات کے حامل اہل قلم اپنی بساط کے مطابق احتجاج ریکارڈ کراتے رہے ہیں۔ جناب گل بختیاروی کے نظریات اور ان کی قلمی کاوشات سے ہر باخبر اور باذوق آدمی بخوبی آشنا ہے۔ ''تم کب تک بھٹو مارو گے'' جناب گل بختیاروی کی ایسی احتجاجی تخلیق ہے جس سے اختلاف کرنا کسی بھی ہوش مند انسان کے لیے ناممکن ہے۔

''زیر مطالعہ کتاب تم کب تک بھٹو مارو گے جناب گل بختیاروی کی اکیسویں تالیف ہے اس سے قبل بیشتر بختیاروی صاحب کی بیس کتابیں منصۂ شہود پر آ کر علمی' ادبی' سماجی اور سیاسی حلقوں میں خاطر خواہ پذیرائی حاصل کر چکی ہیں۔ گل بختیاروی محبت کرنے والے انسان' دوستوں کے دوست' یاروں کے یار' دشمنوں کے بھی خیر خواہ اور بے لوث ادبی کارکن ہیں۔ زیر نظر کتاب میں امریکہ' برطانیہ اور پاکستان میں مقیم مشہور و معروف ادباء' شعراء اور مفکرین کے مضامین اور منظومات شامل ہیں۔ حیرت ہوتی ہے کہ انھوں نے یہ سارا قیمتی ادبی سرمایہ نقد و نظر جو شہید ذوالفقار علی بھٹو اور دختر مشرق بے نظیر بھٹو شہید کو خراج عقیدت ہے کس طرح جمع کیا اور کتابی صورت میں دونوں شہید قائدین کے حضور پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں۔ ان کے اس ذوق شوق کو دیکھتے ہوئے یہی کہا جا سکتا ہے''۔ ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

۔سرور انبالوی۔

قیمت: دو صد روپے' دستیابی: گل محمد ساحر بختیاروی' حرم منگی سٹی۔ روڈ کھاریاں۔

منتخب افسانے ۲۰۰۷

سینئر افسانہ نگار اور عالمی اردو ادب کے مدیر جناب نند کشور وکرم ایک ایسے متحرک پسند تخلیق کار ہیں جن کی سرشت میں جدت پسندی اور جدت طرازی کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے۔ جس عمر میں لوگ بستر اور پلنگ کی زینت بنے کو ترجیح دیا کرتے ہیں جناب وکرم اس عمر میں بھی جوانوں سے زیادہ مصروف کار رہنا پسند کرتے ہیں۔ تخلیقی عمل کے ساتھ ''عالمی اردو ادب'' کی ادارت بجائے خود بڑا مشقت طلب کام ہے مگر وکرم صاحب اردو سے ہندی' ہندی سے اردو اور تخلیقی کام کے ساتھ ہر سال میں باقاعدگی سے گذرے سال کے منتخب افسانوں کا انتخاب شائع کر کے ایک جلد میں کئی جلدوں اور ایک کاوش میں بہت سی کاوشوں کو سمو کر سونے پر سہاگے کا کام کر دیتے ہیں۔ سال ۲۰۰۷ء کے منتخب افسانوں میں اس بار جناب نند کشور وکرم نے برصغیر کے نامور افسانہ نگاروں میں سے ۲۰ کا انتخاب کیا ہے جن کی فہرست درج ذیل ہے' ''بچھیوں نے کہا عافیت

ہے" (انور قمر) "ساحلوں کے اُس طرف" (ترنم ریاض) "آشرؤ" (جاوید اختر چوہدری) "سنتا کی گوری" (دیپک کنول) "ایک عام آدمی کا خواب" (رشید امجد) "موت کے لیے ایک اپیل" (ساجد رشید) "زندگی افسانہ نہیں" (سلام بن رزاق) "چوکیدار" (طاہر نقوی) "گنڈری کی وراثت" (فرخ صابری) "جنّی کا دھواں" (کرشن سنگھ) "منظور رفیاری ہوا" (نگار جاوید) "کھوج" (محمد سعید شیخ) "فیصلہ" (مشرف عالم ذوقی) "آتم پروچن" (نند کشور وکرم) "شہر حسرت" (نسیم احمد بشیر) "سن آف اے بیچ" (یٰسین احمد) اردو ادب کے قاری، ناقد اور شائق کے لیے کسی بھی ادبی صنف کا عمدہ انتخاب سوغات سے کم نہیں ہوتا اور جناب نند کشور وکرم کی یہ ادبی اور افسانوی سوغات ایک سو بیس ہندوستانی روپے کے عوض D-12-14-F، کرشن نگر دہلی 110051 بھارت سے دستیاب ہو سکتی ہے۔

بادبان ۱۲

کوئی بھی اچھی سے اچھی اور مفید سے مفید تر ایجاد اگر درست طریق پر اپنے ہدف تک نہ پہنچ پائے تو اس کی اہمیت و افادیت اُس قدر برقرار نہیں رہتی جس قدر اس کی ضرورت اور جواز ہوتا ہے۔ بلاشبہ اردو ادب میں قلمی کساد بازاری کے باوجود بہت سے علمی، ادبی اور شعری شہ پارے منصۂ شہود پر آ رہے ہیں مگر ان کی اپنے ہدف تک درست رسائی نہ ہونے کے سبب بہت سے مستحق لوگ اس سے اُس طرح استفادہ نہیں کر پاتے جس طرح اُس شہ پارے یا اُس کے طلب گار کا حق ہوتا ہے۔ جیسا آپ اور ہم بخوبی جانتے ہیں کہ جس مقدار میں ادب، تحقیق یا تحریر ہو رہا ہے اس کی گنجائش موجود ادبی جرائد میں سمانے کی کم کم ہے۔ جرائد کی کم ترین تعداد اور ذاتی پسند و ناپسند کے پیمانے معیاری تخلیق کو درست ہاتھوں تک پہنچنے کا سبب بن رہے ہیں۔ برصغیر میں اس وقت گنے چنے جو چند معیاری اور غیر جانبدار جریدے دیانتداری سے ادب کی ترویج کا فریضہ انجام دے رہے ہیں اُن میں سرفہرست جناب ناصر بغدادی کا "بادبان" ہے۔ "بادبان" اس قدر معیاری، ضخیم اور نمائندہ تخلیقات کا حامل جریدہ ہے کہ آپ اسے اردو کے علاوہ تیسری دنیا کی کسی بھی ترقی پذیر یا ترقی یافتہ زبان کے جرائد کی صف میں فخر کے ساتھ پیش کر سکتے ہیں۔ "بادبان ۱۲" اس بار چھ صد چھبیس صفحات پر محیط ہے جس میں ادب کی تمام اصناف اور انتہائی معتبر و مستند اہلِ قلم کی تخلیقات شاملِ اشاعت ہیں۔ اگر ہم تخلیقات اور تخلیق کار کے اسمائے گرامی درج کرنا بھی چاہیں تو نہیں کر سکتے کیونکہ اس شکل میں یہ تبصرہ ایک ضخیم مضمون کی شکل اختیار کر لے گا جس کے متحمل ذیل کے صفحات نہیں ہو سکتے۔ تمام مندرجات کی بابت کسی طرح کی حاشیہ آرائی بھی قاری کے ذہن پر اثر انداز ہونے کی کوشش کہی جا سکتی ہے۔ ہماری منشا اور مقصود آپ کی توجہ "بادبان ۱۲" کی جانب مبذول کرانا ہے سو ہم اپنی دانست میں اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہوئے اب یہ آپ کا فرض ہے کہ آپ کب اور کس طور اس علمی، ادبی اور شعری دبستان کو اپنی دسترس میں لا کر اپنے آپ اور اپنے گرد و پیش کو روشن و منور کرتے ہیں۔ "بادبان ۱۲" دو صد پچاس روپے کے عوض 14-8-2-E، میامر سکوائر بلاک ۱۲، گلشن اقبال، کراچی پر دستیاب ہے۔ فون نمبر: 021-4947230، ای میل: badbanurdu@yahoo.com

گوپی چند نارنگ

اگر آپ اردو زبان، ادب، شاعری، تنقید، تحقیق، تالیف، ترتیب غرض علوم و فنون کے کسی بھی شعبے سے متعلق مصروفِ کار ہیں تو آپ کو کسی نہ کسی موقع، مرحلے یا موڑ پر روشنی و راہنمائی کی طلب لازمی طور پر محسوس ہوگی۔ اس کڑے وقت میں آپ کی راہنمائی کا فریضہ نہایت احسن طریق پر اگر کوئی شخصیت انجام دے سکتی ہے تو وہ اردو ادب کی ہر دلعزیز بین الاقوامی شخصیت پروفیسر گوپی چند نارنگ کے سوا کوئی اور ہو ہی نہیں سکتی۔ فی زمانہ نارنگ صاحب سے بہتر علم و ادب کے راہنما کا انتخاب ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ سنگ میل پبلی کیشنز لاہور نے جناب نند کشور وکرم کی شبانہ روز کاوش "گوپی چند نارنگ شخصیت و فن" کتابی شکل میں شائع کر کے اس خلا کو پُر کر دیا ہے جو اس سے قبل علم کی تڑپ اور طلب رکھنے والے قارئین، محققین، ناقدین اور اساتذہ شدت سے محسوس کیا کرتے تھے۔ "گوپی چند نارنگ شخصیت و فن" میں پروفیسر صاحب کی شخصیت کی تمام جہات کا احاطہ اس طور کیا گیا ہے کہ جس میں جا بجا علم و ہنر کے خوبصورت موتی بآسانی تلاش کیے جا سکتے ہیں۔ مذکورہ کتاب پانچ سو پاکستانی روپوں کے عوض سنگ میل پبلی کیشنز لاہور سے طلب کی جا سکتی ہے۔

تزئین

ویسے تو اردو کے بڑے مراکز میں بھی صاحبِ علم لوگ معیاری جرائد کی قلت کے حوالے سے اکثر پریشان رہا کرتے ہیں مگر دور دراز کے علاقوں کے ادیب اور شاعر تو اس خوف سے ہی دل و دماغ میں اٹھنے والے خیالات کو قرطاس پر منتقل نہیں کرتے کہ وجود میں آنے والی تخلیق کا اشاعت کے حوالے سے کوئی مستقبل ہوگا بھی کہ نہیں۔ جناب اے غفار پاشا، جناب وحید اختر قریشی، سید تحسین گیلانی، جناب توقیر تقی، جناب شاہد رضا، جناب مقبول زیدی، جناب شہزاد شاکر، جناب شبیر ناز، جناب علی عامر، جناب سفیان شاکر اور جناب عادل شہزاد دیوانوں کا ایسا جتھا ہے جو صحرا میں پھول کھلانے کی آرزو میں تمام بڑے ادبی مراکز سے دور پنجاب کے دور افتادہ اور نسبتاً چھوٹے شہر بورے والا سے "تزئین" جیسا دیدہ زیب اور دیدہ نظر جریدہ ترتیب دے رہے ہیں۔ "تزئین" کا تازہ شمارہ چار سو صفحات پر مشتمل ہے جس میں ادب کی تمام اصناف اور تمام مکاتبِ فکر کے معروف اہلِ قلم کی نمائندگی بھرپور انداز میں کی گئی ہے۔ گوشہ جواز جعفری اور گوشہ ایوب خاور اس شمارے کی اہم پیش کش قرار دی جا سکتی ہیں۔ قیمت: دو صد روپے۔ دستیابی B-E-255، بورے والا، پنجاب۔

کون تھا عیسےٰ؟

ستیہ پال آنند (یو۔ایس۔اے)

مجھ کو تو کچھ علم نہیں ہے ۔۔۔ کون تھا عیسےٰ؟
میں تو لکڑی کا اک ادنےٰ کاریگر ہوں
فوجی آمری ڈکٹیٹر شپ میں پسنے
اک نادار دیس کا باسی
میرا کام ہے مغرب کے ملکوں کی خاطر
کاٹ کاٹ کر لکڑی کی تصویریں گھڑنا
آج کل تو کرسمس کی آمد آمد ہے
ورکشاپ میں اپنے جیسے
دیگر کارکنوں کے ساتھ ہی
لکڑی کے تختوں کو کاٹ کے عیسےٰ کی شکلیں گھڑتا ہوں
کون تھا عیسےٰ؟ کون سے ملک کا باسی تھا وہ؟
کچھ تو علم ہے مجھ کو بچپن سے ہی، لیکن
(چرچ میں فادر نے کچھ ایسا بتلایا تھا)
اب تو سب کچھ بھول گیا ہوں!

تختہ بندی میں عیسےٰ کی
پتلی پتلی ٹانگیں
پاؤں میں کیلیں
گھٹنے ٹوٹے بکھرے سے
بھوکا، پچکا پیٹ ۔۔۔
ہر اک پسلی جیسے ابھری ابھری، سوکھی سوکھی
سولی کے دائیں بائیں دونوں تختوں پر
سیدھے ہاتھوں میں میخوں سے نیچے ٹپکے
سوکھے خون کے اک دو قطرے
جیسے خون کی گردش جسم میں رک سی گئی ہو
جھکی ہوئی گردن آگے کو
چہرے کے دائیں بائیں اک نور کا ہالہ

اور سر پر؟ اک تاج، نگر نکوں، کانٹوں کا!
ماہر فن ہوں
جب بھی یہ تصویر بناتا ہوں تو مجھ کو
یوں لگتا ہے
ساخت جسم ہو اٹھی ہے
عیسےٰ جیسے سچ مچ اپنے آخری دم تک آپہنچا ہے!

جانتا ہوں، یہ سب تصویریں، سارے کھلونے
باہر کے ملکوں کو برآمد ہوتے ہیں
دس ڈالر کی قیمت کی پرچی چپکا کر
میں اس نئے بنے عیسےٰ کو
اک ڈھیری میں رکھ دیتا ہوں
نصف مکمل اک مورت دوجی ڈھیری میں
ایک نئے عیسےٰ کی شکل میں بننے کو تیار کھڑی ہے
میرا کوٹا ایک روز میں دس عیسےٰ ہیں

میں تو اک نادار ملک میں بیس برس کی جیل کاٹتا
اک قیدی ہوں
کھانا، جوتے، وردی، اور سلاخوں کے پیچھے اک بستر

کے بدلے میں مجھ کو یہ سب کام دیا جاتا ہے
بیس برس کی جیل کاٹ کر نکلوں گا
(جیلر کہتا ہے)
تو پھر مجھ کو میری پکار کا جو تھا حصہ
مل جائے گا

کہتے ہیں عیسےٰ تو خدا کا ہی بیٹا تھا
اور اس نے تو
اپنے آپ ہی
سولی پر چڑھنے کی کلفت کو برداشت کیا تھا
ان لوگوں کی خاطر
جو تائب تھے اپنے گناہوں پر

اور بخشش کی خاطر اس پر
ایماں وارادت سے لائے تھے

کوئی مجھے بتلائے، کیا میں
عیسےٰ کے چوبی بُت گھڑتے گھڑتے
اس پر اپنا واثق وراسخ، پختہ یقین رکھتے رکھتے
بیس برس کی لمبی قید میں جیتے مرتے
اپنے سب نا کردہ گناہوں
سے چھٹکارا پا سکتا ہوں؟

آمد

شکوک وشبہات نے مقفل کیے تھے سب در
مگر نجی کا دبیز کمرہ
جو گیلی ٹھنڈک لیے ہوئے تھا
دراڑوں، درزوں سے رینگ کر
چاروں سمت پھیلا
'ہراس' سب کھڑکیوں سے سٹ کر کھڑا ہوا تھا
جو آنکھ چرائی کھو چکی تھی
دروں، دریچوں کو بند کر کے
دبیز کمرے کو روکنے کی سعی میں ناکام جب ہوئی تو
نڈھال ہو کر وہیں کہیں ڈھیر ہو گئی۔۔۔اور
گھر کے تاریک بند ماحول میں
'ہزیمت' نے خوف کی اوڑھنی سے چہرہ چھپالیا
تو۔۔۔(لگا نہیں جیسے)
نور کی اک کرن سی در آئی
آنکھیں کھولیں تو سب نے دیکھا
کہ در دریچے تو وا نہیں تھے
مگر ''وہ'' ان کے قریب آ کر کھڑے ہوئے تھے

ضیافت

میں جانتا ہوں کہ عہدِ موسےٰ میں
اس کی ''موجودگی کی روٹی''
طلائی، زربافِ طشتری میں
فقط تمہارے لیے
(یا تم جیسے دوسروں کے لیے)
ہی رکھی گئی تھی شاید
عظیم تھا۔۔۔پُرشکوہ وقتِ جلال تھا وہ
عجیب کسبِ کمال تھا وہ
کہ اک کیلے

فرشتہ خلعت ضعیف انساں نے
جو مقدس، عظیم رتبے کا اہل تھا
اپنے ہاتھ سے اس پہ پانی چھڑکا تھا۔۔۔ڈرتے ڈرتے
کہ یہ عمل اس کڑی حقیقت کا زائیدہ تھا
کہ قحط کا ایک سال بیتنے کی
سارے لوگوں کو بد دعا تھی
کہ لوگ روٹی کی دید کو بھی ترس گئے تھے

میں جب بھی روٹی کے اک نوالے کو توڑتا ہوں
تو سوچتا ہوں
کہ ہم جو اس وقت قحط کی بھوک سہہ رہے تھے
کہ ہم جو اب دعوتوں میں شرکت کے کاہل
روٹی کو دونوں ہاتھوں سے توڑتے ہیں

اکٹھے بیٹھے ہوئے
ضیافت کا لطف اُٹھاتے ہیں سارے مل کر
یہ جانتے ہیں، کہ ہم تمہارا ہی ایک حصہ ہیں
تم ہماری رگوں میں خوں بن کے بہہ رہے ہو
تم آلِ آدم کے ہر نِس و نَو میں
ریشہ ہائے بدن میں، نس نس میں بس رہے ہو
کہ ہم تمہارے ہی ہاتھ ہیں، انگلیاں ہیں
پاؤں ہیں۔۔۔قلب شفقت میں ہم تمہارے ہیں!
آؤ ہم کو
اٹھاؤ ہاتھوں میں
انگلیوں سے کروڑوں بیجوں میں بانٹ کر

اس زمیں کے سارے
سمندروں، وادیوں، پہاڑوں میں
سرسراتی ہوا کی جھولی میں ڈال دو
تا کہ ہم کو بکھرائے کونے کونے میں ساری دنیا کے
ہم جو خود کاشت اپنی گندم کے بیج ہیں
جس جگہ اُگیں گے
وہاں کبھی قحط کی بلا کو نہ آنے دیں گے!

ڈر

پیار کریں اور اس سے واپس پیار ملے
یہ تو اچھا ہے
لیکن خدشہ یہ بھی ہے، ہم پیار کریں
اور اس پیار کے بدلے میں ہم
صرف تغافل پائیں!

تو کیا ہم نے ایک خزانہ مفت میں کھویا؟
تو کیا ہم نے دل کی دولت
اک کم ظرف کے ہاتھ پہ بیعت کر کے رکھ دی؟
یہ ڈر روح کو کھا جاتا ہے

اور شاید یہ بات ٹھیک ہو
لیکن ایسا بھی تو آخر ہو سکتا ہے
پیار کریں اور واپس تم سے پیار ملے
میں میں تو ہوں، تم تم تو ہو، دو فرد اکیلے
یہ جھگڑا مٹ جائے، تو پھر

اپنے گھل مل جائیں، جیسے "ایک" شخص ہیں!
یہ ہو جائے تو وہ ڈر جو روح کو بالکل کھا جاتا ہے
مٹ جائے گا!

STIGMATA

صلیب پر جڑی ہوئی
ہتھیلیوں سے قطرہ قطرہ سارا خوں ٹپک گیا
لہو چشیدہ کیل
اپنے آہنی لبوں کو چاٹ چاٹ کر
خوشی سے جیسے زنگ رنگ ہو گئے
جو کیل دونوں پاؤں میں
جڑے ہوئے تھے دور تک
وہ زخم کے دہانے میں ہی کھو گئے
بدن کے سانچے رگوں میں
خوں کے سست رو سفر سے مضمحل ہوئے
تو جیسے گہری نیند میں کھڑے کھڑے ہی سو گئے
لہو کی دھار
بوند بوند خاک پر ٹپک چکی
تو تھک گئی
سیاہ، کچھ سپید
کھچڑی سے بال
خاک و خوں سے ماتھے پر
چپک گئے
لبوں پہ پپڑیاں جمیں
تو پھوٹنے لہو کا رنگ
ریش کو بھی زنگ رنگ کر گیا!

یہ کون شخص ہے کہ جس کی روح میں

شہادتوں کی خوش نصیبیاں بھری گئی ہیں یوں
کہ جاودانیوں کے جاں گسل عذاب
کو بھی نازشِ گل سمجھ کے سو گیا ہے سولی پر چڑھا ہوا؟

یہ عام آدمی ہے اک مری طرح
جسے یہ جانکنی کا ارتسام آیت و حدیث کی طرح
دیا گیا ہے تاکہ بالیقیں، مطلق الوثوق
ظاہری ثبوت ہو
نظیر ہو
دلیل ہو
مسیح کی ادائگی فرض کی!

عیسیٰ مسیح کی مصلوبیت کو ایک علامت کے طور پر عالمی ادب میں لاکھوں بار استعمال کیا گیا ہے۔ گذشتہ کئی صدیوں میں مختلف ملکوں میں ایسے واقعات ظہور پذیر ہوئے ہیں جن کی چشم دید شہادتیں اور حالیہ برسوں میں ویڈیو ٹیپ پر ریکارڈ کیے ہوئے مناظر موجود ہیں۔ ان واقعات میں کسی ایک شخص کے ہاتھوں اور پاؤں میں جڑی ہوئی کیلوں کے زخم کرسمس کے دنوں میں خود بخود نمودار ہو جاتے ہیں۔ ان سے خون بہنے لگتا ہے اور صلیب پر جانکنی کے وہ جملہ عذاب جو عیسیٰ مسیح نے برداشت کیے تھے، یہ شخص سہتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ راقم الحروف نے یہ ویڈیو کئی برس پہلے انگلستان میں سفر کے دوران میں ایک گرجا گھر میں ٹیلی ویژن پر دیکھا۔ اس مظہر کو انگریزی زبان میں stigmata کہا جاتا ہے۔

(ستیہ پال آنند)

لطیف کاشمیری کی یاد میں

منشا یاد (اسلام آباد)

لطیف کاشمیری سے میری دوستی پچاس برسوں پر محیط تھی۔ میں نے دارالحکومت کے ترقیاتی ادارے اسلام آباد میں آنے سے پہلے کچھ عرصہ پی ڈبلیو ڈی کی عالیات میں بھی ملازمت کی تھی پھر میری پوسٹنگ مری میں ہوگئی۔ نوکری میں ہر کسی کو بلندی پر جانے کا بہت شوق اور خوشی ہوتی ہے مجھے بھی تھی۔ لیکن میں راولپنڈی کے ادبی حلقوں اور دوستوں سے بچھڑنے پر اداس بھی تھا۔ لطیف کاشمیری سے میرا بطور افسانہ نگار غائبانہ تعارف پہلے سے تھا۔ ہماری نگارشات ایک ساتھ ماہنامہ عکس نو، لاہور اور تعمیر اخبار راولپنڈی کے ادبی ایڈیشنز میں چھپتی تھیں۔ مری پہنچ کر ان سے ملاقات ہوئی تو وہ اتنی محبت اور گرم جوشی سے ملے کہ اجنبیت اور پنڈی کے ادبی دوستوں سے جدائی کا سارا ملال جاتا رہا۔ میری ان سے جلد ہی گہری دوستی ہوگئی۔ وہ مری لٹریری سرکل کے روح رواں تھے۔ ایک سیدھے، سچے اور محبت کرنے والے آدمی تھے۔ میں نے انہیں ہمیشہ مخلص، شریف اور حلیم پایا۔ یہ میری افسانہ نگاری کا ابتدائی زمانہ تھا مگر میں راولپنڈی میں حلقہ ادب کا جوائنٹ سیکرٹری اور ہفت روزہ ہمدرد کا مدیر معاون رہ چکا تھا۔ انہوں نے مجھے مری کے ادیب دوستوں پروفیسر کرم حیدری، سلیم شوالوی، نسیم شائق پوری اور دلمان فاروقی سے ملایا۔ بہت سے سیاح ادیبوں سے متعارف کرایا۔ میاں ایم اسلم، مولانا رشید اختر ندوی، میرزا ادیب، رشید سلیم سیکسی، ڈاکٹر محمد باقر، ہمایوں والے میاں بشیر، مصطفیٰ زیدی اور بہت سے دوسرے ادیبوں سے انہی کی وساطت سے ملاقاتیں رہیں۔ میں پہلے لوئر بازار اور پھر نیو چارلی والا پنڈی پوائنٹ میں مقیم رہا۔ ہم نے مل کر افسانے کی شامیں اور شعر وسخن کی محفلیں سجائیں۔ فارغ اوقات میں ہم زیادہ تر اکٹھے رہتے۔ کتابوں، افسانوں اور ادبی وعلمی موضوعات پر تبادلہ خیالات کرتے اور اپنی نئی تخلیقات ایک دوسرے کو سناتے۔

میرے اور لطیف کاشمیری میں کئی چیزیں مشترک رکھی تھیں۔ کہانی لکھنا، ادبی محافل اور کتابیں پڑھنا، ادبی محفلوں میں جوش وخروش سے حصہ لینا اور لنڈورے ہونے کے باوجود مری کی زندہ اور جیتی جاگتی خوبصورتیوں کی بجائے قدرتی اور خیالی خوبصورتیوں پر قناعت کرنا۔ شام کو مال روڈ پر گھومنے کی بجائے ہم دونوں لائبریری یا گھر میں کتابوں، افسانوں اور علمی ادبی بحثوں میں الجھے رہتے۔

سال ڈیڑھ بعد میں واپس راولپنڈی چلا گیا اور دارالحکومت کا ترقیاتی ادارہ جوائن کرلیا لیکن مری کے قیام کے بعد بھی میرا لطیف کاشمیری سے مسلسل رابطہ رہا۔ وہ ہر سال شام افسانہ یا کوئی ادبی تقریب منعقد کرتے اور ممتاز مفتی، ضمیر جعفری، احمد شریف، اختر جمال، رشید امجد، اکبر حمیدی، رخسانہ صولت اور ڈاکٹر انور زاہدی اور میں ان محفلوں میں شرکت کے لیے جاتے۔ پھر سی ڈی اے سے انہیں راول ٹاؤن میں رہائشی پلاٹ ملا اور انہوں نے مکان کی تعمیر شروع کردی تو ان سے تواتر سے ملاقاتیں ہونے لگیں۔ وہ معاشرتی آداب اور رسوم کا لحاظ رکھنے والے وضع دار اور بامروت آدمی تھے۔ ہمیشہ عید کے دوسرے روز ملنے آتے۔ منع کرنے کے باوجود کبھی خالی ہاتھ نہ آتے۔ میرے پوتے پوتیاں انہیں اس حوالے سے بھی پہچانتے اور یاد کرتے ہیں کہ وہ انکل جو عید کے دوسرے روز مٹھائی یا کیک لے کر آتے تھے۔ ہم پہروں بیٹھے ایک دوسرے سے مختلف ادبی، علمی، معاشرتی اور گھریلو معاملات و مسائل پر باتیں کرتے رہتے۔

لطیف کاشمیری بنیادی طور پر افسانہ نگار تھے اور میرے ہم ذوق اور ہم خیال۔ ان کے افسانوں کی اہم ترین خصوصیت ان کا فکری اور نظریاتی حوالہ ہے۔ وہ افسانہ اس لیے نہیں لکھتے تھے کہ زبان وبیان اور انشا پردازی کے کرتب دکھائیں۔ انہوں نے اس لیے کہانیاں لکھیں کہ وہ ان کہانیوں کے ذریعے زندگی، ماحول اور معاشرے کو خوبصورت اور بہتر بنانا چاہتے تھے۔ جابرانہ حکومتوں کی خرابیوں اور طبقاتی سماج کی ساری خامیوں پر ان کی نظر تھی۔ ان کی تحریروں میں غربت وافلاس، منافقت، زرپرستی، تشدد اور جبر واستحصال کے خلاف سخت ردعمل ملتا ہے۔ ان کی کہانیوں کے کردار عموماً معاشرے کی نچلی سطح کے گرے پڑے لوگ ہیں جنہیں وہ اوپر اٹھانا اور سربلند دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ ان کرداروں کی وساطت سے اس طبقے کی محرومیوں، خواہشوں اور حسرتوں کی عکاسی کرتے۔ ان کی کہانیوں میں سچائی، خلوص اور فکری گہرائی ہے۔ انہوں نے بے تکی تجریدیت اور اینٹی سٹوری طرز اظہار سے دانستہ گریز کیا۔ اس سلسلے میں بھی وہ میرے ہم خیال اور افسانے میں کہانی پن پر یقین رکھتے تھے۔ انہوں نے حقیقت وروایت اور روایت وجدت کے حسین امتزاج سے ایک منفرد اور موثر اسلوب اختیار کیا۔ علامت کے دانش مندانہ اور خوبصورت استعمال نے ان کی کہانیوں کو تہہ دار اور وقیع بنایا، جس کی ایک عمدہ مثال ان کا افسانہ جونکیں ہے۔ لیکن ان کا سب سے بڑا کمال کردار نگاری ہے۔ ماما پیر، بابا حسنا اور کل جو جیسے ان کے کردار ناقابل فراموش ہیں جو اپنے ساتھ انہیں بھی ادب میں زندہ رکھیں گے۔ ان کا افسانہ کل جو بہت سی دوسری زبانوں میں ترجمہ ہو چکا اور عالمی سطح پر سراہا گیا ہے۔ یہ افسانہ فیض احمد فیض کی ادارت میں نکلنے والے عالمی جریدے لوٹس، بیروت میں شائع ہوا تھا۔

افسانہ نگاری کے علاوہ لطیف کاشمیری ایک بہت اچھے ادیب اور روشن خیال دانشور تھے۔ انہوں نے بہت سی نثری اصناف میں لکھا۔ ناول،

تاریخ، خاکے، تراجم، سوانح اور مضامین و مقالات وغیرہ۔ "زعفران کے پھول" لطیف کاشمیری کے اقوال و افکار کا مجموعہ ہے۔ یہ خوبصورت نثری ٹکڑے جنہیں نثری نظمیں بھی کہا جا سکتا ہے نہایت خیال انگیز ہیں۔ یہ دراصل لطیف کی خود کلامیاں ہیں۔ وہ بظاہر خاموش اور پرسکون دکھائی دیتے تھے مگر "زعفران کے پھول" پڑھ کر اندازہ ہوا کہ وہ ہر وقت اپنے اندر مصروف رہ کر سرگوشیاں کرتے رہتے تھے۔ وہ تنہائی پسند اور کم گو تھے۔ پررونق ادبی اجتماعات اور سال دوڑ کے ہجوم میں بھی تنہا ہوتے اور ان کے اندر تخلیق کی آگ سی سلگتی رہتی جو ان کے باطن کو منزہ اور منور اور ماحول کو خوشبودار بنائے رکھتی۔ ان خوبصورت نثری ٹکڑوں کو پڑھ کر مجھے تو ایسا لگا جیسے یہ سب ان بہت سی کہانیوں کے مرکزی خیال اور محور ہوں جو وہ ہو جوہ نہ لکھ سکے۔

ان کی ایک اور اہم کتاب "خیابانِ مری" ہے۔ یہ کتاب ۱۹۷۱ء میں شائع ہوئی تھی اور سال دو سال پہلے اس کا نیا اور اپ ٹو ڈیٹ ایڈیشن شائع ہوا تھا۔ جس کی شاندار تعارفی تقریب اسلام آباد میں ہوئی تھی۔ یہ تاریخ کی کتاب ہے اور معلومات کا مجموعہ مگر یہ ایک ادیب کے قلم سے لکھی گئی ہے اس لیے اس میں تخلیقی ادب کی بہت سی خوبیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ میں نے یہ کتاب پہلے بھی پڑھی تھی مگر نیا ایڈیشن کھول کر دیکھنے لگا تو اس کے دلچسپ اور ریڈ ایبل ہونے کی وجہ سے دوبارہ ساری کتاب پڑھ ڈالی۔ یہ محض ایک مستند تاریخ اور معلوماتی کتاب ہی نہیں بلکہ یہ تاریخی، معاشرتی، تہذیبی اور ادبی حوالے سے بھی مری کا ایک مستند اور جامع حوالہ ہے۔ اس کے استناد کی گواہی مولانا رشید اختر ندوی جیسے محقق اور تاریخ دان نے بھی اپنے دیباچے میں دی تھی جو مری کو اپنا ثانوی وطن کہتے تھے اور وہیں گرمیاں گزارتے اور اپنا تصنیفی اور تالیفی کام سرانجام دیتے تھے۔

لطیف کاشمیری میرے بہت پیارے دوست اور با اصول آدمی تھے۔ وہ جب بھی آتے پہلے سے ٹیلی فون کر کے ملاقات کا وقت طے کر لیتے جس سے ہم دونوں کو آسانی رہتی۔ ہم پہروں بیٹھے ایک دوسرے سے دکھ سکھ شیئر کرتے رہتے۔ ہمارے درمیان کوئی پردہ اور تکلف نہ تھا۔ اہم گھریلو مسائل اور ذاتی معاملات میں بھی ایک دوسرے سے مشورے کرتے۔ لائبریرین کی حیثیت سے لوگوں کو کتابیں پڑھوانا ان کا پیشہ بھی تھا اور شوق بھی۔ لیکن وہ احباب میں علم تقسیم بھی کرتے۔ جب بھی میرے ذوق اور دلچسپی کی کوئی نئی کتاب یا مضمون پڑھتے، وہ کتاب یا مضمون مجھے بھی ضرور پڑھواتے یا ممکن ہوتا تو اس کی فوٹو سٹیٹ نقل ڈاک کے ذریعے بھیج دیتے۔ گزشتہ برس لندن سے ہو کر آئے تو وہاں کے معاشرتی حالات، رویوں اور انتظامی امور دیکھ کر خاصے امپریسڈ تھے۔ کئی ملاقاتوں میں اس موضوع پر بات چیت اور خیالات کرتے رہے۔ دوستوں کو اپنے تاثرات سے آگاہ کرنے کے لیے اسلام آباد والے گھر میں کھانے کی دعوت بھی دی۔ پھر وہ بیمار پڑ گئے مگر علالت کے باوجود ملنے

اور مشورہ کرنے آتے رہے۔ میں نے ہی انہیں ڈاکٹر انور زاہدی سے طبی مشورہ لینے کا مشورہ دیا تھا جو آخری دم تک ان کی خبر گیری کرتے رہے۔ ایک روز میرے ہاں آئے تو خاصے پریشان تھے۔ کہنے لگے میں راولپنڈی سے ہو کر آ رہا ہوں۔ آپ کسی وقت لطیف صاحب سے مل لیجیے ایسا نہ ہو کہ دیر ہو جائے۔ میں ان کی بات سن کر لرز گیا۔ جا کر دیکھا تو وہ بہت کمزور ہو چکے تھے۔ کینسر پھیل چکا تھا۔ انہیں بولنے میں مشکل پیش آ رہی تھی۔ انہوں نے جو چند الفاظ کہے وہ بھی پوری طرح سمجھ میں نہ آئے۔ ہم دونوں جانتے تھے کہ یہ ہماری آخری ملاقات ہے۔ میں بڑی دیر تک ان کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر بیٹھا ان سے خاموش گفتگو کرتا رہا۔ پل بھر میں زندگی کی بہت سی پرانی سہانی گھڑیاں نظروں میں گھوم گئیں۔ وہ دیر تک مجھے دیکھتے رہے اور میں ان کو۔ اپنی اور انسانی بے بسی کے شدید احساس کے ساتھ میں ان سے رخصت ہوا۔ گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے آنکھوں کے سامنے آنسوؤں کی دھند سی چھا گئی۔ میرے عزیز دوست کاش میں تمہارے لیے کچھ کر سکتا۔ تیسرے روز ان کے بیٹے کا فون آیا تو ان کے انتقال کی جانکاہ خبر سننے سے پہلے ہی دل بجھ گیا۔ بے شک موت برحق ہے۔ اسلام کا۔

مری اور لطیف کاشمیری لازم و ملزوم تھے اور میں نے اس شہر اور اقبال لائبریری کا ان کے بغیر کبھی تصور تک نہ کیا تھا مگر آج زندگی میں پہلی بار ایسا ہوا ہے کہ میں لائبریری میں داخل ہوا ہوں تو لطیف کاشمیری کی مسکراہٹ کی بجائے میز پر رکھی ان کی خاموش تصویر نے میرا استقبال کیا۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ لطیف کاشمیری اپنی دلکش شخصیت کی وجہ سے دوستوں کے دلوں اور اپنی بیش قیمت تحریروں کے سبب دنیائے ادب میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ انشاء اللہ۔

(مری لٹریری سرکل کے زیر اہتمام ۱۲/۱۹ اکتوبر ۹۸ء کو لطیف کاشمیری کے تعزیتی ریفرنس کا خطاب)

☆

○

ایک دفعہ کا ذکر ہے ساحر لدھیانوی بمبئی سے دہلی آئے تھے میں نے چائے منگوائی ساتھ ہی کھانے کے لیے کوئی نمکین چیز بھی آ گئی۔ ساحر کو خالی چائے پیتے دیکھ کر میں نے نمکین کھانے کا اشارہ کیا تو ساحر بولا "یہ تم کھاؤ کیونکہ تم سردار پٹیل کی وزارت کے ملازم ہو۔ میں سردار پٹیل کا نمک خوار بنا نہیں چاہتا۔"

(جگن ناتھ آزاد)

رس رابطے

جمع و ترتیب و تدوین

وقار جاوید

برادر عزیز گلزار جاوید، سلام محبت

"چہارسو" کے نومبر دسمبر ۲۰۰۸ کے شمارے کی جلدوں کا پیکٹ ملا۔ میں نے اپنے حصے کی جلدیں محفوظ کر لی ہیں۔ باقی جلدیں متعلقہ دوستوں کو ڈاک سے روانہ کر دی ہیں۔ آپ کی توجہ اور عنایت کے لیے ممنون ہوں۔ یہ تازہ ترین شمارہ میرے اس سال رواں کے آخری دنوں میں پہنچا ہے۔ آج یعنی ۳۱ دسمبر ۲۰۰۸ء کی نصف شب کے بعد نئے سال کا آغاز ہو جائے گا۔ اس اعتبار سے چہارسو کا تازہ شمارہ میرے لیے سال نو کے پیشگی تحفے کے طور پر پہنچا ہے یہ خوبصورت تحفہ میرے لیے باعث مسرت ہے۔ "چہارسو" آپ کی اعلیٰ مدیرانہ صلاحیتوں کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ آپ نے انھیں صلاحیتوں اور اپنی عملی کارکردگی کے طفیل "چہارسو" کو اشاعتی باقاعدگی اور معیار و مرتبہ کا وقار عطا کیا ہے۔ میں عام طور پر نجی معاملات کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے فوری طور پر سرگرم عمل نہیں ہوتا۔ یہ آپ کی متواتر کوششوں کا نتیجہ تھا کہ میں بالآخر "نیند" کے حصار سے باہر نکل آیا اور سرگرم عمل ہو گیا۔ آپ نے میرے ساتھ منسوب "چہارسو" کا ایسا بھرپور گوشہ شائع کیا ہے جو نہ صرف نظم و نثر کی میری نمائندہ تحریریں پیش کرتا ہے بلکہ ان کے بارے میں عالی مقام ناقدین کی گراں قدر آرا کو شامل پیش کش کرتا ہے۔ انٹرویو کے لیے آپ کا تیار کیا ہوا سوالنامہ نہ صرف سخت تھا بلکہ کسی حد تک مجھے PROVOKE کرنے کے مقصد سے تیار کیا گیا تھا۔ میں پاس ہوا یا فیل ہوا اس کا فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے یا پھر قارئین کے ہاتھ میں۔ میں نے بہرحال اپنی حد تک مناسب اور صحیح جواب دینے کی کوشش کی ہے۔

بلراج کومل (دہلی بھارت)

بہت ہی اچھے گلزار جاوید: تسلیمات

"چہارسو" کا نیا شمارہ کل موصول ہوا۔ بلراج کومل پر گوشہ دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ ٹائٹل پر بلراج کے چہرے کے قلم کش اسکیچ کو دیکھ کر یہ معلوم نہیں ہوتا کہ یہ واقعی پنسل اسکیچ ہے یا ایک فوٹوگراف ہے۔ باقی کی تصویریں بھی ان کو اپنے پریوار کے علاوہ احباب کے ساتھ پیش کرتی ہیں۔ مجھے یقین تو نہیں، لیکن شاید اوپر والی رو میں بائیں ہاتھ کی پہلی تصویر میں بیٹھے ہوئے میرا چہرہ بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی اور صاحب ہوں جن پر مجھے خود کا گمان گزر رہا ہو۔

آپ نے واقعی اپنے حسن انتخاب کا ثبوت بلراج کی منتخبہ نظموں میں دیا ہے۔ اگر ان کا سنہ تصنیف درج ہو جاتا تو ان کے ساٹھ برسوں کے تخلیقی کام میں کیا کیا تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں اس کا بھی کچھ پتہ چل جاتا۔ لیکن اسلوب کی سطح پر اضافتوں اور ترکیبوں کے استعمال کے باوجود "کومل" جو ان کے فن کا خاص وصف ہے ان ساٹھ برسوں میں شروع سے آج تک ان کے ساتھ رہی ہے۔ متنوع موضوعات کا انتخاب ہمیشہ سے ان کا خاص چلن رہا ہے اور وہ گھسے پٹے رومانی یا so-called انقلابی موضوعات سے پرہیز کرتے ہیں۔ نئی نظموں میں وہ کیا رہتے مجھے ایسے بھی لگا، کہ وہ fable اور parable کے چوکھٹے میں کسی عصری سچائی کو رکھ کر دیومالائی حوالے سے بھی پیش کرنے میں اپنے ہم عصر شعراء سے آگے نکل گئے ہیں۔ اس گوشے میں شمولہ "پاپا ایک کتاب"، "اداکار"، "کھلتا پھول"، "کاغذ کی ناؤ"، "ڈارک سٹور"، "بھان متی کا کنبہ" اس وصف کے غماز ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا کے مضمون میں یہ جملہ بے حد حق بجانب ہے "بلراج کومل کی نظموں کا مطالعہ کرتے وقت مجھے یہی احساس ہوا کہ اس شاعر نے سوچ کے عنصر کو جگہ دے کر اور ایک خاص سمت میں متحرک ہو کر وقت کے ذہنی و جذباتی تحرک سے اپنی نظموں کو آشنا کر دیا ہے" ـــــ مجھے وہ دن اچھی طرح یاد ہیں جب شام کے وقت کناٹ پلیس کے کافی ہاؤس سے اٹھ کر فکر تونسوی (ملاپ) اور مخمور جالندھری (روزانہ) اور دیگر کچھ دوست چندہ کر کے یا کسی نئے آئے ہوئے شاعر یا افسانہ نگار "کبوتر" (یہ اصطلاح مخمور جالندھری کی ہے) کی جیب سے روپے نکلوا کر وہسکی کی بوتل کا انتظام کیا کرتے تھے اور اگر بیٹھ کر پینے کے لیے کوئی اور جگہ نہ ہو تو بلونت سنگھ (مرحوم) کا گھر کناٹ پلیس کی ہی ایک سروس لین (پیچھے کی تنگ گلی) میں تھا اور بلونت گھر میں ہو یا نہ ہو، اس کے نوکر کو ہدایت تھی کہ وہ اس کے دوستوں کی خاطر تواضع کرے۔ ترقی پسند احباب میں شاید سب سے زیادہ مخلص اور ذاتی اسکیچ فکر تونسوی نے ہی لکھے تھے (میں خود بھی ایک اسکیچ کا موضوع تھا)۔ بلراج کا اسکیچ فکر نے اپنے مخصوص انداز میں بڑی محبت سے لکھا ہے۔ کیا خوبصورت جملہ ہے "ہاں، وہ الگ ہی چھوٹی چھوٹی ننھی خوشیوں کے لیے زندہ رہا ہے۔ ایک چھوٹی سی محفل، ایک چھوٹا سا گھر، ایک چھوٹا سا کنبہ، چھوٹا سا جھگڑا، چھوٹی سی ملامت، سب چھوٹی چھوٹی چیزیں ہیں اس کی زندگی کو بڑی بڑی وسعتیں دے رہی ہیں" ـــ ایک شاعر کی یہ بدقسمتی سمجھئے کہ اگر وہ فکشن نگار بھی ہے تو اس کی طرف کم توجہ دی جائے گی۔ احمد ندیم قاسمی اس کی ایک مثال ہیں۔ میں خود بھی اس بے توجہی کا مارا ہوا ہوں، ورنہ میں نے بھی ساٹھ سے کچھ اوپر افسانے لکھے ہیں چار ناول تصنیف کیے ہیں لیکن شاعری دیگر اصناف ادب کو (خاص طور پر اردو میں) یہ مرتبہ تسلیم نہیں کرنے دیتی۔ بلراج کے افسانوں پر محترم شمس الرحمن فاروقی کا مضمون پڑھ کر خوشی ہوئی۔ شمیم حنفی صاحب کا مضمون اس حصے کے کل میں مدد دیتا ہے کہ بقول ان کے "یہ الجھن اور گریہ سوالوں کا طویل نہ ختم ہونے والا سلسلہ کومل کو اس نیم فلسفیانہ اضمحلال سے ہم کنار کرتا ہے جو ان کے حواس کی اصلیت اور سرگرمی کا سبب ہے۔ تصویریں اور مناظر جا بجا خارج کی سطح پر ابھریں یا شاعر کے باطن کی بساط پر، اپنی

پیچیدگی اور نا تمامی کے سبب ایسے دھندلے اور اسرار آمیز دکھائی دیتے ہیں کہ کومل کی شاعری میں ایک ازلی معمے کی مثال بن گئے ہیں۔ کومل کی بصیرت ان میں ربط کا سرا ڈھونڈ رہی ہے“ میرے خیال میں بنیادی طور پر یہ اس پیچیدہ سوال کا ہی ایک پہلو ہے کہ صراحت اور علامت میں کہاں تک ناپ تول صحیح ہے۔ ”یہ دروں، یہ بروں یا صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں“ کے قبیل کی شاعری کیا اس شاعری سے کم ”جدید“ ہے جو نظم کو ایک jig saw puzzle بنا کر پیش کرتی ہے؟ کومل شاعر ہونے کے علاوہ ایک اچھے تجزیہ نگار بھی ہیں۔ میرے دو شعری مجموعوں کے پیش لفظ ان کے تحریر کردہ ہیں اور میں نے ان کی تخلیقی قوت کی کارکردگی کے علاوہ ناقدانہ بلیغ کو بھی قریب سے دیکھا ہے۔ ابھی بلراج کے قلم سے ہمیں بہت کچھ ملنا ہے۔ خدا کرے وہ اسی طرح فعال رہیں۔

ستیہ پال آنند (امریکہ)

گلزار جاوید صاحب السلام علیکم!

۲۵ دسمبر کو میں کراچی گیا تھا جہاں دس پندرہ دن میں نے قیام کیا۔ اس کے بعد لاہور چلا گیا اور چھ سات دن وہاں سیمیناروں میں مصروف رہا۔ آپ نے میرے حال پر جو کرم فرمایا کہ ”چہارسو“ کا گوشۂ خلیق انجم شائع کیا تھا، اس کا ذکر بہت سے ادیبوں اور شاعروں کی زبان پر تھا۔ اکثر لوگوں نے اس گوشے کی بہت تعریف کی۔ لوگ تعریف کرتے تھے اور میں دل ہی دل میں آپ کا شکریہ ادا کرتا تھا۔ میں نے ”چہارسو“ کا یہ خاص شمارہ کینیڈا میں اپنی دو بہنوں اور بیٹے کو بھیجا تھا۔ سب ہی نے اس شمارے کی غیر معمولی تعریف کی۔ گلزار صاحب! مجھ میں نہیں آتا کہ آپ کا کن الفاظ میں شکریہ ادا کروں۔ میرے بس میں یہ ہے کہ دعا کروں کہ خدا آپ کو خوش و خرم، تندرست اور سلامت رکھے (آمین)۔ آج ہی ”چہارسو“ کا شمارہ موصول ہوا ہے اور میں بڑے انہماک سے پڑھ رہا ہوں۔ شمیم حنفی صاحب کا مقالہ ”امراؤ میں لپٹے ہوئے چہرے“ پڑھ رہا ہوں۔ ابھی دو صفحے پڑھے ہیں۔ بہت دلچسپ ہے۔ شمیم حنفی صاحب کا شمار اردو کے ممتاز نقادوں، ادیبوں اور خاکہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ میں ان کا غیر معمولی طور پر مداح ہوں۔ کسی رسالے میں اگر ان کی تحریر شائع ہوتی ہے تو پہلے وہ تحریر پڑھتا ہوں، اس لیے ماہنامہ ”چہارسو“ کا مطالعہ انہیں کے مضمون سے شروع کیا ہے۔ خدا آپ کو سلامت رکھے۔

خلیق انجم (دلی بھارت)

محترم گلزار صاحب!

تازہ چہارسو میں دیگر شمولات کے ہمراہ آپ کا افسانہ ”یوسف بے کارواں“ پڑھا۔ اب مجھے آپ کے اسلوب اور آپ کے افسانوں میں مرکزی خیال اور قدر مشترک کا پورا پورا احساس ہو گیا۔ آپ بہت سے دوسرے حساس فنکاروں اور دردمند لوگوں کی طرح زندگی کی ناانصافیوں، انسانی قدروں کی پامالیوں، ایک خاص طبقے کے ہاتھوں عام آدمی کے استحصال اور لوٹ کھسوٹ سے دل برداشتہ ہیں۔ آپ کا دل اس کو دیکھتے ہوئے جلتا ہے۔ اور میرے خیال سے اس بات پر آپ کو جھنجھلاہٹ ہوتی ہے کہ ”کیوں بیٹے میں ہے اور اس پر بجلی بھی نہیں گرتی۔ یا کیوں ہے؟ صرف یہ جونک کے حرام والے کی رسی دراز ہو رہی ہے آپ کے لیے نا قابل قبول ہے“ ایک زمانے میں میں بھی اس پر بہت ملول ہوتا تھا۔ بلکہ میرے بڑے بھائی جو بڑی حد تک سوشلسٹ خیالات کے حامل تھے، نے تو اپنی زندگی اسی بیتا کا جھنڈا بلند کرنے میں صرف کر دی تھی اور اس سلسلے میں بڑی بھاری قیمت بھی ادا کی تھی۔ میں اب بھی ان باتوں کو سوچتا ہوں اور میرا بھی دل جلتا ہے مگر شاید میں نے وقت کے ساتھ ساتھ اپنے ان جذبات اور احساسات کو سلا دیا ہے (حیف) بہر حال آپ کے اس افسانے نے مجھ پر بہت اثر کیا اور میں دیر تک اس میں کھویا رہا۔ خوب بیان ہے۔ الفاظ کا انتخاب بھی خوب ہے اور روانی کے تو آپ ماہر ہیں۔ اغلاط کی نشان دہی کیا کر سکتا ہوں۔ نہ ہی مجھے کوئی ایسی خامی نظر آئی جس کی طرف اشارہ کیا جائے۔ بس یہ کہہ سکتا ہوں کہ آپ کے افسانے استعاری اسلوب لیے ہوتے ہیں (یہی انداز آپ کی زبان بندی کا بھی ہے) اس لیے عقدہ ذرا دیر میں کھلتا ہے مگر یہ کوئی خامی نہیں۔

فیروز عالم (یو ایس اے)

بھائی گلزار جاوید صاحب السلام علیکم

تازہ شمارے میں ایک بہت ہی اہم ادیب، شاعر اور نقاد کے نام گوشۂ اعزاز دیکھ کر مجھے ایک بار پھر عہد ماضی میں لوٹ جانا پڑا جب اپنی طالب علمی کے زمانے میں بلراج کومل کی تخلیقات تقریباً ہر ادبی، نیم ادبی اور دیگر جرائد میں اہتمام سے شائع ہوا کرتی تھیں۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ میری نسل نے ان کے انداز تحریر سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ موصوف شاعری اور نثر دونوں میں اختصاص کے حامل رہے ہیں لہذا گوشۂ اعزاز کے ساتھ گوشۂ اعزاز کا اہتمام کرنے والا بھی تحسین کا مستحق ہے۔ براہ راست کے ذریعے ان کو اور قریب سے جاننے کا موقع ملا ہے۔ پھر ”کنویں“ جیسا مختصر افسانہ زندگی اور موت کی فلسفیانہ توجیح و تشریح سے مملو۔ یہ کہانی آدمی کی ان دیکھی انہونی کی ہونی بھی مکمل تفسیر ہے۔ بلراج کومل کا ”کنویں“ ”تو خیر“ گوشۂ اعزاز میں ان کی پہچان کی ضرورت تھا۔ مگر اس شمارے کا بہترین افسانہ شمشاد احمد کا ”مکڑیاں اور چوہے“ تھا جس میں افسانہ نگار نے آج کے دور کی ہولناکی کو واحد متکلم کے روپ میں دیکھا اور پیش کیا ہے۔ میں اگر یہ کہوں کہ اب وہ ایک ایسے مقام پر آ گئے ہیں جہاں افسانہ نگاری اور شاعری میں بہت کم فاصلہ رہ جاتا ہے۔ اپنی بات لوگوں تک پہنچانے کا یہ انداز اگرچہ نیا نہیں اور شاید کرشن چندر ایسے اسلوب کے امام تھے پھر بھی شمشاد احمد کا اپنا انداز ہے۔ وہ نہ افسانہ ایسے الفاظ پر کیسے ختم ہو سکتا ہے ”اچانک مجھے محسوس ہوا کہ میرے ذہن میں پلنے والی مکڑیاں اور چوہے غائب ہو گئے ہیں۔ انہیں آ کس

کون کا سفید دودھ نکل گیا ہے۔" گلزار جاوید کا افسانہ "یوسف بے کارواں" اگرچہ ایک مونولاگ کی صورت میں صرف ڈھائی صفحات پر پھیلا ہوا ہے مگر اپنی ہیئت (موجودہ حالات کے تناظر میں) کے لحاظ سے دل کو چھوتا ہوا گزر جاتا ہے شاید ایسے ہی موقع کے لیے شاعر نے کہا تھا۔

یا دِ ماضی عذاب ہے یا رب چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

غالب عرفان (کراچی)

میرے گلزار خوش رہو۔

نومبر دسمبر کا شمارہ باصرہ نواز ہوا قرطاسِ اعزاز "بلراج کومل" کے نام دیکھ کر جی خوش ہوا۔ برسوں پہلے ان کی نظم "اکیلی" پڑھی تھی جس کا تصور آج بھی ذہن پر چھایا ہوا ہے بحرین ادب کا سلسلہ ترقی پسندوں نے شروع کیا تھا اس میں اسے بھی کئی بار پڑھا تھا۔ بلراج کومل کا افسانہ تانا کر دلیپ سنگھ پر خوب ہے کومل کی نسبت لکھے گئے تمام مضامین بھی عمدہ ہیں۔ افسانوں میں دیپک کنول کا "پاعدہ سنگل" طاہرہ اقبال کا "بوڑھی گنگا" اور گلزار جاوید کا "یوسف بے کارواں" کے علاوہ بھی افسانے اچھے لگے نظموں میں ستیہ پال آنند صاحب شگفتہ نازلی اور سرور انبالوی کی تخلیقات لائق توجہ ہیں۔

یوگیندر بہل تشنہ (دہلی بھارت)

گلزار بھائی تحیتیں

"چہارسُو" کا تازہ شمارہ خوبصورت قرطاسِ اعزاز کے ساتھ دستیاب ہوا چند صفحات میں آپ ادب کے کسی عظیم قلمکار سے متعارف کراتے ہیں۔ اور یہ کار شعلاں نہیں ہے بہت بڑا کام ہے جس کے لیے آپ اور آپ کے رفقاء مبارکباد کے مستحق ہیں۔ لہٰذا ایک کیا سو لکھنے والوں کے ساتھ نظر انداز کیے گئے "جوہر قابل" کو بھی تلاش کیجئے جو گمنامی کی دھند میں لپٹے ہوئے ہیں اور کوئی ان کا پرسان حال نہیں ہے۔ حمد ، نظم و نثر خوب ہے ڈاکٹر سید تقی عابدی اور امین راحت چغتائی اس شمارے کی جان ہیں میرے خیال میں جناب شمیم روحانی کی نظم میں کتابت کی چند اغلاط در آئی ہیں۔ اغلاط تو میرے مطبوعہ خط میں بھی ہیں میرا شعر یوں ہے

ذرا ملنا تو پھر شرم پر کھلے گا بڑے گُن ہیں تیا میں نہا میں

سید ضیاء شبنمی (ملتان)

محترم گلزار جاوید صاحب! تسلیمات

چہارسُو کا تازہ شمارہ بھائی اہل نظر کے توسط سے ملا جس کے لیے میں آپ دونوں حضرات کا بے حد مشکور ہوں۔ منیر الدین احمد کو میں نے یہاں وہاں پڑھا تھا لیکن "چہارسُو" کے اس شمارہ میں تفصیل سے بہت کچھ جاننے کا موقع ملا۔ بلاشبہ ادب میں ان کا کنٹری بیوشن قابل قدر ہے۔ براہ راست میں یہ پڑھ کر دکھ ہوا کہ اردو ادب ہمارے گھرانے میں میرے بعد ختم ہو جائے گا۔ دیکھا جائے تو زبان اسی وقت زندہ رہتی ہے جب اس کے بولنے والے اپنے تئیں اس کو زندہ رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ خود ان کا ایک اچھا مضمون ہے "اپنی مٹی میں گم" اور "ابلاغ کے بعد" اچھی کہانیاں ہیں۔ ان میں اچھا پن جھلکتا ہے۔

لئیق احمد (حیدرآباد دکن)

مدیرِ محترم سلام مسنون۔

بھیگے بھیگے دسمبر کی کرم فرمائیوں اور متواتر لوڈشیڈنگ کی حشر سامانیوں نے پڑھنے لکھنے کے معمول کو بھی متاثر کیا ہوا ہے ایسے میں پلکیں جھپکاتی "آتی جاتی روشنیوں کی انمول لمحوں کے لیے کچھ مفصل و طویل تحریریں سنبھال رکھی ہیں ـــــ سال رواں کا آخری شمارہ محترم بلراج کومل کے "قرطاسِ اعزاز" سے مزین "معتبر اقدار آراء سے مزید وقیع ہو گیا۔" براہ راست" زیرِ نکالہ رہبر کی گفتگو شخصیت کے متنوع پہلوؤں کا علمی و ادبی اعتبار سے بھرپور تکمیل ظاہر کرتا ہے "سردار ہرکارہ" پڑھتے ہوئے دوستی کی مالا میں یادوں کے خوش رنگ، دلگداز دانے کس قدر بڑی خوبصورتی سے پروئے ہوئے ملے ـــــ مرگ کا متحمل لمحہ میں بیدی صاحب کے افسانوی کرداروں کا مختلف زاویوں سے ساحرین کے پہلو بہ پہلو موازنہ کیا گیا۔ ادب کی تلاش سے تخلیقی و تنقیدی رویوں کے مزاج و معیار کا اظہار ملتا ہے" جشنِ زندگی" کی کسوٹیا بھرپور خوشگوار طرز زندگی کی طرح اختتام بھی فطری انداز کے ساتھ چاہتی تھی اور لکی زندگی کا واقعی جشن ہی منایا جانا چاہیے۔ کسی وقت ماحول کی یکسانیت سے اکتا کر تبدیلی کی خواہش پہلے سے بھی زیادہ بے رحم و سنگدل ثابت ہوتی ہے "دوسری سوچ" اسی تاثر کی عکاس رہی۔ کبھی کبھی حالات و واقعات کے ہاتھوں حساب "بے باق" کرنے کے ڈھنگ بھی بڑے غیر متوقع و انوکھے ہوتے ہیں۔ پگلی ماں کا کردار معاشرے کو ہمدردانہ نہج پر سوچنے سمجھنے کی ترغیب دیتا ہے۔ "یوسف بے کارواں" عہدِ موجود کی سماجی و معاشی ناانصافیوں، استحصالی رویوں، ہلاکتوں، بحرانوں، حساب کدورتوں، جغرافیائی خلاف ورزیوں و طبقاتی تخریب کاریوں کے تناظر میں تین نسلوں پر پھیلی ہوئی ذہنی انتشار و شکستگی اور ناآسودگی کا کامیاب علامتی اظہاریہ ہے آخر میں "کچھ نذرانہ خراج" کے بارے میں بھی ذکر ہوتا چلے۔ نظم "دسمبر" کی دو واقعیوں کو مدغم کر کے یوں لکھا گیا۔ خطا بخشے لمحوں کے دھاگے میں پروئی یادوں کی جھلمل ـــــ جب کہ دراصل یہ دو لائنیں اس طرح لکھی گئی تھیں ـــــ

خطا بخشے لمحوں کی سرسراہٹ جیسی ہو گی
انہی لمحوں کے دھاگے میں پروئی یادوں کی جھلمل

شگفتہ نازلی (لاہور)

محترمی گلزار جاوید صاحب آداب۔

تازہ چہار سو بہ دست ہوا۔ بلراج کومل کے نام قرطاسِ اعزاز منسوب کر کے آپ نے حق ادا کر دیا۔ بلراج کومل نہ صرف دنیائے شعر و ادب کی ایک بلند پایہ شخصیت ہیں بلکہ اس قدر منکسار، شگفتہ مزاج، بے ریا، دلِ عزیز اور دوست نواز انسان ہیں اُن کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ آپکا انٹرویو ہمیشہ کی طرح حق خیز اور دلچسپ ہے۔ فکر تونسوی، وزیر آغا، شمیم حنفی اور ڈاکٹر خلیق انجم سب مضامین قابلِ مطالعہ ہیں۔ حمیدہ معین رضوی، آ تنظیر، یسمین احمد، دیپک کنول اور گلزار جاوید کے افسانے عمدہ ہیں۔ شہریار، منظور حسین یاد، محمود شام، ساغر عاشق ہرگانوی، شباب للت، عرش صہبائی، ولی عالم شاہین، عبدالعزیز خالد، یوگیندر بہل تشنہ، جتندر پرتاپ چاند، ماہون ایمن، سرور انبالوی، خیال آفاقی، ضیاء شبنمی، کاوش پرتاپ گڑھی، حمیرہ نوری اور حمیرہ راحت کی تخلیقات نے متاثر کیا۔ امین راحت چغتائی کا مضمون جمیل الدین عالی کی کالم نگاری بھی خوبصورت ہے۔

نارنگ ساقی (دہلی بھارت)

محترم گلزار جاوید صاحب السلام علیکم۔

خوبصورت، فکر انگیز اور تحیر آمیز تحریروں سے مزین "چہار سو" موصول ہوا۔ ویسے تو اس شمارے (ستمبر ۲۰۰۸ء) کی ہر تحریر کمال کی ہے لیکن خاص طور پر ڈاکٹر منیر الدین احمد کے لیے وقف گوشہ نہایت محنت اور حسین انتخاب کے ساتھ مرتب کیا گیا ہے۔ سرور انبالوی "قرطاسِ اعزاز" خاصے کی نظم ہے جو اپنی فنی صحت و تزئین کے باعث دلکش اور دلکشا ہے۔ منصور الٰہی شیخ کا افسانہ "گرداب" بڑی ذہانت سے دورِ جدید کے ایک پہلو کو اپنی جلو میں لیے ہوئے ہے۔ "بجری مشقت" (گلزار جاوید) تو نایاب افسانہ ہے اس ایک جملے کی بلاغت کے ساتھ افسانے کا کلائمکس تو اپنی مثال آپ ہے یعنی ـــ "کمرے میں گھپ اندھیرے کے اندر ایک سایہ نمودار ہوا جس کے ساتھ ہی شمع گم غائب ہو جاتا" ایسی ہی ایمائیت اور شائستہ اظہار کے لیے کیٹس کے یہ دو مصرعے عالمی ادب میں اعلیٰ مقام حاصل کر چکے ہیں۔ یعنی

Into her dream he melted As the rose blendeth
its odour with the violet.

سہیل اختر (بہاولپور)

محترم گلزار جاوید آداب۔

چہار سو اس قدر دلچسپ اور معلوماتی ہوتا ہے کہ نیا شمارہ پڑھنے کے بعد فوری طور پر آئندہ شمارے کا انتظار شروع ہو جاتا ہے اسی اشتیاق اور اہتمام کے باعث اس مرتبہ دو شماروں پر اکٹھے اظہارِ خیال کر رہی ہوں۔ ڈاکٹر منیر الدین احمد سے منسوب چہار سو کے مضامین، کلام اور انٹرویو کی مدد سے بہت قریب اور بھرپور جانکاری ملی۔ خاص کر جوگندر پال صاحب، کاربن الٰہی صاحب، فیروز عالم صاحب اور آپ کا افسانہ دل کو بہت بھائے۔ آپ کے افسانے کی آخری دو لائن یعنی اختتام خوب ہے۔ حمد، غزل، نظم بھی اور منیر الدین احمد صاحب کی شاعری اور تراجم بھی لاجواب ہیں۔ زیرِ نظر شمارے میں بلراج کومل صاحب کی نسبت بھی آپ نے ڈھیر ساری معلومات اور اس سے بڑھ کر ان کے تازہ خیالات براہِ راست کی شکل میں فراہم کر کے بہت اچھی کاوش کی ہے۔ اس بار کئی افسانے دل کو بھائے خاص کر حمیدہ معین رضوی کا افسانہ طویل ہو کر بھی دلچسپی برقرار رکھتا ہے۔ شاید اس کا ایک سبب وہ حالات و واقعات ہیں جو افسانے میں بیان کئے گئے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ مغرب میں مقیم افسانہ نگار طویل افسانے لکھتے ہیں جس کی ایک مثال چہار سو میں شامل جناب جتندر بلو کے افسانے ہیں۔ میری جانب سے چہار سو کے تمام لکھاری اور شریک کار احباب کو مبارکباد کیجئے کہ کڑے وقت میں چہار سو جس طرح دونوں جانب کے اہلِ قلم کو جوڑنے کا کام کر رہا ہے اس کے لیے مبارک باد سے بہتر لفظ استعمال ہونا چاہیے۔

رینو بہل (چندی گڑھ بھارت)

محترم گلزار صاحب سلام و خلوص۔

بلراج کومل عہدِ موجود کے نامور تخلیق کار ہیں۔ انہوں نے اپنے ہنر کی یکتائی کا لوہا منوایا ہے۔ آپ نے جامع انداز میں بلراج کومل کی ادبی خدمات کو سراہا ہے۔ وہ یقیناً معیاری ادب تخلیق کر کے عہدِ موجود میں سچائی اور دانش کے فروغ کا سامان فراہم کر رہے ہیں۔ طالبانِ ادب اُن کی نظم و نثر سے استفادہ کر کے نئی روشنی حاصل کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا، شمس الرحمٰن فاروقی، شمیم حنفی اور ڈاکٹر خلیق انجم نے بلراج کومل کے حسنِ تخلیق پر جامع گفتگو کی ہے۔ خاص طور پر آغا صاحب اور فاروقی صاحب کے مضامین میں بلراج صاحب کے ادبی کیریئر کا احاطہ خوب کیا ہے۔ افسانوں میں شمشاد احمد کا "مکھیاں اور چوہے"، طاہرہ اقبال کا "بوڑھی گنگا" اور آپ کا "یوسف بکا ہوں" اعلیٰ نثر کے نمائندے ہیں۔ غزلوں میں محمود شام، ساغر عاشق ہرگانوی، خیال آفاقی، قاشی کاگی، ڈاکٹر جواز جعفری کا کلام قابلِ داد ہے۔

مظہر بخاری (میاں چنوں)

محترم گلزار جاوید صاحب آداب و نیاز۔

"چہار سو" بابت نومبر، دسمبر ۲۰۰۸ء نظر نواز ہوا۔ اس شمارہ کے انتساب سے آپ کی تعمیری سوچ کا اندازہ ہوتا ہے۔ جناب بلراج کومل صاحب سے متعلق آپ کی تحریر خوب ہے۔ اُردو ادب میں اُن کا کام قابلِ ستائش ہے۔ آپ نے انہیں یکجا کر کے ایک اہم فرض ادا کیا ہے۔ ڈاکٹر شباب للت اور جتندر پرتاپ چاند کی تخلیقات اس لئے بھی متوجہ کرتی ہیں کہ وہ فن کے دائرے میں ہیں۔ آج کی شاعری خیال تک محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ میری غزل کے اس شعر میں

ہونٹ اس کے پیار کا موسم اس کی آنکھیں کہ قصہ بادہ ہے

پیار کی جگہ "ابر" لکھا گیا ہے۔

عرش صہبائی (جموں کشمیر)